

یادگار غالب

مؤلفہ
مولانا حالی مرحوم

یادگارِ غالب

مؤلفہ

شمس العلماء مولانا الطاف حسین صاحب حالی مرحوم

پبلشر

رائے صاحب لالہ رام دیال اگروالا الہ آباد

سنہ ۱۹۵۸ء

قیمت

باہتمام کے-بی-اگروالا
شانتی پریس الہ آباد

فہرستِ مضامین یادگار غالب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

تیرھویں صدی ہجری میں جبکہ مسلمانوں کا تنزل درجہ غایت کو پہنچ چکا تھا اور انکی دولت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے، حسن اتفاق سے دارالخلافت دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جنکی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتی تھیں، اور جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں:-

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود   باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ   حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی ہی بار راقم کا دلی جانا ہوا اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، مگر جو باقی تھے اور جنکے دیکھنے کا مجھ کو ہمیشہ فخر رہیگا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا، کیونکہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچا بدل گیا، اور جس ہوا میں انھوں نے نشو و نما پائی تھی وہ ہوا پلٹ گئی۔

زمانہ دگر گونہ آئیں نہاد　　شد آں مرغ کو بیضہ زریں بہاد

علی الخصوص مرزا اسد اللہ خاں **غالب** جن کی عظمت و شان اس سے بالاتر تھی کہ انکو بارھویں یا تیرھویں صدی ہجری کے شاعروں یا انشا پردازوں میں شمار کیا جائے۔

مرزا نے اپنی کتاب "**مہر نیم روز**" میں مرقع پر بہادر شاہ کی طرف خطاب کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ "شاہجہاں کے عہد میں **کلیم** شاعر سیم و زر میں تولا گیا تھا، مگر میں صرف اس قدر چاہتا ہوں اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک دفعہ کلیم کے ساتھ تول لیا جائے" اس مضمون کو جو لوگ مرزا کے رتبے سے واقف نہیں شاید خود ستائی اور تعلی پر محمول کریں گے، مگر ہمارے نزدیک مرزا نے اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں کیا، بلکہ بالکل وہی کہا ہے جو انکے زمانے کے اہل نظر اور اہل تمیز اُن کی نسبت رائے رکھتے تھے۔

اگرچہ زمانے نے اپنی بساط کے موافق مرزا کی کچھ قدر نہیں کی، انکا تمام کلام، اُردو، فارسی، نظم، اور نثر انکے جیتے ہی جی اطراف ہندوستان میں پھیل گیا تھا، اُن کے ماننے والے اور مداح و ثنا خواں ملک کے ہر گوشے میں پائے جاتے تھے اور اب تک پائے جاتے ہیں، مدحیہ قصائد پر انکو کم و بیش صلے اور خلعت و انعام بھی ملتے رہے، مرحوم بہادر شاہ نے بھی اپنی حیثیت کے موافق انکی خاصی قدر کی، ریاست رامپور سے انکے لئے اخیر دم تک معقول وظیفہ جاری رہا، یہ سب کچھ ہوا، مگر جب مرزا کے اُس اعلیٰ مرتبہ کا جو شاعری و انشا پردازی میں فی الواقع اُنھوں نے حاصل کیا تھا۔ ٹھیک اندازہ کیا جاتا ہے تو ناچار یہ کہنا پڑتا ہے کہ زمانے کی یہ تمام قدر دانی زیادہ سے زیادہ اُس پیر زال کی سی قدر دانی تھی جو ایک سوت کی انٹی لیکر یوسف کی خریداری کو مصر کے

بازار میں آئی تھی۔ سچ یہ ہے کہ مرزا کی قدر جیسی کہ چاہیے یا جلال الدین اکبر کرتا، یا جہانگیر و شاہجہاں، مگر جس قدر اس اخیر دور میں انکو مانا گیا اسکو بھی نہایت معتنم سمجھنا چاہیے۔

بکے مفت یاں ہم زمانے کے ہاتھوں ۔۔۔ یہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام اُنکی شاعری اور انشاپردازی کے سوا نظر نہیں آتا۔ مگر صرف اسی ایک کام نے اُنکی لائف کو دارالخلافہ کے اخیر دور کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس ملک میں مرزا پر فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہو گیا، اور اُردو نظم و نثر پر بھی ان کا کچھ کم احسان نہیں ہے، اسلیئے کبھی کبھی مجھ کو اس بات کا خیال آتا تھا کہ مرزا کی زندگی کے عام حالات جس قدر کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہو سکیں اور انکی شاعری و انشاپردازی کے متعلق جو امور کہ احاطۂ بیان میں آسکیں اور ابنائے زمان کے فہم سے بالاتر نہ ہوں، انکو اپنے سلیقے کے موافق قلمبند کروں۔

پچھلے برسوں میں جبکہ میں دلی میں مقیم تھا بعض احباب کی تحریک سے اس خیال کو اور زیادہ تقویت ہوئی۔ میں نے مرزا کی تصنیفات کو دوستوں سے مستعار لے کر جمع کیا، اور جسقدر اس میں ان کے حالات و اخلاق و عادات کا سراغ ملا انکو قلمبند کیا، اور جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں یا دوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں انکو بھی ضبط تحریر میں لایا۔ مگر ابھی ترتیب مضامین کی نوبت نہ پہنچی تھی کہ اور کاموں میں مصروف ہو گیا، اور کئی برس تک وہ تمام یادداشتیں کاغذ کے مٹھوں میں بندھی ہوئی رکھی رہیں۔

ان دنوں میں دوستوں کا پھر تقاضا اور بہت سخت تقاضا ہوا اور باوجودیکہ میں ایک نہایت اہم اور ضروری کام میں مصروف تھا۔ دوستوں

کے تقاضے نے یہاں تک مجبور کیا کہ اس ضروری کام کو چند روز کے لیے ملتوی کرنا پڑا، اور یہ خیال کیا گیا کہ جو یادداشتیں مرزا کی لائف کے متعلق بڑی کوشش سے جمع کی گئی ہیں اور جو تھوڑی سی توجہ سے مرتب ہو سکتی ہیں انکو اب زیادہ حالتِ منتظرہ میں رکھنا مناسب نہیں۔

میں نے اُن مسودوں کو کھولا اور ان یادداشتوں کے مرتب کرنے کا ارادہ کیا مگر انکے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مرزا کی تصنیفات پر پھر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی، اور اسکے سوا کچھ اور کتابیں بھی درکار ہونگی، میں نے دلی کے بعض بزرگوں* اور دوستوں کو لکھا اور انھوں نے مہربانی فرما کر میری تمام مطلوبہ کتابیں اور جسقدر مرزا کے حالات انکو معلوم ہو سکے لکھکر میرے پاس بھیجدیے، اور اس طرح مرزا کی لائف جہاں تک کہ اسکی تکمیل ہو سکتی تھی مکمل کی گئی۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ مرزا کی لائف میں کوئی معتد بالشان واقعہ انکی شاعری انشاپردازی کے سوا نظر نہیں آتا - لہذا جس قدر واقعات انکی لائف کے متعلق اس کتاب میں مذکور ہیں انکو ضمنی اور استطرادی سمجھنا چاہیے - اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب و غریب ملکے کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا، اور جو کبھی نظم و نثر کے پیرایہ میں ظرافت اور بذلہ سنجی کے روپ میں کبھی عشقبازی اور رند مشربی کے لباس میں اور کبھی تصوف اور حُبّ اہلبیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا - پس جو ذکر ان چاروں باتوں سے علاقہ نہیں رکھتا اسکو کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیے۔

---

* یعنی نواب سعید الدین احمد خاں خلف الصدق نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم اور سید اکبر مرزا و سید مظفر مرزا بنائر نواب حسام الدین حیدر خاں مرحوم اور میر مہدی حسین مجروح اور لالہ بہاری لال مشتاق

لٹریری دنیا میں بہت سے صاحب کمال ایسے گزرے ہیں جنکے زمانے میں اُنکی قدر و منزلت کا پورا پورا اندازہ نہیں کیا گیا، مگر آخر کار اُنکا کمال ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ سعدی کے زمانے میں اسکے اکثر ہمعصر امامی ہروی کو اس پر ترجیح دیتے تھے مگر کچھ بہت عرصہ نہ گزرا تھا کہ سعدی کا نام اور اسکا کلام اطرافِ عالم میں منتشر ہو گیا، اور امامی کا کلام صرف تذکروں میں باقی رہ گیا شکسپیر کے عہد میں اُسکو ایک ایکٹر سے زیادہ رتبہ نہیں دیا گیا، مگر آج اُسی شکسپیر کے ورکس بائبل کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں۔ خود مرزا بھی اپنے کلام کی نسبت ایسا ہی خیال رکھتے تھے، چنانچہ ایک فارسی غزل میں فرماتے ہیں۔

تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن   این مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است   شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

اگرچہ اس لحاظ سے کہ ایشیائی شاعری کا مذاق یورپین سولزیشن میں روز بروز جذب ہوتا ہے اور فارسی لٹریچر ہندوستان سے ایسا رخصت ہوا ہے کہ بظاہر اسکے مراجعت کرنے کی توقع نہیں رہی یہ اُمید رکھنی تو فضول ہے کہ مرزا کی فارسی نظم و نثر اب یا آیندہ زمانے میں مقبولِ خاص و عام ہوگی، لیکن جو تو بر تو پردے مرزا کی شاعری اور نکتہ پردازی پر اُنکی زندگی میں پڑے رہے اور جو اب تک مرتفع نہیں ہوئے، کیا عجب ہے کہ ہماری یا ہمارے بعد کسی دوسرے شخص کی کوشش سے رفع ہو جائیں۔

مرزا کو بحیثیت شاعری پبلک سے روشناس کرنے اور اُنکی شاعری کا پایہ لوگوں کی نظر میں جلوہ گر کرنے کا عمدہ طریقہ یہ تھا کہ اُنکے اصنافِ کلام میں سے ایک معتد بہ حصہ نقل کیا جاتا، ہر صنعت میں جو باتیں مرزا کی خصوصیات سے ہیں وہ بیان کی جاتیں، جو کلام نقل کیا جاتا اُسکی لفظی و معنوی خوبیاں ازراہِ تمیں

اور باریکیاں ظاہر کیجاتیں، شعرا کے جس طبقے میں مرزا کو جگہ دینی چاہیے اس طبقے کے شاعروں کے کام کا موازنہ کیا جاتا، اُنکی غزل سے مرزا کی غزل کو، قصیدے سے قصیدے کو، اور اسی طرح ہر صنف سے اُسی صنف کو ٹکرایا جاتا، اور اس طرح مرزا کے پایۂ شاعری اور انکے کلام کی حقیقت سے اہل وطن کو خبردار کیا جاتا۔ مگر یہ طریقہ جس قدر مصنف کے حق میں دشوار گزار تھا اُسی قدر پبلک کے لئے خاصکر اس زمانے میں غیر مفید بھی تھا، اگر ہم اس دشوار گزار منزل کے طے کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو ہماری وہی مثل ہوتی کہ "مرغی اپنی جان سے گئی اور کھانیوالوں کو مزا نہ آیا"۔

ناچار ہم نے بجائے طریقۂ مذکور کے جو حالتِ موجودہ میں باوجود دشوار ہونے کے غیر مفید بھی ہے اس موقع پر ایک ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جو ہمارے لئے سہل تر اور پبلک کے لئے مفید تر معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے دوسرے حصے میں مرزا کے تمام کلام کو چار قسموں پر تقسیم کیا ہے، نظم اُردو، نثر اُردو، نظم فارسی اور نثر فارسی، اور اسی ترتیب سے ہر قسم کا تھوڑا انتخاب چار جدا جدا فصلوں میں درج کیا ہے ہر قسم پر اول کچھ مختصر ریمارکس کیے ہیں پھر اسکا انتخاب لکھا گیا ہے۔ اور جو اشعار یا فقرے شرح طلب سمجھے ہیں اُنکی جا بجا شرح بھی کردی گئی ہے اور کہیں کہیں محاسنِ کلام کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور آخر میں خاصکر ان لوگوں کے لیے جو فارسی لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں۔ نمونے کے طور پر مرزا کے کسی قدر فارسی کلام کا موازنہ ایران کے مسلم الثبوت اُستادوں کے کلام کے ساتھ کر کے دکھایا ہے کہ مرزا نے فارسی لٹریچر میں کس درجے تک کمال بہم پہنچایا تھا۔

مذکورۂ بالا انتخاب سے ہماری یہ مراد نہیں ہے کہ مرزا کے کلام میں جسقدر بلند اور پاکیزہ خیالات تھے وہ سب لے لیے گئے ہیں اور جو اُن سے پست درجے

کے خیالات تھے وہ چھوڑ دے گئے ہیں، نہیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس رسالے کی بساط اور وسعت کے موافق تا بمقدور ہر ایک صنف میں سے کم و بیش ایسا کلام لے لیا گیا ہے جو اس زمانہ کے لوگوں کے مذاق سے بیگانہ اور اُنکی فہم سے بعید تر نہ ہو، اور باوجود اسکے مؤلف کی نظر میں بھی بوجہ من الوجوہ انتخاب کے قابل ہو۔

اس انتخاب سے جسکو مرزا کے تمام کلام کا نمونہ سمجھنا چاہیے کئی فائدے تصور کئے گئے ہیں ایک یہ کہ جو لوگ شعر کی سمجھ اور اُسکا عمدہ مذاق رکھتے ہیں، انکو بغیر اسکے کہ تمام کلیات پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہو مرزا کا ہر قسم کا عمدہ کلام ایک جگہ جمع کیا ہوا ملجائیگا۔ دوسرے جو لوگ مرزا کا کلام اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے وہ بسبب اسکے کہ ہر مشکل شعر یا فقرے کے معنی حل کر دئے گئے ہیں۔ مرزا کے خیالات سے بخوبی واقفیت حاصل کر سکیں گے اور دونوں طبقوں کو معلوم ہو جائیگا کہ مرزا نے قوت متخیلہ اور ملکۂ شاعری کس درجے کا پایا تھا، اور کس خوبی اور لطافت سے وہ نہایت نازک اور دقیق خیالات کو اُردو اور فارسی دونوں زبانوں ادا کرنیکی قدرت رکھتے تھے۔

الغرض یہ رسالہ دو حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے، پہلے حصہ میں مرزا کی زندگی کے واقعات جہاں تک کہ معلوم ہو سکے۔ اور انکے اخلاق و عادات و خیالات کا بیان ہے۔ انھیں حالات کے ضمن میں اُنکی خاص خاص نظمیں یا اشعار جو کسی واقعے سے علاقہ رکھتے ہیں اور انکے لطائف و لنوادر۔ جنسے مرزا کی طبیعت کا اصلی جوہر اور اُنکی امیجنیشن کی قوت نہایت واضح طور پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ اپنے اپنے موقع پر درج کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصہ میں مرزا کے تمام کلام نظم و نثر اُردو اور فارسی کا انتخاب، اور ہر قسم پر جدا جدا ریویو، اور آخر میں مرزا کے کسی قدر کلام کا موازنہ ایران کے بعض مسلم الثبوت اُستادوں کے کلام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ خاتمۂ کتاب پر ایک مختصر ریویو مرزا کی تمام لائف اور اُنکی طرز شاعری و انشا پردازی پر لکھا گیا ہے،

جسکو ساری کتاب کا لُب لباب سمجھنا چاہئے۔

اگرچہ مرزا کی لائف۔ جیسا کہ ہم آیندہ کسی موقع پر بیان کرینگے۔ اُن فائدوں سے خالی نہیں ہے جو ایک بائیوگرفی سے حاصل ہونے چاہئیں۔ لیکن اگر ان فائدوں سے قطع نظر کیجائے تو بھی ایک ایسی زندگی کا بیان جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی اور شگفتگی کے سوا کچھ نہ ہو۔ ہماری پژمردہ اور دل مردہ سوسائٹی کے لئے کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ اسکے سوا ہر قوم میں عموماً اور گری ہوئی قوموں میں خصوصاً ایسے عالی فطرتِ انسان شاذ و نادر پیدا ہوتے ہیں جنکی ذات سے اگرچہ قوم کو براہِ راست کوئی معتدبہ فائدہ نہ پہونچا ہو۔ لیکن کسی علم یا صناعت یا لٹریچر میں کوئی حقیقی اضافہ کم و بیش ظہور میں آیا ہو اور سلف کے ذخیرہ میں کچھ نیا سرمایہ شامل ہوا ہو۔ ایسے لوگوں کی لائف پر غور کرنا، اُنکے ورکس میں چھان بین کرنی اور اُنکے نوادر افکار سے مستفید ہونا، قوم کے ان فرائض میں سے ہے جن سے غافل رہنا قوم کے لئے نہایت افسوس کی بات ہے۔ جیسا کہ خود مرزا ایک جگہ لکھتے ہیں حیف کہ ابنائے روزگار حسنِ گفتارِ مرا نشناختند۔ مرا خود دل بر آناں می سوزد کہ کامیابِ شناسائی فترۂ ایزدی نگشتند، و ازیں نمایشہائے نظر فروز کہ در نظم و نثر بکار بردہ ام۔ سرگراں گزشتند۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغاز کتاب

تاریخ ولادت مرزا اسد اللہ خاں غالب المعروف بہ میرزا نوشہ، المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ، المتخلص بہ غالب در فارسی و اسد در ریختہ، شب ہشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ھ ہجری کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔

خاندان مرزا کے خاندان اور اصل و گوہر کا حال، جیسا کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں جابجا ظاہر کیا ہے۔ یہ ہے کہ انکے آبا و اجداد ایبک قوم کے ترک تھے اور انکا سلسلۂ نسب تور ابن فریدوں تک پہونچتا ہے۔ جب کیانی تمام ایران و توران پر مسلط ہو گئے، اور تورانیوں کا جاہ و جلال دنیا سے رخصت ہو گیا، تو ایک مدتِ دراز تک تور کی نسل ملک و دولت سے بے نصیب رہی، مگر تلوار کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹی، کیونکہ ترکوں میں قدیم سے یہ قاعدہ چلا آتا تھا کہ باپ کے متروکہ میں سے بیٹے کو تلوار کے سوا اور کچھ نہ ملتا تھا، اور کل مال و اسباب اور گھر بار بیٹی کے حصے میں آتا تھا۔ بارے ایک مدت کے بعد اسلام کے عہد میں اسی تلوار کی بدولت ترکوں کے بخت خفتہ نے پھر کروٹ بدلی اور سلجوقی خاندان میں ایک زبردست سلطنت کی بنیاد قائم ہو گئی۔ کئی سو برس وہ تمام ایران و توران و شام و روم (یعنی ایشائے کوچک) پر حکمراں رہے، آخر ایک مدت کے بعد سلجوقیوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوا، اور سلجوق کی اولاد جابجا منتشر و پراگندہ ہو گئی۔ انھیں میں سے ترسم خاں نام ایک امیرزادے نے سمرقند میں بود و باش

اختیار کر لی تھی۔ مرزا کے دادا جو شاہ عالم کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان میں آئے وہ اسی ترسم خاں کی اولاد میں تھے۔ مرزا مہر نیمروز کے دیباچے میں لکھتے ہیں "اُزوا پسیان ایں قافلہ نیاے من، کہ در قلمرو ماوراءالنہر سمرقند شہر مسقط الراس وے بود۔ چوں سیل کہ از بالا بہ پستی آید از سمرقند بہند آمد" اور درفش کاویانی میں اس طرح لکھا ہے "بالجملہ سلجوقیاں بعد زوال و برہم خوردن ہنگامۂ سلطنت در اقلیم وسیع الفضای ماوراءالنہر پراگندہ شدند۔ ازاں جملہ سلطان زادہ ترسم خان کہ ما از تخمۂ اویم سمرقند را بہر اقامت گزید۔ تا در عہد سلطنت شاہ عالم نیاے من از سمرقند بہندوستان آمد"۔

مرزا کے دادا کی زبان بالکل ترکی تھی، اور ہندوستان کی زبان بہت کم سمجھتے تھے۔ اُس زمانے میں ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں شاہ عالم کے دربار میں دخل کلی رکھتے تھے۔ نجف خاں نے مرزا کے دادا کو سلطنت کی حیثیت کے موافق ایک عمدہ منصب دلوادیا اور پہاسو کا سیر حاصل پرگنہ ذات اور رسالہ تنخواہ میں مقرر کر دیا، اُنکے کئی بیٹے تھے جن میں سے دو کے نام معلوم ہیں، ایک مرزا کے باپ عبداللہ بیگ خاں عرف میرزا دولھا اور دوسرے نصراللہ بیگ خاں

عبداللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کیدان کی بیٹی سے ہوئی تھی، جو کہ سرکار میرٹھ[1] کے ایک معزز فوجی افسر اور عمائد شہر آگرہ میں سے تھے، مرزا عبداللہ بیگ خاں نے بطور خانہ داماد کے اپنی تمام عمر سسرال میں بسر کی، اور انکی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی، مرزا عبداللہ بیگ خاں کے دو بیٹے ہوئے ایک مرزا اسداللہ خاں، اور دوسرے مرزا یوسف خاں جو ایام شباب میں مجنون ہو گئے تھے اور اُسی حالت میں ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔

---

[1] سرکار ملک کے اس حصے کو کہتے تھے جو صوبے کی نسبت چھوٹا اور پرگنہ و محال وغیرہ سے بہت بڑا ہوتا تھا۔

مرزا کے والد عبداللہ بیگ خاں، جیسا کہ مرزا نے خود ایک خط میں لکھا ہے، اول لکھنؤ میں جا کر نواب آصف الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے، اور چند روز بعد وہاں سے حیدرآباد پہونچے، اور سرکار آصفی میں تین سو سوار کی جمعیت سے کئی برس تک ملازم رہے۔ مگر وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی، اور وہ واپس آگرہ میں چلے آئے۔ یہاں آکر انھوں نے الور کا قصد کیا۔ راجہ بختاور سنگھ نے ابھی انکو کوئی خاطر خواہ نوکری نہیں دی تھی کہ اتفاق سے انھیں دنوں میں ایک گڑھی کے زمیندار راج سے پھر گئے جو فوج اس گڑھی پر سرکوبی کے لئے بھیجی گئی اس کے ساتھ مرزا عبداللہ بیگ خاں کو بھی بھیجا گیا تھا، وہاں پہنچتے ہی انکے گولی لگی اور وہیں انکا انتقال ہوگیا، اور راج گڑھ[1] میں دفن ہوئے۔ راجا بختاور سنگھ رئیس الور نے دو گانوں سیر حاصل اور کسی قدر روزینہ مرزا مرحوم کے دونوں لڑکوں کی پرورش کے واسطے مقرر کر دیا، جو ایک مدت دراز تک جاری رہا، مرزا کے والد کی وفات کے بعد انکے چچا نصراللہ بیگ خاں نے انکو پرورش کیا۔

جب سرکار انگریزی کی عملداری ہندوستان میں اچھی طرح قائم ہوگئی اور نواب فخرالدولہ احمد بخش خاں لارڈ لیک کے لشکر میں شامل ہوئے، تو انھوں نے مرزا غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں کو جنسے نواب موصوف کی ہمشیر منسوب تھیں، سرکاری فوج میں بعہدۂ رسالداری ملازم کرا دیا۔ انکی ذات اور رسالے کی تنخواہ میں دو پرگنے یعنی سونک اور سونسا، جو نواحِ آگرہ میں واقع ہیں، سرکار سے انکے نام پر مقرر ہو گئے۔ جب تک وہ زندہ رہے دونوں پرگنے ان کے نام مزد رہے، اور انکی وفات

---

[1] مرزا نے جو قصیدہ راجہ شیودھیان سنگھ کی مدح میں لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں:

در پنج سالگی شدہ ام چاکر حضور | رنگین سخن طرازم و دیرینہ خوار
دارم بگوش حلقۂ زینجاہ و ہشت سال | اکنوں کہ عمر شصت بہ پیما است شمار
باید شنید راز اعیان بارگاہ | باید شنفت قصۂ زپیران آں دیار
کافی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست | در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

کے بعد انکے وارثوں اور متعلقوں کی پنشنیں سرکار نے فیروزپور جھرکہ کی ریاست سے مقرر کرا دیں جس میں سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا کو آخر اپریل ۱۸۵۷ء تک برابر ملتا رہا۔ مگر فتح دہلی کے بعد تین برس تک قلعے کے تعلقات کے سبب یہ پنشن بند رہی۔ آخر جب مرزا کی ہر طرح سے بریت ہو گئی تو پنشن پھر جاری ہو گئی، اور تین برس کی واصلات بھی سرکار نے عنایت کی۔ جب تک پنشن بند رہی مرزا کے دوستوں کو نہایت تعلق خاطر رہا۔ اکثر لوگ پنشن کا حال دریافت کرنے کو خط بھیجتے تھے۔ ایک دفعہ میر مہدی نے اسی مضمون کا خط بھیجا تھا، اسکے جواب میں مرزا صاحب لکھتے ہیں "میاں بے رزق جینے کا ڈھب مجھکو آگیا ہے، اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینا روزے کھا کھا کر کاٹا، آگے خدا رزاق ہے، کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے"

مرزا نے اپنے علو خاندان پر جابجا فارسی اشعار میں فخر کیا ہے چونکہ ان میں سے بعض اشعار لطف سے خالی نہیں اسلیے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں قطعہ

غالب از خاک پاک تورانیم ۔۔۔ لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمہ ۔۔۔ بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک ۔۔۔ در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فن آبائے ما کشاورزیست ۔۔۔ مرزبان زادۂ سمرقندیم
ور ز معنی سخن گزاردہ ۔۔۔ خود چہ گوئیم تا چہ و چندیم
فیض حق را کمینہ شاگردیم ۔۔۔ عقل کل را کہینہ فرزندیم
ہم بہ تابش بہ برق ہمنفسیم ۔۔۔ ہم بہ بخشش بہ ابر مانندیم
بہ تماشے کہ ہست فیروزیم ۔۔۔ بمعاشے کہ نیست خرسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمے گرییم ۔۔۔ ہمہ بر روزگار می خندیم

قطعہ

ساقی! چون پشنگ و افراسیابیم ۔۔۔ دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم ست

میراث جم گر نے بود اکنوں بمن سپار زیں پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

رباعی

غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمؔ[1] زاں رو بصفای دم تیغ ست دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بشعر شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

مرزا غالب مع اپنے چھوٹے بھائی کے سن شعور تک آگرے ہی میں رہے، اگرچہ سات برس کی عمر سے وہ دلی میں آنے جانے لگے تھے لیکن شادی کے بعد تک اُنکی مستقل سکونت آگرے ہی میں رہی اور شیخ معظم جو اس زمانے میں آگرے کے نامی معلموں میں سے تھے اُن سے تعلیم پاتے رہے۔ اسکے بعد ایک شخص پارسی نژاد جسکا نام آتش پرستی کے زمانے میں ہُرمزد تھا اور بعد مسلمان ہونے کے عبدالصمد رکھا گیا، غالباً آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا، جو کہ دو برس تک مرزا کے پاس اوّل آگرے میں اور پھر دلی میں مقیم رہا، میرزا نے اُس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی، اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ "مجھکو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے، اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے چونکہ مجھکو لوگ بے اُستاد کہتے تھے انکا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی اُستاد گڑھ لیا ہے" مگر اس میں شک نہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم وبیش فارسی زبان سیکھی تھی۔ چنانچہ مرزا نے جابجا اُسکے تلمذ پر اپنی تحریروں میں فخر کیا ہے اور اسکو بلفظ تیمسار جو پارسیوں کے ہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے یاد کیا ہے لیکن جیسا کہ مرزا نے اپنی بعض تحریروں میں تصریح کی ہے۔ مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبدالصمد انکے مکان پر وارد ہوا ہے اور کل دو برس اُس نے وہاں قیام کیا۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے

---

[1] زادشم افراسیاب کے دادا اور پشنگ کے باپ کا نام ہے۔ ۱۲

کہ مرزا کو کس عمر میں اُسکی صحبت میسر آئی، اور کس قدر قلیل مدت اسکی صحبت میں گزری تو عبد الصمد اور اسکی تعلیم کا عدم و وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اسلیے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مجھکو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔

ایک جگہ مرزا نے مبدأ فیاض سے مستفید ہونے کا مضمون نہایت عمدگی سے باندھا ہے اور وہ شعر یہ ہے۔

آنچہ در مبدأ فیاض بود آن من ست — گل جدا ناشدہ از شاخ بداماں من ست

ایک اور مقام پر اس سے بھی زیادہ عمدہ طریقے سے یہ مطلب ادا کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں

باخذ فیض ز مبدأ فروزم از اسلاف — کہ بودہ ام قدرے دیرتر دراں درگاہ

ظہور من بجہاں در ہزار و بست و دویست[۱] — ظہورِ خسرو و سعدی بہ ششصد و پنجاہ

ملا عبد الصمد علاوہ فارسی زبان کے جو اُسکی مادری زبان اور اُسکی قوم کی مذہبی زبان تھی۔ عربی زبان کا بھی۔ جیسا کہ مرزا نے لکھا ہے۔ بہت بڑا فاضل تھا۔ اگرچہ مرزا کو اسکی صحبت بہت کم میسر آئی، مگر مرزا جیسے جوہر قابل کو صغر سن میں ایسے شفیق کامل، اور جامع اللسانین اُستاد کا ملجانا ان نوادر اتفاقات میں سے تھا جو بہت کم واقع ہوتے ہیں۔ اگرچہ مرزا کو اس سے زیادہ مستفید ہونے کا موقع نہیں ملا، مگر اُس کے فیض صحبت نے کم سے کم وہ ملکہ ضرور مرزا میں پیدا کر دیا تھا جسکی نسبت کہا گیا ہے کہ "اگر حاصل شود خواندہ و ناخواندہ برابر ست، و اگر حاصل نہ شود ہم خواندہ و ناخواندہ برابر" معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے حسنِ قابلیت اور حسنِ استعداد نے ملّا عبد الصمد کے دل پر گہرا نقش بٹھا دیا تھا کہ یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی وہ مدت تک مرزا کو نہیں بھولا۔ نواب مصطفٰے خاں مرحوم کہتے تھے کہ ملّا کے ایک خط میں جو اس نے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا یہ فقرہ لکھا تھا "اے خواجہ عزیز چہ کسی،

[۱] دویست یعنی دو صد۔ اہل زبان اکثر دو کے لفظ کے ساتھ بجائے صد کے یست کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ۱۲

کہ بااین ہمہ آزادیہا گاہ گاہ بخاطرمی گذری ٹ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ دو برس کے قلیل عرصے میں وہ مرزا کو سکھا سکتا تھا اس میں ہرگز مضائقہ نہ کیا ہوگا اور جیسا کہ قاطع برہان اور درفش کاویانی کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے اس نے تمام فارسی زبان کے مقدم اصول اور گر اور پارسیوں کے مذہبی خیالات اور اسرار جنکو فارسی زبان کے سمجھنے میں بہت بڑا دخل ہے اور پارسی و سنسکرت کا متحد الاصل ہونا اور اسی قسم کی اور ضروری باتیں مرزا کے دل میں بوجہ اولیٰ نشین کردی تھیں

تاہل | چونکہ مرزا کے چچا کا رشتہ نواب فخر الدولہ کے خاندان میں ہوچکا تھا اور اسلیئے ان کے خاندان سے ایک نوع کا تعلق پیدا ہوگیا تھا، مرزا کی شادی نواب فخر الدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کے ہاں قرار پائی اور جیسا کہ مرزا نے ایک رقعے میں اشارہ کیا ہے - تیرہ برس کی عمر میں سات رجب ۱۲۲۵ ہجری کو انکا عقد ہوگیا - اس تقریب سے انکی آمد و رفت دلی میں زیادہ ہوگئی - اور آخرکار یہیں سکونت اختیار کرلی اور اخیر عمر تک دلی ہی میں رہے -

مرزا کے نانا کی جاگیر میں متعدد دیہات اور آگرہ شہر میں بہت بڑے املاک تھی وہ منشی شیونرائن رئیس آگرہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلبند ہو - اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہگار - تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم ؟ مجھسے سنو! تمہارے پردادا عبد بخت خاں میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے - جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے، تو تمہارے پردادا نے بھی کمر کھولدی اور پھر کہیں نوکری نہ کی - یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں - مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر خاں صاحب کے ساتھ ہیں، اور انھوں نے جو کتیھم گانوں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعوی

کیا ہے تو بنسی دھر اُس امر کے منصرم ہیں، اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُنکی، باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی، چونکہ گھر اُنکا بہت دور نہ تھا اسواسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔ پس ہمارے اور اُنکے مکان میں چھیا رنڈی کا گھر اور دو کٹڑے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لے لی ہے اُسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اسکے ایک کھٹیا والی حویلی، اور سلیم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی، اور اُس سے آگے بڑھکر ایک کٹڑا کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا۔ اور ایک کٹڑا کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اُڑاتا تھا، اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔

واصل خاں نامی ایک سپاہی تمھارے دادا کا پیشدست رہتا تھا اور وہ کٹڑوں کا کرایہ اُگاہکر جمع کرواتا تھا۔ بھائی تم سنو تو سہی! تمھارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا۔ علاقے مول لیے تھے اور زمینداره اپنا کر لیا تھا۔ دس بارہ ہزار روپے کی سرکار کی مالگذاری کرتا تھا۔ آیا وہ سب کارخانے تمھارے ہاتھ آئے یا نہیں؟ اسکا حال از روے تفصیل جلد مجھکو لکھو" اس خط کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے نانا کی آگرے میں ایک خاصی سرکار تھی جسکی بدولت اُنکے ملازم اور متوسلین دس دس بارہ بارہ ہزار کے مالگذار بن گئے تھے، اور مرزا کا بچپن اور عنفوانِ شباب بڑے اللے اور تللوں میں بسر ہوا تھا۔

اہل دہلی میں سے جن لوگوں نے مرزا کو جوانی میں دیکھا تھا ان سے سنا گیا ہے کہ عنفوانِ شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین اور خوشرو لوگوں میں شمار کیے جاتے

تھے۔ اور بوڑھاپے میں بھی جبکہ راقم نے پہلے ہی بار انکو دیکھا ہے حسانت اور خوبصورتی کے آثار اُنکے چہرے اور قد وقامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ مگر اخیر عمر میں قلت خوراک اور امراض دائمی کے سبب وہ نہایت نحیف وزار و نزار ہو گئے تھے۔ لیکن چونکہ ہاڑ بہت چکلا قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں زبردست تھے اس حالت میں بھی وہ ایک نووارد تورانی معلوم ہوتے تھے۔

دلّی میں انکے قیام کا زمانہ قریب پچاس برس کے معلوم ہوتا ہے، اس تمام مدت میں اُنھوں نے غالباً یہاں کوئی مکان اپنے لیے نہیں خریدا، ہمیشہ کرایے کے مکانوں میں رہا کئے۔ یا ایک مدت تک میاں کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرایے کے رہے تھے جب ایک مکان سے جی اُکتا یا اُسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا، مگر قاسم جان کی گلی یا حبش خاں کے پھاٹک یا اسکے قرب وجوار کے سوا کسی اور ضلع میں جا کر نہیں رہے۔ سب سے اخیر مکان جس میں انکا انتقال ہوا، حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوانخانے کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جسکی نسبت وہ کہتے ہیں :-

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے ۔ یہ بندہ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

جس طرح مرزا نے تمام عمر رہنے کے لیے مکان نہیں خریدا اسی طرح مطالعے کے لیے بھی۔ باوجودیکہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گزاری۔ کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی الا ماشاء اللہ۔ ایک شخص کا یہی پیشہ تھا کہ کتاب فروشوں کی دکان سے لوگوں کو کرائے کی کتابیں لا دیا کرتا تھا، مرزا صاحب بھی ہمیشہ اُسی سے کرائے پر کتابیں منگواتے تھے اور مطالعے کے بعد واپس کر دیتے تھے۔

سفر کلکتہ ظاہرا مرزا نے کوئی لمبا سفر کلکتے کے سوا نہیں کیا۔ اسی سفر کی آمد و رفت میں وہ چند ماہ لکھنؤ اور بنارس میں بھی ٹھہرے تھے کلکتے جانے کا سبب یہ تھا کہ مرزا کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے وفات پائی تھی اُسوقت مرزا کی عمر نو برس کی تھی اور اُن کے

بھائی کی عمر سات برس کی تھی۔ نصراللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد اُنکے متعلقوں اور وارثوں کے لئے جن میں مرزا اور انکے بھائی بھی شریک تھے جو پنشن گورنمنٹ نے ریاست فیروزپور جھرکہ پر محوّل کردی تھی جبتک مرزا صغیر سن رہے جو کچھ وہاں سے ملتا رہا پاتے رہے۔ جب سن تمیز کو پہونچے اور شادی بھی ہوگئی عالم شباب اور خانہ داری کی ضرورتیں بہت بڑھ گئیں اور گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا وہ بھی چندروز میں سب خرچ ہوگیا، لاچار فکر معاش دامنگیر ہوئی۔ اوّل مرزا کو غلط یا صحیح یہ خیال پیدا ہوا کہ فیروزپور سے جسقدر پنشن ہمارے خاندان کے لیے گورنمنٹ نے مقرر کرائی تھی اسقدر ہمکو نہیں ملتی۔ ضرورتوں نے سخت تنگ کر رکھا تھا، ادھر قرض خواہوں کے تقاضے سے ناک میں دم آگیا تھا، اُدھر چھوٹے بھائی کو جنون ہوگیا، مرزا جیسے آزادمنش آدمی کے لئے یہ یہ وقت نہایت سخت تھا، اُس کشمکش میں انکو اسکے سوا اور کچھ نہ سوجھا کہ کلکتے پہنچکر سوپریم گورنمنٹ میں پنشن کی بابت استغاثہ پیش کریں۔ چنانچہ مرزا اس حالت کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں "ہنگامۂ دیوانگی برادر یکطرف و غوغاے دام خواہان یک سو، آشوبے پدید آمد کہ نفس راہ لب، ونگاہ روزنۂ چشم فراموش کرد وگیتی بدین روشنی روشنان در نظر تیرہ وتار شد، بالبے از سخن دوختہ وچشمی از خویش فروبستہ، جہان جہان شکستگی و عالم عالم خستگی باخود گرفتم، واز بیداد روزگار نالان، وسینہ بردم تیغ مالان بہ کلکتہ رسیدم"۔

غرضکہ مرزا کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی۔ جبکہ وہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتے پہنچے کلکتے میں لوگوں نے انکی بہت خاطر و مدارات کی اور ان کو کامیابی کی اُمید دلائی اسٹرلنگ صاحب سکرٹری گورنمنٹ ہند نے جنکی مدح میں مرزا کا فارسی قصیدہ انکے کلیات میں موجود ہے، وعدہ کیا تھا کہ تمھارا حق ضرور تمکو ملیگا کول برک صاحب جو اسوقت دلّی میں رزیڈنٹ تھے اُنھوں نے دلّی ہی میں مرزا سے عمدہ رپورٹ

کرنے کا اقرار کرلیا تھا۔ ان اُمیدوں کے دھوکے میں وہ پورے دو برس کلکتے میں رہے مگر آخرکار نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ گورنمنٹ نے سر جان میلکم گورنر بمبئی سے جو لارڈ لیک کے سکرٹری رہ چکے تھے، اور انھیں کے روبرو جاگیروں اور پنشنوں کی سندیں لوگوں کو ملی تھیں، مرزا کے معاملے کی بابت استفسار کیا۔ اُنھوں نے مرزا کے دعوے کو غلط بتایا اور جس طرح اور جسقدر پنشن فیروز پور سے ملنی قرار پائی تھی اسکی مفصل کیفیت۔ جو مرزا کے دعوے کے بالکل برخلاف تھی۔ گورنمنٹ میں بھیجدی۔ جب یہاں سے مرزا کو مایوسی ہوئی تو اُنھوں نے ولایت میں اپیل کیا مگر وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔

مرزا صاحب نے گورنمنٹ ہند سے پانچ درخواستیں کی تھیں، ایک تو یہی کہ اُنکے خیال کے موافق جو مقدار پنشن کی سرکار نے مقرر کی ہے وہ آیندہ پوری ملا کرے۔ دوسری یہ کہ اب تک جسقدر کم پنشن ملتی رہی ہے اسکی واصلات ابتدا سے آج تک ریاست فیروز پور سے دلوائی جائے چونکہ پہلی درخواست نامنظور ہولی تھی اسلیے دوسری درخواست کیونکر منظور ہوتی۔ تیسری درخواست یہ تھی کہ کل پنشن میں جو حصہ میرا قرار پائے وہ اور شرکا سے علحدہ کر دیا جائے۔ چوتھی یہ کہ پنشن فیروز پور سے خزانۂ سرکار میں منتقل ہو جائے تاکہ رئیس فیروز پور سے مانگنی نہ پڑے۔ یہ دونوں درخواستیں منظور ہوگئیں اور انکے موافق اخیر تک عملدرآمد رہا۔ پانچویں درخواست خطاب اور خلعت کی تھی۔ جہاں تک معلوم ہے کوئی خطاب گورنمنٹ سے مرزا کو نہیں ملا۔ لیکن گورنمنٹ ہند اور لوکل گورنمنٹ سے انکو "خاں صاحب بسیار مہربان دوستان" لکھا جاتا تھا۔ اور جب کبھی دلی میں وائسرائے یا لفٹنٹ گورنر کا دربار ہوتا تھا تو انکو بھی مثل دیگر رؤسا و عمائد شہر کے بلایا جاتا تھا اور سات پارچے کا خلعت مع جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید کے انکو برابر ملتا رہا۔ اور تمام لوکل حکام اور افسران سے رئیس زادوں کی

طرح ملتے رہے۔

مجادلہ اہل کلکتہ کلکتہ کے قیام کے زمانے میں کچھ لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کئے تھے اور اپنے اعتراضوں پر قتیل کا قول سنداً پیش کیا تھا۔ مگر مرزا ہندوستان کے فارسی گو شاعروں میں خسرو کے سوا کسی کو نہیں مانتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں "اہل ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں، میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکلجاتی ہے" اسی لئے وہ قتیل و واقف وغیرہ کو کچھ چیز نہیں سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے قتیل کا نام سنکر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ میں دلوالی سنگھ[1] فرید آباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا اور اہل زبان کے سوا کسی کے قول کو قابل استناد نہیں سمجھتا۔ اور اپنے کلام کی سند میں اہل زبان کے اقوال پیش کئے۔ اس پر معترضین میں زیادہ جوش و خروش پیدا ہوا اور مرزا پر اعتراضوں کی بوچھار پڑنے لگی اگرچہ مرزا کے طرفدار بھی کلکتہ میں بہت تھے مگر چونکہ مرزا اعتراض اور مخالفت سے بہت جز بز ہوتے تھے انکے گھبرا دینے کو ایک معترض بھی کافی تھا اُنھوں نے تنگ آکر ایک مثنوی موسوم بہ باد مخالف اپنی غریب الوطنی کا ذکر اور اہل کلکتہ کی نامہربانی کی شکایت اور انکے اعتراضات اور اپنے جواب نہایت عمدگی اور صفائی اور دردانگیز طریقے سے بیان کئے ہیں لکھی۔ یہاں اُس مثنوی کے کچھ کچھ اشعار مختلف مقامات سے نقل کئے جاتے ہیں۔

اے تماشائیاں بزم سخن — وے مسیحا دمانِ نادرہ فن
اے گرانمایگان عالم حرف — خوش نشینان ایں بساطِ شگرف
اے سخن پرورانِ کلکتہ — وے زباں آورانِ کلکتہ
ہر یکے صدرِ بزم بار گہے — شمع خلوت سرائے کار گہے

---

[1] مرزا قتیل نو مسلم تھے اسلام لانے سے پہلے ان کا نام دلوالی سنگھ تھا۔ اور فرید آباد ضلع دہلی کے کھتری تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد لکھنؤ چلے گئے تھے یہاں ان کی نہایت قدر ہوئی ۱۲-

هر یکے پیش تاز قافلہ
هر یکے کتخدائے مرحلہ

اے بہ شغلِ وکالت آمادہ
دادِ غم خوارئ جہاں دادہ

اے شگرفانِ عالمِ انصاف
بسفارت رسیدہ از اطراف

اے سخن را طراز جاں دادہ
صفحہ را ساز گلستاں دادہ

عطر بر مغز گیتی افشانان
پہلوانان پہلوی دانان

اے گرامی فنانِ ریختہ گو
نغز دریا کشانِ عربدہ جو

اے رئیسانِ ایں سوادِ عظیم
وے فراہم شدہ ہفت اقلیم

ہمچو من آرمیدۂ ایں شہر
بہر کارے رسیدۂ ایں شہر

اسد اللہ بخت برگشتہ
در خم و پیچ عجز سرگشتہ

گرچہ ناخواندہ میہمانِ شماست
بے سخن ریزہ چینِ خوانِ شماست

بہ تظلم رسیدہ است اینجا
با امید آرمیدہ است اینجا

آرمیدن دہید روزے چار
خستہ را بہ سایۂ دیوار

کار احباب ساختن رسم است
میہماں را نواختن رسم است

آں رہ و رسم کارسازی کو
شیوۂ میہمان نوازی کو

کیستم؟ دل شکستۂ غمزدۂ
بیدلے خستۂ ستمزدۂ

برقِ بیطاقتی بجان زدۂ
آتشِ غم بخانمان زدہ

از گدازِ نفس بتاب و تبے
در بیابانِ یاس تشنہ لبے

خس طوفانی محیطِ بلا
سر بسر گردِ کاروانِ فنا

دردمندے جگر گداختۂ
از غمِ دہر زہرہ باختۂ

در آگاہی فنا زدہ
ہمہ بر خویش پشت پا زدۂ

چہ بلا ہا کشیدہ ام آخر
کہ بریں جا رسیدہ ام آخر

به سیه روز غربتم بینید
تیره شبهاے وحشتم بینید
انده دوری وطن نگرید
غم هجران انجمن نگرید
نه همیں ناله و فغان بلبم
من و جان آفرین که جان بلبم
مویه چون موے کرده ست مرا
غصّه بد خوے کرده است مرا
ذوق شعر و سخن کجاست مرا
کے زبان سخن سراست مرا
دارم آرے زهرزه لائی خویش
نوحه بر خویش و بینوائی خویش
گردشِ روزگار خویشتنم
حیرتِ کار و بار خویشتنم
با من این خشم و کین!! دریغ دریغ
من چناں تاں چنیں!! دریغ دریغ
بر غریباں کجا رواست ستم
رحم اگر نیست خود چراست ستم

بنده ام بنده مهربانان را
رمز مهمان و نکته داناں را
نه ز آویزش بیاں ترسم
من و ایماں من کزاں ترسم
که پس از من بسالهاے دراز
به زباں ماند ایں حکایت باز
کز سفیهے رسید بود اینجا
چند روز آرمیده بود اینجا
با بزرگاں ستیزه پیش گرفت
زحمتے داد و راه خویش گرفت
شوخ چشمے و زشت خوئے بود
بیحیائے و هرزه گوے بود
هم سفیهانه گفتگوے داشت
هم خراباتیانه هوے داشت
برگِ دنیا نه ساز دینش بود
ننگ دهلی و سرزمینش بود
آه ازاں دم که بعد رفتنِ من
خونِ دهلی بود بگردن من
تا بوم رنج دوستاں باشم
بر دلِ انجمن گراں باشم
شاد گردند کز میاں بروم
آوخ از من که من چناں بروم

خستہ دستمند بر گردم — وژم آیم نژند بر گردم
بود اعم کس از شما نرسد — شوق را مژدۂ وفا نرسد
دوستاں را اگر زمن گلہ است — کہ خرامت خلاف قافلہ است
می رویم از پے قتیل ہمہ — ساختہ مرد را دلیل ہمہ
تو ازیں حلقہ چوں بدر زدۂ — گام بر جادۂ دگر زدۂ ؟
اے تماشائیان ژرف نگاہ — ہاں بگوئید حسبۃً للّٰہ
کہ چساں از حزیں نہ پیچم سر — آں بجادو دمے بہ دہر سمر
دل دہد[1] کز اسیر بر گردم — زاں نوآئیں صفیر بر گردم
دامن از کف کنم چگونہ رہا — طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روح و روان معنی را — آں ظہوری جہان معنی را
آنکہ از سر فرازیِ قلمش — آسماں ساست پرچم علمش
طرزِ اندیشہ آفریدۂ اوست — در تنِ لفظ جاں دمیدۂ اوست
پشت معنی قوی ز پہلویش — خامہ را فربہی ز بازویش
طرزِ تحریر را نواے ازوے — صفحہ ارژنگِ مالوی ازوے
فتنۂ گفتگوے اینانم — مست لاے سبوے اینانم
آں کہ طے کردہ ایں مواقف را — چہ شناسد قتیل واقف را
لیک با ایں ہمہ کہ ایں دارم — گنج معنی در آستیں دارم
دل و جانم فداے احبابست — شوق وقفِ رضای احبابست
میشوم خویش را بہ صلح دلیل — می سرایم نواے مدحِ قتیل

---

[1] یعنی آیا دل اجازت میدہد کہ از اسیر بر گردم یہ اہل زبان کا محاورہ ہے کہ دل دہد بجاے "دل دستوری دہد" کے بولتے ہیں۔

تا نماند ز من دگر گلۂ ؛ رسد از پیر وان وے صلۂ
گفتن آئین ہوشیاری نیست لیک دانستن اختیاری نیست
گرچہ ایں اندیشں نخواہم گفت سعدی ثانیش نخواہم گفت
لیک از من ہزار بار بہ است از من و ہمچو من ہزار بہ است
من کفِ خاک او سپہر بلند خاک را کے رسد بچرخ کمند
وصف او حد چوں منی نہ بود مہر در خوردِ روزنے نہ بود
مرحبا ساز خوش بیانی او حبذا شور نکتہ دانیِ او
نظمش آب حیات را ماند در روانی فرات را ماند
نثر او نقش بال طاؤس است انتخابِ صراح و قاموس است
پادشاہے کہ در قلمروِ حرف کردہ ایجاد نکتہائے شگرف
خامہ ہندوے پارسی دانش ہندیاں سر بخطِ فرمانش
ایں رقمہا کہ ریخت کلک خیال بود سطرے ز نامۂ اعمال ؛
از من نارسائے ہیچداں ؛ معذرت نامۂ الیست ز پی یاراں
بو کہ آید ز عذر خواہیِ ما رحم بر نا و بیگناہی ما
آشتی نامۂ و داد و پیام ختم شد والسلام والاکرام

قیامِ لکھنؤ۔ جب مرزا نے دلی سے کلکتے جانے کا ارادہ کیا تھا اسوقت راہ میں ٹھہرنیکا قصد نہ تھا مگر چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں، اسلئے کانپور پہنچکر انکو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیے اُس زمانے میں نصیر الدین حیدر فرماں روا اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ اہل لکھنؤ نے مرزا کی عمدہ طور پر مدارات کی اور روشن الدولہ کے ہاں بعنوان شایستہ انکی تقریب کی گئی۔

مرزا سے اُس پریشانی کے عالم میں قصیدہ تو سرانجام نہیں ہو سکا، مگر ایک مدحیہ نثر صنعت تعطیل میں جو انکے مسودات میں موجود ہے نائب السلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لیے لکھی تھی۔ لیکن مرزا صاحب نے ملاقات سے پہلے دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں۔ ایک یہ کہ نائب میری تعظیم دیں، دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جائے۔ اسی وجہ سے مرزا بغیر اسکے کہ روشن الدولہ سے ملیں اور وہ نثر پیش کریں وہاں سے کلکتے کو روانہ ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے سے واپس آنے کے بعد انھوں نے ایک قصیدہ دلی سے نصیر الدین حیدر کی شان میں لکھکر ایک دوست کے توسط سے گزرانا تھا۔ اور اُس پر پانچ ہزار روپے بطور صلے کے ملنے کا حکم ہوا تھا۔ شیخ امام بخش ناسخ نے مرزا کو لکھا کہ پانچ ہزار ملے تھے، تین ہزار روشن الدولہ کھا گئے اور دو ہزار متوسط کو دیکر کہا کہ اس میں سے جو مناسب سمجھو مرزا کو بھیجدو۔ مرزا صاحب نے یہ سنکر پھر کچھ تحریک کی مگر تین دن بعد یہ خبر پہنچی کہ نصیر الدین حیدر مر گئے۔ پھر واجد علی شاہ کے زمانے میں مرزا نے سلسلہ جنبانی کی، اور پانسو روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لئے وہاں سے مقرر ہو گئے لیکن صرف دو برس گزرے تھے کہ ریاست ضبط ہو گئی، اور وہ دفتر گاؤخوردہ ہو گیا۔

لطیفہ لکھنؤ کی ایک صحبت میں جبکہ مرزا وہاں موجود تھے۔ ایک روز لکھنؤ اور دلی کی زبان پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے مرزا سے کہا کہ جس موقع پر اہل دہلی اپنے تئیں بولتے ہیں وہاں اہل لکھنؤ آپ کو بولتے ہیں، آپ کی رائے میں فصیح آپ کو ہے یا اپنے تئیں؟ مرزا نے کہا فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ بولتے ہیں، مگر اس میں دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ میں آپ کو فرشتہ خصائل جانتا ہوں اور میں اسکے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض کروں کہ میں تو آپ کو کتّے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں، تو سخت مشکل واقع ہو گی، میں تو اپنی نسبت کہونگا اور آپ ممکن ہے کہ اپنی نسبت سمجھ جائیں۔ سب حاضرین یہ لطیفہ سنکر پھڑک گئے۔ مرزا کا مطلب

صرف اسقدر بیان کرنا تھا کہ آپ کو مخاطب کے لئے تو عموماً بولا ہی جاتا ہے، اگر متکلم کے لئے بھی اسکا استعمال ہوگا تو بعض موقع پر التباس واقع ہوگا۔ اس مطلب کو اُنھوں نے اس لطیف پیرائے میں بیان کیا۔ مگر یہ فقط ایک لطیفہ اہل صحبت کے خوش کرنے کے لئے تھا ورنہ اہل دہلی بھی اکثر بجائے اپنے تئیں کے آپ کو بولتے ہیں، اس میں کچھ اہل لکھنؤ کی خصوصیت نہیں ہے۔

لطیفہ زبان کے متعلق مرزا کا اسی قسم کا ایک اور لطیفہ مشہور ہے۔ دلّی میں رتھ کو بعضے مونث اور بعض مذکر بولتے ہیں، کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ حضرت! رتھ مونث ہے یا مذکر؟ آپ نے کہا بھیا! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مونث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر سمجھو۔

ملازمت سرکاری سے انکار

تذکرہ آبحیات میں لکھا ہے کہ ۱۸۴۲ء میں جبکہ دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا۔ مسٹر ٹامسن سکرٹری گورنمنٹ ہند جو آخر کو اضلاع شمال و مغرب میں لفٹننٹ گورنر ہو گئے تھے۔ مدرسین کے امتحان کے لئے دلّی میں آئے۔ اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ ماہوار کا ایک عربی مدرس کالج میں مقرر ہے۔ اسی طرح ایک فارسی کا مدرس مقرر کیا جائے لوگوں نے مرزا اور مومن خاں اور مولوی امام بخش کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے مرزا صاحب کو بلایا گیا۔ مرزا پالکی میں سوار ہوکر صاحب سکرٹری کے ڈیرے پر پہونچے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی، اُنھوں نے فوراً بلا لیا۔ مگر یہ پالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھہرے رہے کہ دستور کے موافق صاحب سکرٹری انکے لینے کو آئینگے۔

جب بہت دیر ہوگئی، اور صاحب کو معلوم ہوا کہ اس سبب سے نہیں آئے، وہ خود باہر چلے آئے اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپ کا اُسی طرح استقبال کیا جائیگا لیکن اسوقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہوسکتا۔ مرزا صاحب نے کہا گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اسلئے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو نہ اسلئے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔ صاحب نے کہا، ہم

قاعدے سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب نے کہا مجھکو اس خدمت سے معاف رکھا جائے، اور یہ کہکر چلے آئے۔

قید ہونیکا واقعہ

مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی۔ اور چوسر جب کبھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بدکر کھیلا کرتے تھے۔ اسی چوسر کی بدولت ۱۲۶۴ھ میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گزرا۔ مرزا نے خود اس واقعے کو ایک فارسی خط میں مختصر طور پر بیان کیا ہے جسکا ترجمہ ہم اس مقام پر لکھتے ہیں "کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے۔ میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بنگیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا سشن جج۔ باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا اس نے اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے نہ سُنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اسکی بہت تعریف کی۔ سنا ہے رحمدل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفریں کی اور میری خاکساری اور آزادہ روی سے اُسکو مطلع کیا، یہانتک کہ اُس نے خود بخود میری رہائی کی رپورٹ بھیجدی۔ اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جاسکتا۔ جو کچھ گزرا اسکے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنیوالا ہے اُس پر راضی ہوں۔ مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں، اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں، روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے، یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمۃ للعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے، دیکھیے وہ

وقت کب آئیگا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اسکے کہ کوئی منزلِ مقصود قرار دوں سر بصحرا نکلجاؤں۔ یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گزرا اور یہ ہے جسکا میں آرزومند ہوں"۔

یہ واقعہ مرزا صاحب پر نہایت شاق گزرا تھا۔ اگرچہ منجملہ چھ مہینے کے تین مہینے جو اُنکو قیدخانے میں گزرے، اُنکو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی، وہ بالکل قیدخانے میں اُسی آرام سے رہے جیسے گھر پر رہتے تھے، کھانا اور کپڑا اور تمام ضروریات حسب دلخواہ گھر سے اُنکو پہنچتی تھیں اُنکے دوست اُن سے ملنے جاتے تھے۔ اور وہ صرف بطور نظربندوں کے جیلخانے کے ایک علیحدہ کمرے میں رہتے تھے۔ مگر چونکہ اُسوقت تک شہر کے شرفا و اعیان کے ساتھ کبھی اس قسم کا سلوک مرزا نے نہیں دیکھا تھا اسلیئے وہ اسکو ایک بڑی بے آبروئی کی بات سمجھتے تھے۔ چنانچہ جو ترکیب بند اُنھوں نے قیدخانے میں لکھا تھا اُس میں کہتے ہیں:۔

راز دانا غم رسوائیِ جاوید بلاست   ورنہ آزار غم از قیدِ فرنگم نہ بود
جورِ اعدا رود از دل بہ رہائی لیکن   طعنِ احباب کم از زخم خدنگم نہ بود

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم نے اس زمانے میں مرزا کے ساتھ دوستی کا حق پورا پورا ادا کیا اپیل میں جو کچھ صرف ہوا وہ اپنے پاس سے صرف کیا اور تین مہینے تک برابر اُنکی غمخواری اور ہر طرح کی خبرگیری میں مصروف رہے۔ چنانچہ اسی ترکیب بند میں نواب مرحوم کی نسبت کہتے ہیں:۔

خود چرا خوں نخورم از غم کہ بغمخواریِ من   رحمتِ حق بہ لباسِ بشر آمد گوئی
خواجہ ہست دریں شہر کہ از پرسشِ وے   پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی
مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوارِ منست
گر بمیرم چہ غم از مرگ عزادار منست

لطیفہ جب مرزا قید سے چھوٹ کر آئے تو میاں کالے[1] صاحب کے مکان میں آ کر رہے تھے۔ ایک روز میاں کے پاس بیٹھے تھے، کسی نے آ کر قید سے چھوٹنے کی مبارکباد دی، مرزا نے کہا کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے؟ پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں"

مرزا نے قید میں ایک فارسی ترکیب بند اپنے حسب حال لکھکر دوستوں کو بھیجا تھا۔ اُس نظم میں کل سات بند اور ہر بند میں بارہ بارہ شعر ہیں۔ مرزا کے عزیزوں اور دوستوں نے کلّیات فارسی میں اس نظم کو چھپنے نہیں دیا تھا، مگر مرزا صاحب نے مرنے سے کسی قدر پہلے اپنی جدید نظم کا ایک مجموعہ موسوم بہ "سبد چین" شائع کیا تھا، اُس میں اس ترکیب بند کو بھی شامل کر دیا تھا۔ لیکن سبد چین کی زیادہ اشاعت نہیں ہوئی، اس لئے یہ ترکیب بند بہت کم لوگوں کی نظر سے گزرا ہے۔ چونکہ یہ ترکیب بند مرزا کی عمدہ ترین حالیہ نظموں میں سے ہے اس واسطے اسکے مختلف بندوں میں سے کچھ کچھ شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

از بند اوّل

خواہم از بند بہ زنداں سخن آغاز کنم	غمِ دل پردہ دری کرد۔ فغاں ساز کنم
بہ نوائے کہ ز مضراب چکاند خوناب	خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم
چوں سرایم سخن انصاف ز مجرم خواہم	چوں نویسم غزل اندیشہ ز غمّاز کنم
یار دیرینہ! قدم رنجہ مفرما کانجا	آں نہ گنجد کہ تو در کوبی و من باز کنم
اہل زنداں بہ سر و چشم خودم جا دادند	تا بدیں صدر نشینی چہ قدر ناز کنم
ہمہ دزدان گرفتار! وفا نیست بشہر	خویشتن را بشما ہمدم و ہمراز کنم

---

[1] حضرت محمد نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب بہادر شاہ مرحوم کے شیخ اور مولانا فخر الدین قدس سرہ کے پوتے تھے مرزا مدت تک انکے مکان میں رہے ہیں وہ مرزا سے نہایت محبت رکھتے تھے اور انھیں کی تقریب سے قلعے میں تعلق پیدا ہوا تھا۔

از بند سوم

پاسبانان بهم آئید که من می آیم — درِ زندان بگشائید که من می آیم
هر که دید بدر خویش سپاسم گفتے — خیر مقدم بسرائید که من می آیم
جاده نشناسم و انبوهِ شمامی ترسم — راهم از دور نمائید که من می آیم
رهروِ جاده تسلیم درشتی نکنند — سخت گیرنده چرائید که من می آیم
های عزیزان که درین کلبه اقامت دارید — بخت خود را بستائید که من می آیم
تا بدروازهٔ زندان بے آوردنِ من — قدمے رنجه نمائید که من می آیم
چون سخن سنجی و فرزانگی آئین من ست — بهره از من بربائید که من می آیم

از بند چهارم

انچه فرداست هم امروز در آمد گوئی — آفتاب از جهت قبله برآمد گوئی
دل و دستے که مرا بود فرو ماند از کار — شب و روزیکه مرا بود سر آمد گوئی
بهرهٔ اهل جهان چون ز جهان درد و غم ست — بهرهٔ من ز جهان بیشتر آمد گوئی
خستن و بستنِ من حد کس نیست - برو — بر من این ساز قضا و قدر آمد گوئی
هنرم را نه توان کرد به خستن ضائع — خستگی غازهٔ روے هنر آمد گوئی
چرخ یک مرد گرانمایه به زندان خواهد — یوسف از قید زلیخا بدر آمد گوئی

از بند هفتم

همدمان! در دلم از دیده نهانید همه — غالب غمزده را روح روانید همه
لله الحمد که در عیش و نشاطید همه — لله الشکر که با شوکت و شانید همه
من بجوں خفته و بینم همه بینید همه — من جگر خستهٔ و دانم همه دانید همه
درمیان ضابطهٔ مهر و وفای بود ست — من بر اینم که بر آئینه برانید همه
روزے از مهر نگفتید فلانی بچون ست — بارے از لطف بگوئید چسانید همه

چارۂ گر نتواں کرد دعاے کافیست — دل اگر نیست خداوند زبانید ہمہ
ہفت بندست کہ در بند رقم ساختہ ام — بنویسید و بہ بینید و بخوانید ہمہ

آں نہ باشم کہ بہ ہر بزم ز من یاد آرید
دارم اُمید کہ در بزم سخن یاد آرید

قلعہ کا تعلق ۱۲۶۶ھ میں مرحوم ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ نے مرزا کو خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ اور چھ پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر یعنی جیغہ و سرپیچ و حمائل مروارید کے دربار عام میں مرحمت فرمایا اور خانداں تیموری کی تاریخ نویسی کی خدمت پر بمشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار کے مامور کیا۔ اور یہ قرار پایا کہ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں مرحوم مختلف تاریخوں سے مضامین التقاط کر کے مرزا کے حوالے کیا کریں، اور مرزا اُن تمام مطالب کو اپنی طرز خاص کی فارسی نثر میں بیان کریں۔ اور کتاب دو حصوں پر تقسیم کیا ئے پہلے حصے میں کچھ مختصر حال ابتداے آفرینش سے صاحبقراں تیمور گورگان تک اور کسی قدر مفصل حالات تیمور سے نصیر الدین ہمایوں کے اخیر زمانہ تک بیان کئے جائیں اور دوسرے حصے میں جلال الدین اکبر بادشاہ سے لیکر سراج الدین بہادر شاہ کے زمانے تک تمام واقعات شرح و بسط کے ساتھ درج کئے جائیں۔

مہر نیمروز و ماہ نیم ماہ مرزا نے تمام کتاب کا نام پرتوستان اور اسکے پہلے حصے کا نام مہر نیمروز اور دوسرے حصے کا نام ماہ نیم ماہ تجویز کیا تھا۔ انکو اپنی دو ترکیبوں پر ناز تھا، ایک ماہ نیم ماہ اور دوسرے رستخیز بیجا۔ مرزا کہتے تھے کہ چودھویں رات کے چاند کو ماہ چہاردہ اور ماہِ دو ہفتہ تو پہلے لوگوں نے اکثر باندھا ہے، مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے ماہِ نیم ماہ کسی نے نہیں باندھا یہ ترکیب خاص میری تراشی ہوئی ہے مگر افسوس ہے کہ دوسرا حصہ

سلہ رستخیز بیجا - غدر کی تاریخ کا مادہ ہے اسمیں رستخیز کے اعداد یعنی ۱۲۷۷ میں سے جا کے عدد یعنی (۴) کا تخرجہ کیا ہے ۱۲۷۳

یعنی ماہِ نیم ماہ ۔ بالکل نہیں لکھا گیا۔ مہر نیمروز ختم ہونے کے بعد مرزا نے ذرا آرام لینے کے لئے چند روز توقف کیا تھا اور ارادہ تھا کہ جلد دوسرا حصہ شروع کریں کہ اتنے میں غدر ہو گیا اور اُس حصے کا صرف نام ہی نام رہ گیا۔

حیدر آباد سے ایک صاحب نے مرزا سے ماہ نیم ماہ کو طلب کیا تھا اسکے جواب میں لکھتے ہیں ماہ نیم ماہ امیدست کہ مسمّیٰ ندارد، چوں از سرنوشت گردن نتوان پیچید سرگذشت باز گویم، ہرگاہ ایک نیمہ از پرستان انجام یافت و مہر نیمروز نام یافت، غنچی ورنگ ور زیدہ شد، تانفس راست کردہ آید۔ ناگاہ کار فرمارا روز فرو رفت، و روزگار سر آمد، و دولت دیرینۂ ترکمانانِ قراچاریہ سپری گشت، ماہِ نیم ماہ، ہمچوں ماہ لبست و ہشت شبہ ناپدید اد، و نامش بعنوان بے نشانی در مہر نیمروز آشکار ماند۔"

خدمت اصلاح اشعار بادشاہ

۱۲۷۱ھ میں جبکہ شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہو گیا۔ بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق ہو گئی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مرزا اس کام کو بادل ناخواستہ سرانجام کرلے تے تھے، ناظر حسین مرزا مرحوم کہتے تھے کہ ایک روز میں اور مرزا صاحب دیوان خاص میں بیٹھے تھے کہ چوبدار آیا اور کہا کہ حضور نے غزلیں مانگی ہیں۔ مرزا نے کہا ذرا ٹھہر جاؤ اور اپنے آدمی سے کہا کہ پالکی میں کچھ کاغذ رومال میں بندھے ہوئے رکھے ہیں وہ لے آؤ۔ وہ فوراً لے آیا۔ مرزا نے جو اسکو کھولا تو اُس میں سے آٹھ نو پرچے جن پر ایک ایک دو دو مصرع لکھے ہوئے تھے، نکالے۔ اور اُسی وقت دوات قلم منگوا کر اُن مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں، اور وہیں بیٹھے بیٹھے آٹھ یا نو غزلیں تمام و کمال لکھکر چوبدار کے حوالے کیں۔ ناظر مرحوم کہتے تھے کہ ان تمام غزلوں کے لکھنے میں انکو اس سے زیادہ دیر نہیں لگی کہ ایک مشّاق اُستاد چند غزلیں صرف کہیں کہیں اصلاح دیکر درست کردے۔ جب چوبدار غزلیں لیکر چلا گیا تو مجھ سے کہا کہ حضور کی کبھی

کبھی کی فرمایشوں سے آج مدت کے بعد بسکدوشی ہوئی ہے - اگرچہ مرزا صاحب جو کچھ اپنی طرز خاص میں لکھتے تھے - نظم ہو یا نثر - اسکو بڑی کاوش اور جانکاہی سے سرانجام کرتے تھے، چنانچہ خود انھوں نے جا بجا اسکی تصریح کی ہے - مگر جب کبھی اپنی خاص روش پر چلنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی اُس وقت انکو فکر پر زیادہ زور ڈالنا نہیں پڑتا تھا -

بدیہہ گوئی | ۱۸۶۱ء میں جبکہ نواب ضیاءالدین احمد خاں مرحوم کلکتے گئے ہوئے تھے مولوی محمد عالم مرحوم نے جو کلکتے کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے - نواب صاحب سے بیان کیا کہ جس زمانے میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے - ایک مجلس میں جہاں مرزا بھی موجود تھے اور میں بھی حاضر تھا - شعرا کا ذکر ہو رہا تھا - اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی مرزا نے کہا "فیضی کو لوگ جیسا سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے" اس پر بات بڑھی - اُس شخص نے کہا کہ فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے روبرو گیا تھا اُس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اُسی وقت ارتجالاً کہکر پڑھا تھا - مرزا بولے "اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر تو ہر موقع پر بداہتہً کہہ سکتے ہیں" مخاطب نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکالکر ہتھیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو - مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اُسی وقت موزوں کرکے پڑھ دیا - جو ان کے دیوان ریختہ میں موجود ہے اور جسکا پہلا شعر یہ ہے -

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی | زیب دیتا ہے اُسے جس قدر اچھا کہیئے

اولاد | مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی ابتدا میں سات بچے پے در پے ہوئے، مگر کوئی زندہ نہیں رہا اسلئے ایک مدت سے وہ اور انکی بی بی تنہا زندگی بسر کرتے تھے مگر غدر سے چند سال پہلے - جبکہ انکی بی بی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف انتقال ہوگیا، اور انکے دونوں بچے ایک باقر علی خاں اور دوسرے

حسین علی خاں صغیر سن رہ گئے۔ تو مرزا اور انکی بی بی نے چھوٹے لڑکے حسین علی خاں کو جو اسوقت بہت کم عمر تھا اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ مرزا حسین علی خاں کو حقیقی اولاد سے بھی کچھ بڑھکر عزیز رکھتے تھے اور کبھی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے اور حد سے زیادہ ناز برداری کرتے تھے۔

جب زین العابدین خاں کی والدہ کا انتقال ہو گیا تو حسین علی خاں کے بڑے بھائی باقر علی خاں کو بھی مرزا نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ یہ دونوں خوش فکر اور اہل اور نیکخو اور نہایت شریف مزاج تھے مگر افسوس ہے کہ مرزا کی وفات کے بعد دونوں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے جوان عمر میں فوت ہو گئے۔

عارف کا مرثیہ زین العابدین خاں عارف سے مرزا کو غایت درجے کا تعلق تھا۔ کچھ تو قرابت کے سبب اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ نہایت خوش فکر اور معنی یاب طبیعت رکھتے تھے۔ اور باوجود پرگوئی کے نہایت خوشگو تھے۔ ان کو حد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اسی لیے جب وہ جوان عمر میں فوت ہو گئے تو مرزا اور انکی بی بی پر سخت حادثہ گزرا۔ مرزا نے انکے مرنے پر ایک غزل بطور نوحے کے لکھی ہے جو نہایت بلیغ اور دردناک ہے۔ چنانچہ اسکے چند شعر ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں — مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے — کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے — پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے — کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی — بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

حالاتِ غدر | غدر کے زمانے میں مرزا دلّی سے بلکہ گھر سے باہر نہیں نکلے۔ جو نہیں بغاوت کا فتنہ اٹھا اُنھوں نے دروازہ بند کر لیا اور گوشۂ تنہائی میں غدر کے حالات لکھنے شروع کئے۔ اگرچہ فتحِ دہلی کے بعد مہاراج پٹیالہ کی طرف سے حکیم محمود خاں مرحوم اور انکے ہمسایوں کے مکان پر جسمیں ایک مرزا بھی تھے حفاظت کے لیے پہرہ بیٹھ گیا تھا، اسلئے وہ فتحمند سپاہیوں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہے، مگر پھر انکو طرح طرح کی کلفتیں اٹھانی پڑیں۔ مرزا کے چھوٹے بھائی جو تیس برس کی عمر میں دیوانے ہو گئے تھے اور آخر دم تک اسی حالت میں رہے، جب مرزا نے دلّی میں سکونت اختیار کی تو انکو بھی اپنے ساتھ یہیں لے آئے تھے۔ مرزا کے مکان سے انکا مکان تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر تھا۔ ایک دربان اور ایک کنیز دونوں عمر رسیدہ تھے۔ انکے پاس رہتے تھے۔ جب دلّی فتح ہو گئی اور شہر اہلِ دہلی سے خالی ہو گیا، اور رستے بند ہو گئے اُسوقت مرزا بھائی کی طرف سے سخت پریشان رہنے لگے۔ بھائی کے کھانے پینے سونے مرنے اور جینے کی مطلق خبر نہ تھی ایک روز یہ خبر آئی کہ مرزا یوسف کے مکان میں بھی کچھ سپاہی گھس آئے تھے اور جو کچھ اسباب ملا۔ لے گئے، پھر ایک دن وہی بڈھا دربان جو مرزا یوسف کی ڈیوڑھی پر رہتا تھا یہ خبر لایا کہ پانچ روز سخت تپ میں مبتلا رہکر آج آدھی رات گزرے مرزا یوسف کا انتقال ہو گیا۔ اُس وقت نہ کفن کے لیے کپڑا بازار میں مل سکتا تھا، نہ غسال اور گورکن کا کہیں پتہ تھا، نہ شہر سے قبرستان تک جانا ممکن تھا، مگر مرزا کے ہمسایوں نے انکی بڑی مدد کی پٹیالے کی فوج کے ایک سپاہی کو جو حفاظت کے لئے تعینات تھا۔ اور مرزا کے دو آدمیوں کو ساتھ لیا، اور مرزا

صاحب کے ہاں سے دو سفید چادریں لیکر مرزا یوسف کے مکان پر پہنچے اور بعد غسل اور تجہیز و تکفین کے مسجد کے صحن میں جو مکان کے قریب تھی دفن کر دیا۔ مرزا نے دستنبو میں اس مقام پر یہ اشعار لکھے ہیں:-

دریغ آں کہ اندر درنگ سہ بیستؔ
سہ دہ شادوسی سال ناشاد زیست

تہ خاک بالیں زخشتش نہ بود
بجز خاک در سر نوشتش نہ بود

خدایا بریں مردہ بخشائشے
کہ نادیدہ در زیست آسائشے

سروشے بہ دلجوئی او فرست
روانش بجاوید مینو فرست

اور بھائی کے مرنے کی تاریخ اس طرح لکھی ہے:-

زسال مرگ ستمدیدہ میرزا یوسف
کہ زیستے بجہاں در۔ زخویش بیگانہ

یکی در انجمن از من ہمی پژوہش کرد
کشیدم آہے و گفتم دریغ دیوانہ

اس میں "آہے" کا تخرجہ دریغ دیوانہ میں سے کیا ہے۔

ایک روز کچھ گورے مرزا کے مکان میں بھی گھس آئے تھے، راجہ کے سپاہیوں نے ہر چند روکا مگر انھوں نے کچھ التفات نہیں کیا۔ مرزا دستنبو میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی نیک خوئی سے گھر کے اسباب کو بالکل نہیں چھیڑا، مگر مجھے اور دونوں بچوں کو اور دو تین نوکروں کو مع چند ہمسایوں کے کرنل برون کے روبرو۔ جو میرے مکان کے قریب حاجی قطب الدین سوداگر کے گھر میں مقیم تھے لے گئے کرنل برون نے بہت نرمی اور انسانیت سے ہمارا حال پوچھا اور ہمکو رخصت کر دیا۔

لطیفہ۔ سنا ہے کہ جب مرزا کرنل برون کے روبرو گئے تو اس وقت کلاہ پیاخ انکے سر پر تھی۔ اُنھوں نے مرزا کی نئی وضع دیکھکر پوچھا کہ ول تم مسلمان؟

لہ بیست یعنی ساٹھ۔ دوسرے مصرعہ میں سہ دہ سے مراد تیس ہے۔ ۱۲

مرزا نے کہا آدھا - کرنیل نے کہا اسکا کیا مطلب؟ مرزا نے کہا شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا" کرنیل یہ سنکر ہنسنے لگا - پھر مرزا نے وزیر ہند کی چھٹی جو ملکہ معظمہ کے مدحیہ قصیدہ کی رسید اور جواب میں آئی تھی - دکھائی - کرنیل نے کہا کہ تم سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر کیوں نہ حاضر ہوئے؟ مرزا نے کہا میں چار کہاروں کا افسر تھا، وہ چاروں مجھے چھوڑکر بھاگ گئے، میں کیونکر حاضر ہوتا؟ کرنیل نے نہایت مہربانی سے مرزا اور انکے تمام ساتھیوں کو رخصت کر دیا۔

اس مقام پر مرزا اپنی کتاب دستنبو میں لکھتے ہیں کہ سچ بات کا چھپانا آزادوں کا کام نہیں ہے - میں آدھا مسلمان کہ جس طرح قید کیش و ملت سے آزاد ہوں اسی طرح بدنامی اور رسوائی کے خوف سے وارستہ ہوں - میری مدت سے یہ عادت تھی کہ رات کو فرینچ[1] کے سوا کچھ کھاتا پیتا نہ تھا، اور اگر وہ نہ ملتی تھی تو مجھ کو نیند نہ آتی تھی، اگر جوانمرد، خدا دوست، خدا شناس، دریا دل مہیش داس ہندوستانی شراب جو رنگ میں فرینچ سے مشابہ، اور بو میں اُس سے بہتر تھی مجھے نہ بھیجتا تو میں ہرگز جانبر نہ ہوتا - اسکے بعد یہ رباعی لکھی ہے -

رباعی

از دیر دلم دایہ زہر در می جُست | از بادۂ ناب یک دو ساغر می جست
فرزانہ مہیش داس بخشید بہ من | آبے کہ برائے خود سکندر می جُست

(بجیک "یعنی آب حیوان")

چونکہ اُسوقت مسلمانوں سے شہر خالی ہو گیا تھا مرزا کے ہندو دوستوں کے سوا جو اُن کے پاس برابر آتے رہتے تھے، اور ہر طرح سے انکی غمخواری کرتے تھے - کوئی انکا غمخوار نہیں رہا تھا - مرزا کی معاش کے صرف دو ذریعے تھے، سرکاری پنشن اور قلعے کی تنخواہ، سو یہ دونوں ذریعے مسدود ہو گئے تھے شہر کے تمام مسلمان عمائد

---

[1] فرینچ وہ چیز جو فرانس سے منسوب ہو اور یہاں اُس سے فرانس کی شراب مراد ہے"

جو مرزا کے دوست اور عزیز تھے - اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے اسکے سوا گھر میں جسقدر بی بی کے پاس زیور یا اور کوئی قیمتی چیز تھی، جب شہر لٹنے لگا تو وہ دوسری جگہ گاڑنے دابنے کے لئے بھیجدیا، جہاں سے فتحمند سپاہی نے کھود کر سب نکال لیا - مگر مرزا نے اس تنگی و عسرت کی حالت میں بھی اپنے متعدد نوکروں میں سے کسی کو جواب نہیں دیا اور جو حالت اُن پر اور انکے متعلقین پر خوش و ناخوش گزری اس میں نوکر بھی برابر شریک رہے - نوکروں کے علاوہ جن لوگوں کے ساتھ مرزا امن کے زمانے میں ہمیشہ سلوک کرتے تھے وہ اس حالت میں بھی مرزا کو ستاتے تھے اور چار ناچار اُنکی بھی مرزا کو خبر لینی پڑتی تھی - مرزا لکھتے ہیں کہ اُس ناداری کے زمانہ میں جسقدر کپڑا، اوڑھنا، اور بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھا گیا، گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا - اسکے بعد کتاب کو اس طرح ختم کرتے ہیں کہ اس بازیچۂ اطفال یعنی کتاب دستنبو کے لکھنے میں کب تک خامہ فرسائی کیجائے؟ جو حالت کہ اسوقت درپیش ہے ظاہر ہے، کہ اسکا انجام یا موت ہے یا بھیک مانگنا، پہلی صورت میں یقیناً یہ داستان ناتمام رہنے والی ہے، اور دوسری صورت میں نتیجہ اسکے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ کہ کسی دکان سے دھتکارے گئے اور کسی دروازے سے کوڑی پیسا کچھ مل گیا پس اپنی ذلت و رسوائی کے سوا اب اسمیں لکھنے کو کچھ باقی نہیں رہا - قدیم پنشن اگر مل بھی گئی تو بھی کام چلتا نظر نہیں آتا، اور نہ ملی تو تو کام ہی تمام ہے - مشکل یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں چونکہ اس شہر کی آب و ہوا اب خستہ دلوں کو راس آتی معلوم نہیں ہوتی - ضرور شہر چھوڑنا اور کسی اور بستی میں جاکر بسرام کرنا پڑیگا

وظیفہ رامپور | غدر کے بعد دو برس تک مرزا کا یہی حال رہا - مگر دو برس بعد نواب یوسف علیخاں مرحوم رئیس رامپور نے سو روپیہ ماہوار ہمیشہ کے لیے مرزا

کے واسطے مقرر کر دیا۔ جو نواب کلب علیخاں مرحوم نے بھی بدستور مرزا کے اخیر دم تک جاری رکھا۔ اور غدر سے تین برس بعد جب مرزا ہر ایک الزام سے بَری ثابت ہوے سرکاری پنشن بھی جاری ہو گئی۔

لطیفہ | جب نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہو گیا اور مرزا تعزیت کے لیے رامپور گئے چند روز بعد نواب کلب علی خاں مرحوم کا لفٹنٹ گورنر سے ملنے کو بریلی جانا ہوا انکی روانگی کے وقت مرزا بھی موجود تھے۔ چلتے وقت نواب صاحب نے معمولی طور پر مرزا صاحب سے کہا "خدا کے سپرد" مرزا نے کہا حضرت خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے آپ پھر اُلٹا مجھکو خدا کے سپرد کرتے ہیں"۔

قاطع برہان | جب مرزا دستنبو کو ختم کر چکے اور اب بھی تنہائی اور سناٹے کا وہی عالم رہا۔ اسوقت سوا اسکے اور کیا چارہ تھا کہ دوات اور قلم کو مونس اور رفیق سمجھیں اور کچھ لکھ پڑھ کر اپنا غم غلط کریں اور دل بہلائیں۔ مرزا پاس اُس وقت سوائے برہان قاطع اور دساتیر کے کوئی کتاب موجود نہ تھی برہان کو اُٹھا کر سرسری نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ پہلی ہی نگاہ میں کچھ بے ربطیاں سی معلوم ہوئیں۔ پھر زیادہ غور سے دیکھا تو اکثر لغات کی تعریف غلط پائی۔ ایک ایک لفظ متعدد فصلوں میں مختلف صورتوں سے لکھا دیکھا شعرا نے جو الفاظ مجاز و کنایے کے استعمال کیے ہیں ان کا ذکر بطور مستقل لغات کے دیکھا طریقۂ بیان اکثر بھونڈا اور اصول لغت نگاری کے خلاف پایا۔ بہت سے لغات کی ایسی تفسیر بھی دیکھی جسکے معنی بالکل سمجھ میں نہ آے مرزا نے یادداشت کے طور پر جو مقام قابل اعتراض نظر آئے انکو ضبط کرنا شروع کیا۔ شدہ شدہ وہ ایک کتاب بن گئی۔ جس کا نام قاطع برہان رکھا گیا اور ۱۲۷۶ھ میں چھپ کر شایع ہو گئی۔ پھر مرزا نے ۱۲۷۷ھ میں باضافۂ دیگر

مضامین و قواعد اُسکو دوسری بار چھپوایا اور اسکا نام درفش کاویانی رکھا یہاں دو چار مثالیں اُن الفاظ کی دینی مناسب معلوم ہوتی ہیں جن پر مرزا نے صاحب برہان کا تخطیہ کیا ہے۔ مثلاً صاحب برہان نے عنبر ارزاں کے معنی گیسوے رسول مقبول کے لکھے ہیں، اور پھر کہتا ہے کہ اسکو عنبر لرزاں بھی کہتے ہیں، مرزا صاحب برہان کی غلطی کا منشا یہ بتلاتے ہیں کہ اُس نے نظامی کا یہ شعر دیکھا ہے جو لغت میں ہے "بوے گراں عنبر لرزاں وہی* گرد و عالم دہی ارزاں دہی۔ پس عنبر لرزاں میں استعارے کو اصلی لغت قرار دیا اور دوسرے مصرع میں ارزاں کے موقعے اور محل کو بالکل نہیں سمجھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زلف عنبر بو جو دونوں جہاں کے بدلے میں بھی ارزاں ہو اسکا نام عنبر ارزاں رکھدیا۔ یا مثلاً برہان میں لکھا ہے "قافلہ شد بمعنی قافلہ رفت یعنی قافلہ سالار رفت کہ کنایہ از فوت شدن پیغمبر باشد" اول تو قافلہ شد کو ایک لغت قرار دینا بیمعنی ہے۔ پھر اسکے معنی قافلہ سالار رفت کہنا اور قافلہ سالار کے جانے سے وفات سرور کائنات مراد لینا غلط در غلط اور خبط در خبط ہے۔ مرزا غلطی کا منشا مولانا نظامی کے اس شعر کو بتاتے ہیں ؎ قافلہ شد واپسی ما ببیں* اے کس ما بیکسی ما ببیں* یہ شعر مخزن اسرار کی مناجات میں واقع ہوا ہے مگر مرزا نے سہو سے اسکو جامی کی طرف منسوب کیا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دوست اور رفیق اور ساتھی سب چلدیے اب تیرے سوا کوئی ہمارا یار مددگار نہیں ہے یا مثلاً صاحب برہان لکھتا ہے "ششش ضرب نتیجہ خوب کنایہ از گوہر درزبا شد و کنایہ از مشک و کنایہ از شکر و عسل و اقسام میوہا ہم ہست و بحذف ضرب هم بنظر آمده که ششش نتیجہ خوب باشد" مرزا نے جو اسکا خاکہ اڑایا ہے وہ

طول طویل ہے خلاصہ یہ ہے کہ اس مرکب اور ہمعنی جملے کو لغت قرار دینا صاحب برہان ہی کا کام ہے۔ اور اس طرح کے صدہا الفاظ ہیں جن پر مرزا نے گرفت کی ہے اور طرح طرح کی لغزشیں اور بے ربطیاں ہیں جو بغیر اسکے کہ درفش کاویانی کو اول سے آخر تک دیکھا جائے ذہن نشین نہیں ہو سکتیں۔

جسوقت مرزا نے قاطع برہان لکھی ہے نہ اسوقت اُنکے پاس ایک قلمی برہان کے سوا کوئی فرہنگ لغات تھی، اور نہ کوئی اور ایسا سامان موجود تھا جس پر تحقیق لغت کی بنیاد رکھی جاتی۔ پس جو کچھ انھوں نے لکھا یا محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر اور ذوق وجدان کی شہادت سے لکھا با ایں ہمہ چند مقامات کے سوا۔ جہاں فی الواقع مرزا سے لغزش ہوئی ہے اور بعض غلطیوں کا انھوں نے خود بھی اقرار کیا ہے، انکے تمام ایرادواجبی معلوم ہوتے ہیں البتہ درفش کاویانی لکھتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ فضلائے کلکتہ کی مصحح و مطبوعہ برہان مرزا کے پیش نظر تھی۔

قاطع بُرہان کی مخالفت اور اسکی وجہ

اس کتاب کا شایع ہونا تھا کہ ہر کس و ناکس مرزا کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گیا۔ ایک قاطع برہان کے جواب میں محرقِ قاطعِ قاطعِ قاطع، موید برہان، ساطع برہان وغیرہ چند رسالے لکھے گئے۔ مخالفت کی وجہ ظاہر ہے تقلید نہ صرف امور مذہبی میں بلکہ ہر چیز، ہر کام، ہر علم اور ہر فن میں ایسی ضروری شے ہو گئی ہے کہ تحقیق کا خیال نہ خود کسی کے دل میں خطور کرتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ سلف کے خلاف کوئی بات زبان پر لائے۔ جو کتاب سو دو سو برس پہلے لکھی جا چکی ہے وہ وحی منزل کی طرح واجب التسلیم سمجھی جاتی ہے۔ پس مرزا کے اعتراضات بُرہان قاطع پر

پر کیسے ہی صحیح اور واجبی ہوتے ممکن نہ تھا کہ انکی سختی کے ساتھ مخالفت نہ کیجاتی۔
بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مرزا نے جو ازراہِ شوخیِ طبع کے صاحب برہان کا جابجا خاکہ اُڑایا ہے اور کہیں کہیں الفاظ ناملائم بھی غیظ و غضب میں انکے قلم سے ٹپک پڑے ہیں زیادہ تر اسو جہ سے مخالفت ہوئی، مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اگر مرزا۔ صاحبِ برہان کی نسبت ایسے الفاظ نہ لکھتے تو بھی مخالفت ضرور ہوتی۔ کیونکہ ہندوستان کے پُرانے تعلیم یافتہ۔ جو آجکل ایک نہایت کس مپرس حالت میں ہیں انکے لئے کنجِ خمول و گمنامی سے نکلنے کا کوئی موقع اسکے سوا باقی نہیں رہا کہ کسی سر برآوردہ اور ممتاز آدمی کی کتاب کا رد لکھیں اور لوگوں پر یہ ظاہر کریں کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں۔
جو رسالے قاطع برہان کے جواب میں لکھے گئے ہیں جب اُنکو سرسری نظر سے دیکھا جاتا ہے تو مرزا کے اعتراضوں کے اکثر جواب صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ ہر ایک مجیب بُرہان کی تائید اس طرح کرتا ہے کہ جس طرح صاحبِ بُرہان نے لغت کی تحقیق کی ہے۔ اس طرح فرہنگ جہانگیری یا فرہنگ رشیدی، یا سراج اللغات یا موید الفضلا، یا ہفت قلزم، یا کسی اور فرہنگ میں لکھا ہے اور اس سے بادی النظر میں صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا اعتراض غلط ہے۔ مگر جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فارسی لغات کی اکثر فرہنگیں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں، اور جو فرہنگ سب سے پہلے لکھی گئی تھی پچھلوں نے زیادہ تر اسی کا تتبع کیا ہے تو کسی مجیب کے جواب کی کچھ وقعت باقی نہیں رہتی۔

قاطع برہان کی تائید

ایران کے ایک مشہور مصنف رضا قلی خاں ہدایت نے ۱۲۸۸ھ یعنی مرزا کی وفات سے چار برس بعد فارسی لغت کی ایک مبسوط کتاب لکھی ہے جو فرہنگ ناصری کے نام سے موسوم ہے، اور

مرزا کی وفات سے دس بارہ برس بعد ہندوستان میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ فارسی لغات کے متعلق جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ بہرحال اُن فرہنگ نگاروں کی تحقیقات سے جنھوں نے ہندوستان میں بیٹھکر فارسی لغت کی کتابیں لکھی ہیں۔ زیادہ تر معتبر اور زیادہ اطمینان کے لائق ہوگا۔ اُس نے اپنی فرہنگ کے شروع میں ایک باب فرہنگ جہانگیری، فرہنگِ رشیدی، اور برہان قاطع، تینوں کی غلطیوں اور لغزشوں کے بیان میں منعقد کیا ہے اور اُسکے بعد ایک باب میں صرف برہان قاطع کی غلطیاں ظاہر کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اندلس ایک جزیرہ ہے ایک پہاڑ کے اوپر، یا غرناطہ ایک صوبہ ہے ہندوستان کا۔ یا چکاک کے تین معنی ہیں، پیشانی قبالہ نویس، اور مہرکن (اور یہ تینوں معنی غلط لکھے ہیں) یا کروخ جو ایک قریہ ہے مضافات ہرات میں اسکو برہان میں لکھا ہے "قریہ ایست از قرائے عالم" یہاں ازراہ طنز صاحب فرہنگ ناصری لکھتا ہے "فی الحقیقت تحقیقے دقیق فرمودہ است" اسی طرح بہت سی غلطیاں صاحب برہان کی اس باب میں ظاہر کی ہیں۔ اور اسکے سوا اپنی تمام فرہنگ میں جابجا اُسکا تخطیہ کیا ہے۔

جو اعتراض مرزا نے برہان پر وارد کیے ہیں، اُنکی بھی جابجا فرہنگ ناصری سے تائید ہوتی ہے۔ ازانجملہ لفظ آبجیس، استخر و اصطخر، احمدر، باختر، راوش، زاوش، اکارکیا، دیژه و ادیژه، اسی طرح کے اور بہت سے الفاظ کی تحقیق فرہنگ ناصری میں مرزا کے بیان کے مطابق پائی جاتی ہے۔ اسکے سوا برہان کے بیان کو جہاں مرزا نے بےمعنی اور مہمل بتایا ہے، رضا قلی خاں بھی اسکو مہمل بتاتا ہے۔ مثلاً لفظ انجلک کی تفسیر میں صاحب برہان لکھتا ہے "ہرچند فراش خیال جاروب سنبل بر حل خرسک ریشی زند از پوست آں پاک نتواند" مرزا اس کی نسبت لکھتے ہیں "فقرۂ اخیر مگر کلام دیوانہ است؟ ہرگاہ خوبیِ تحقیق چناں وحسن

عبارت چنیں باشد مقصود اصلی کہ معلوم کردن مجہولات است از برہان قاطع چگونہ حاصل تواں کرد۔" رضا قلی خاں از راہ طنز اسی فقرہ پر یہ لکھتا ہے "دریں مقام ایں انشائے بدیع و بیان بلیغ زادہ طبع ایشان بودہ۔ برہان ذوق سلیم و سلیقہ مستقیم صاحب برہان خود ہمین عبارات بس است تا ازیں سلیس از وچہ آید" اسی طرح برہان کی اکثر مہمل عبارتیں نقل کرکے اس پر ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ "در ولایت ہند کہ نہ ترکی دانند و نہ پارسی ضبط و تصحیح لغات فارسی کے توانند" ایک جگہ صاحب برہان جامع (جو کہ ایرانی ہے) کا قول برہان قاطع کے باب میں نقل کرتا ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ "برہان قاطع میں لغات بغیر سند اور شواہد کے ذکر کئے گئے ہیں، اُن پر اعتبار نکرنا چاہئے۔ اسمیں کنایات کو بھی علحدہ لغت قرار دیتا ہے اور سریانی و عبرانی و ترکی و ژند و پاژند کے غیر مستعمل لغات کے بیان میں، اور ایک ایک لغت کو بار بار مختلف صورتوں سے ذکر کرنے میں، تطویل لاطائل کرتا ہے" اسکے بعد رضا قلی خاں صاحب برہان جامع کی تصدیق، اور اسکے ساتھ اتفاق رائے کرتا ہے۔ چونکہ مرزا کی لائف میں یہ بیان ہیزم معلوم ہوگا اسلیے ہم اس سے قطع نظر کرتے ہیں جسکو زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو وہ فرہنگ ناصری کو خود ملاحظہ کرے۔

اگرچہ مرزا نے قاطع برہان میں بعض اعتراض غلط کیے ہیں خصوصاً لفظ افسوس کے متعلق ایک بڑی فاحش غلطی کی ہے کہ اسکو لفظ عربی الاصل ماخوذ از اسف قرار دیا ہے۔ اور اس غلطی کا انھوں نے آخرکار خود بھی اعتراف کیا ہے۔ اور عربی الفاظ کی تحقیق سے اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے اور ممکن ہے کہ اسکے سوا اور بھی کہیں کہیں اُن سے غلطی ہوئی ہو، لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو قاطع برہان کے دیکھنے سے مرزا کی سلامتی اور ذوق صحیح کا کافی ثبوت ملتا ہے اور جیسا کہ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ فارسی زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس

طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر" فی الواقع فارسی زبان سے انکو فطری مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ جو رائے کہ انھوں نے محض اپنے وجدان سلیم کی ہدایت سے برہان کی نسبت قائم کی تھی وہی رائے ایران کے محققوں نے اسکی نسبت ظاہر کی ہے، اور جو غلطیاں اور بے ربطیاں مرزا نے برہان میں بتائی ہیں وہ اور انکے سوا اور بیشمار غلطیاں صاحب فرہنگ ناصری نے اس میں نشان دی ہیں۔ اس سے زیادہ ایک ہندوستانی محقق کی سلامتی طبع کا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے۔

مرزا نے قاطع برہاں کے اخیر میں چند فوائد لکھے ہیں، ان میں سے فائدہ اول کا ماحصل یہ ہے کہ ان فوائد کے پیش کرنے میں چونکہ خود نمائی کی بو آتی ہے اسلئے شاید لوگ یہ یہ کہیں کہ خود ہندوستانی ہوکر اور ہندوستانیوں کو مسلم نہ جاننا اور خود زبادانی کا دعوی کرنا بیمعنی ہے۔ سو میں اقرار کرتا ہوں کہ میرا دادا توران سے آیا تھا اور میرا باپ دلی میں پیدا ہوا اور میں آگرے میں۔ حاشا کہ میں اپنے تئیں اہل زبان سمجھتا ہوں میں بلاشبہہ زبانداں ہوں اور میری زبادانی اولاً خدا داد سلامتی طبع کی بدولت ہے، جو غلطی کو قبول نہیں کرتی اور بغیر سچائی کے تسلی نہیں پاتی۔ دوسرے اسوجہ سے ہے کہ میری طبیعت فارسی زبان سے فطرۃً مناسب واقع ہوئی ہے۔ تیسرے مولانا عبدالصمد کے فیض صحبت سے جو مجھکو دو برس تک برابر حاصل رہا۔ چودہ برس کی عمر میں میں نے اس سے تربیت پائی، اور باون برس مشق سخن کی، اب کہ مجھکو چھیاسٹھواں سال ہے۔ میں خدا کا شکر کرتا ہوں اور خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا کہ ان باون برسوں میں اُس نے کس قدر معنی کے دروازے مجھپر کھولے ہیں اور میری فکر کو کس درجے کی بلندی بخشی ہے۔ افسوس کہ لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہ سمجھا، اور زیادہ تر افسوس یہ کہ وہ شان ایزدی کی شناخت سے محروم رہے، اور میری نظم و نثر کے کرشموں کو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا گویا نظیری جنت

آرامگاہ کا مقطع میرے حسب حال ہے۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح — باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

جتنے آدمیوں نے قاطع برہان کے جواب لکھے ہیں ان میں سے بعض کے جواب مرزا نے بھی لکھے ہیں، اور ان جوابوں میں زیادہ تر ظرافت اور شوخیِ طبع سے کام لیا ہے۔ کہیں انکے طرز بیان کا خاکہ اڑایا ہے کہیں انکی تحقیقات کا مضحکہ کیا ہے

لطیفہ۔ مولوی امین الدین کی کتاب "قاطع قاطع" کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا کیونکہ اس میں فحش، اور ناشایستہ الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے کہا حضرت! آپ نے اسکا کچھ جواب نہیں لکھا۔ مرزا نے کہا اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے تو کیا تم بھی اسکے لات مارو گے؟

ایک شخص مرزا احمد علی بیگ متوطن کلکتہ انھوں نے مرزا کے خلاف ایک مبسوط کتاب موید البرہان لکھی ہے، جسکے لکھتے وقت تمام ایشیاٹک سوسائٹی کا کتب خانہ قاطع برہان کے چند اوراق کی تردید کے لئے چھان مارا۔ اور مثل اور مجیبوں کے مرزا کے کسی اعتراض کو تسلیم نہیں کیا اور جو سبک الفاظ مرزا نے صاحب برہان کی نسبت استعمال کئے تھے ویسے ہی الفاظ مرزا کی نسبت استعمال کیے ہیں۔ اپنے تئیں اصفہانی الاصل قرار دیا ہے اور ٹیک چند بہار اور قتیل کی بہت تعریف کی ہے اور اپنی کتاب کی تعریف میں تقریظیں اور تعریفیں لکھوا کر کتاب کے آخر میں چھپوائی ہیں اسکے جواب میں، مرزا نے ایک رسالہ موسوم بہ تیغ تیز لکھا ہے، اور ایک فارسی قطعہ بھی انکو لکھکر بھیجا ہے جسکے چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں جو لطف سے خالی نہیں۔

خواجہ را از اصفہانی بودن آبا چہ سود — خالقش در کشور بنگالہ پیدا کردہ است

با قتیل و جامع برہان و لالہ ٹیک چند — لابہ[1] و سوگیری[2] و لطف و مدارا کردہ است

---

[1] لابہ، خوشامد [2] سوگری، طرفداری

داوری[1] گاہی بنا فرسودہ دروی ہر سہ را — منصف و صدر امین و صدر اعلیٰ کردہ است
گر چنیں باہندیاں دارد لتو لا در سخن؟ — من ہم از ہندم چرا از من تبرا کردہ است
مطلب از بدگفتن من چیست؟ گویا نیک مرد — مزد ایں کار از حق - آمرزش تمنا کردہ است
صاحبِ علم و ادب! ونگہ ز افراطِ غضب — چوں سفیہاں دفترِ نفرین و ذم وا کردہ است
در جدل دشنام کارِ سوقیاں باشد بلے! — ننگ دارد علم از کارے کہ آغا کردہ است
انتقامِ جامعِ برہانِ قاطع می کشد — آنچہ ما کردیم باوے خواجہ با ما کردہ است
من سپاہی زادہ ام گفتارِ من باید درشت — وائے بر وے گر بتقلیدِ من اینہا کردہ است
زشت گفتم لیک دادِ بذلہ سنجی دادہ ام — شوخیِ طبعے کہ دارم ایں تقاضا کردہ است
میکند تائید برہاں لیک برہاں ناپدید — نیست جز تسلیم قولش ہر چہ انشا کردہ است
سُستیِ طرزِ خرامِ خامۂ برہاں نگار — یا نمیداندست یا دانستہ اخفا کردہ است
بہرِ من توہین و بہرِ خویش تحسیں جابجا — ہم مرا ہم خویش را، در دہر رسوا کردہ است
یافتم از دیدنِ تاریخہائے آن کتاب — خود بدم گفت و باحباب خود ایما کردہ است
غازیاں ہمراہِ خویش آورد از بہرِ جہاد — تا نہ پنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ است

قاطع برہان اور اسکے متعلق مرزا کی جسقدر تحریریں ہیں اُن میں اعتراضوں اور جوابوں کے علاوہ بہت سے بیش بہا فائدے اور لطیف و دلچسپ نکتے اور لطائف و ترہات بھی درج ہیں۔

لطیفہ: لفظ فراز کو صاحب برہان اضداد میں گنتا ہے اور فراز کردن کے معنی بند کرنا اور کھولنا دونوں بتاتا ہے۔ مگر مرزا اسکو اضداد میں سے نہیں گنتے، بلکہ بلکہ اسکے معنی صرف بند کرنے کے بتاتے ہیں، اور جو اشعار مخالفوں نے سند میں پیش کئے ہیں مرزا نے اُنھیں اشعار سے اپنے دعوے کی تائید کی ہے۔ مگر۔ چونکہ

---

[1] داوری گاہ محکمہ۔ ۱۲

ہندوستان کے تمام فرہنگ نگاروں نے **فراز** کو اضداد میں شمار کیا ہے۔ اسکی بابت مرزا لکھتے ہیں کہ "اسکو امر اجماعی قرار دینا ویسا ہی اجماع ہے جیسا کہ اسلام نے خلافت یزید پر اجماع کیا تھا"

لطیفہ | صاحب برہان کی چند عامیانہ غلطیاں اور اسکے بیان کی بے ربطیاں ظاہر کرنے کے بعد ایک جگہ لکھتے ہیں "خدا پرستان! از بہر خدا ایں عربی مفہم فارسی مدان (یعنی جامع برہان) کنی پرسم کہ کیست؟ می پرسم کہ چیست؟" ایک اور جگہ نہایت طیش میں آکر لکھتے ہیں "چوں شناسائی حقیقت جوہر لفظ ندارد فرہنگ چرا می نگارد؟ بوریا می بافت رسن می تافت، ہیزم می فروخت، گلخن می افروخت"

مرزا نے ایک فارسی رسالے کے مولف پر جو قاطع برہان کے جواب میں لکھا تھا، اور جو فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ ازالہ حیثیت عرفی کی نالش بھی کی تھی، اگر جب کامیابی کی امید نہ رہی تو آخر کار انھوں نے راضی نامہ داخل کر دیا۔ اثنائے تحقیقات میں دلی کے بعض اہل قلم عدالت میں اس بات کے استفسار کے لئے بلائے گئے تھے کہ جو فقرے مدعی نے اپنے دعوی کے ثبوت میں پیش کئے ہیں آیا فی الواقع اُن سے فحش و دشنام مفہوم ہوتا ہے یا نہیں؟ انھوں نے غریب ملزم کو سزا سے بچانے کے لئے اُن فقروں کے ایسے معنی بیان کئے جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہ ہو۔

لطیفہ | ان مولویوں کا مرزا سے ملنا جلنا تھا۔ کسی نے پوچھا حضرت! انھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی؟ مرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا۔

ہرچہ در نگری جز بجنس مائل نیست ... عیار بیکسی من شرافت نسبی[1] است

گمنام خطوں میں گالیاں | جب یہ مقدمہ داخل دفتر ہو گیا، ایک مدت کے

---

[1] یعنی میری بیکسی کی وجہ شرافت نسبی ہے کیونکہ ہر شخص اپنی جنس کی طرف مائل ہوتا ہے چونکہ شرافت نسبی میں کوئی میرا ہم جنس نہیں ہے اسلئے کوئی میرا ساتھ نہیں دیتا۔ ۱۲

بعد لوگوں نے مرزا کے نام گمنام خط متضمن سب و شتم بھیجنے شروع کیے۔ جن میں شراب نوشی اور بد مذہبی وغیرہ پر سخت نفریں اور طعن و ملامت لکھی ہوتی تھی۔ ان دنوں میں مرزا کی عجیب حالت تھی نہایت مکدر اور بے لطف رہتے تھے۔ اور جب چٹھی رساں ڈاک لیکر آتا تھا تو۔ اس خیال سے کہ مبادا کوئی اس قسم کا خط نہ آیا ہو۔ اُنکا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا۔

راقم کے ساتھ مرزا کا معاملہ

اتفاق سے اُنھیں دنوں میں نواب مصطفٰے خاں مرحوم کے ہمراہ میرا دلّی میں آنا ہوا۔ چونکہ مجھکو ان نالائق گمنام خطوں کے آنے کا حال معلوم نہ تھا، ایک روز مجھ سے ایک ایسی غلطی ہوگئی جسکے تصور سے مجھکو ہمیشہ نہایت شرمندگی ہوتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مذہبی خود پسندی کے نشہ میں سرشار تھے۔ خدا کی تمام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو، اور مسلمانوں کے تہتر فرقوں میں سے اہل سنت کو اور اہل سنت میں سے صرف حنفیہ کو اور ان میں سے بھی صرف اُن لوگوں کو جو صوم و صلوٰۃ اور دیگر احکام ظاہری کے نہایت تقید کے ساتھ پابند ہیں، نجات اور مغفرت کے لائق جانتے تھے۔ گویا دائرہ رحمتِ الٰہی کو کوئن وکٹوریہ کی وسعت سلطنت سے بھی۔ جس میں ہر مذہب و ملت کے آدمی بہ امن و امان زندگی بسر کرتے ہیں۔ زیادہ تنگ اور محدود خیال کرتے تھے جس قدر کسی کے ساتھ محبت یا لگاؤ زیادہ ہوتا تھا اسی قدر اس بات کی تمنا ہوتی تھی کہ اس کا خاتمہ ایسی حالت پر ہو جو ہمارے زعم میں نجات اور مغفرت کے لئے ناگزیر ہے چونکہ مرزا کی ذات کے ساتھ محبت اور لگاؤ بدرجۂ غایت تھا اس لئے ہمیشہ انکی حالت پر افسوس ہوتا تھا۔ گویا یہ سمجھتے تھے کہ روضۂ رضواں میں ہمارا انکا ساتھ چھوٹ جائیگا؛ اور مرنے کے بعد پھر اُن سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ ایک روز مرزا کی بزرگی استادی اور کبرسنی کے ادب اور تعظیم کو بالائے طاق رکھکر خشک مغز واعظوں کی طرح اُن کو

نصیحت کرنی شروع کی۔ چونکہ انکا ثقلِ سماعت انتہا کے درجے کو پہونچگیا تھا، اور اُن سے بات چیت صرف تحریر کے ذریعہ سے کیجاتی تھی۔ نماز پنجگانہ کی فرضیت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا لکچر لکھکر انکے سامنے پیش کیا۔ جس میں اُن سے اس بات کی درخواست تھی کہ آپ کھڑے ہوکر، یا بیٹھکر یا ایما و اشارے سے غرض جس طرح ہو سکے نماز پنجگانہ کی پابندی اختیار کریں۔ اگر وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سہی مگر نماز ترک نہ ہو۔

مرزا کو یہ تحریک سخت ناگوار گزری۔ اور ناگوار گزرنے کی بات ہی تھی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ انھیں دنوں میں لوگ گمنام خطوں میں انکے اعمال و افعال پر بہت نازیبا طریقے سے نفرین و ملامت کر رہے تھے، اور بازاریوں کی طرح کھلم کھلا گالیاں لکھتے تھے۔ مرزا صاحب نے میری لغو تحریر کو دیکھکر جو کچھ فرمایا وہ سننے کے لائق ہے۔ اُنھوں نے کہا "ساری عمر فسق و فجور میں گزری، نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا نہ کوئی نیک کام کیا۔ زندگی کے چند انفاس باقی رہ گئے ہیں، اب اگر چند روز بیٹھکر، یا ایما و اشارے سے نماز پڑھی تو اس سے ساری عمر گناہوں کی تلافی کیونکر ہو سکے گی؟ میں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں میرے عزیز اور دوست میرا منہ کالا کریں اور میرے پاؤں میں رسّی باندھکر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں، اور پھر شہر سے باہر لیجاکر کتّوں اور چیلوں اور کوؤں کے کھانے کو (اگر وہ ایسی چیز کھانا گوارا کریں) چھوڑ آئیں۔ اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں لا الٰہ الا اللہ" لا موجود الا اللہ" لا موثر فی الوجود الا اللہ۔

<u>لطیفہ</u> شاید اُسی روز۔ جبکہ یہ گفتگو ہو چکی تھی اور مرزا صاحب کھانا کھا رہے تھے۔ چٹھی رساں نے ایک لفافہ لاکر دیا۔ لفافے کی بے ربطی اور کاتب کے نام کی اجنبیت سے اُنکو

یقین ہو گیا کہ یہ کسی مخالف کا ویسا ہی گمنام خط ہے جیسے پہلے آ چکے ہیں۔ لفافہ مجھکو دیا کہ اسکو کھولکر پڑھو۔ میں خود دیکھتا ہوں تو فی الحقیقت سارا خط فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ پوچھا کس کا خط ہے؟ اور کیا لکھا ہے؟ مجھے اسکے اظہار میں تامل ہوا فوراً میرے ہاتھ سے لفافہ چھین کر فرمایا کہ شاید آپ کے کسی شاگرد معنوی کا لکھا ہوا ہے۔ پھر اول سے آخر تک خود پڑھا۔ اس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی مسکرا کر کہنے لگے کہ "اس اُلو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔ بڈھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اسکو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اس کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں، کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قرمساق جو بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ کون بیوقوف ہوگا؟

اسکے بعد میں اُن سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ دوسرے روز حضرت نے ایک غزل لکھکر میرے پاس بھیجی جس میں اگرچہ میرے نام اور تخلص کی تصریح نہ تھی لیکن اسکے بعض مضامین اور اشارات سے معلوم ہوا کہ اس میں جو طعن و تعریض ہے وہ میرے ہی نسبت ہے۔ غزل یہ ہے۔

بمقصدے کہ مرآں رار بہ خدا گویند ۔۔۔ برو برو کہ ازاں سو بیا بیا گویند

کسیکہ پائے ندارد چگونہ راہ رود ۔۔۔ خود اہل شرع دریں داوری چہا گویند

ز رمز نخل انا اللہ گوے نا آگاہ ۔۔۔ حدیث جلوہ گہ و موسی و عصا گویند

مگر ز حق نہ بود شرم حق پرستاں را ۔۔۔ کہ نام حق نبرند و ہمیں انا گویند

ز قول شاں نہ بود دل نشین اہل نظر ۔۔۔ جز آں صفات کہ از ذات کبریا گویند

نخوانده در کتب و ناشنیده از فقہا ۔۔۔ بغیر بے مزہ وا گو یہ ہا کہ وا گویند

دم از وُجُودِکَ ذنبٌ[۱] زدند بخبر ان ‌‌ ‌‌ چه سال عطیۂ حق را گناہِ ما گویند
بلے! گناہ بود دعوی وجود از ما ‌‌ ‌‌ باہل راز چنیں گوی تا بجا گویند
دگر ملامتیاں راچہ زہرۂ پاسخ ‌‌ ‌‌ اگر بہ خشم گرایند و ناسزا گویند
نکردہ زر مس خودرا و بہرِ عرض فریب ‌‌ ‌‌ بہ پیش خلق حکایت زکیمیا گویند
کساں کہ دعوی نیکی ہمی کنند ۔ مرزا ‌‌ ‌‌ اگر نہ نیک شمارند ۔ بد چرا گویند؟
طمع مدار کہ یابی خطابِ مولانا ‌‌ ‌‌ بس است ہمچو توئ را کہ پارسا گویند
بگوی مردہ ۔ کہ در دہر کارِ غالبِ زار ‌‌ ‌‌ ازاں گزشت کہ درویش و بینوا گویند

اس غزل کو دیکھکر مجھکو اس بات کا موقع ملا کہ مرزا کے کمالِ شاعری کی نسبت جو خیالات مکنون خاطر ہیں، اور کبھی انکے اظہار کی نوبت نہیں آئی انکو کسی قدر شکایت کے ساتھ ایک مختصر قطعے میں بیاں کیا جائے چنانچہ قطعہ ذیل ترتیب دیکر مرزا صاحب کی خدمت میں بھیجا۔

قطعہ

تو اے کہ رونق پیشنیاں بہم بشکست ‌‌ ‌‌ زنظم و نثر تو کاندر زمانِ ما گفتی
چہ نغمہ ہا کہ بہ قانونِ ذوق سنجیدی ‌‌ ‌‌ چہ بذلہ ہا کہ باندازِ دل رُبا گفتی
رسید نشۂ عرفاں چو ذکرِ مے راندی ‌‌ ‌‌ شگفت خاطرِ یاراں گر از صبا گفتی

---

[۱] یہ ایک مشہور قول صوفیہ کرام کا ہے میں نے جو کچھ مرزا صاحب کو لکھکر دیا تھا اس میں ایک موقعہ پر یہ جملہ بھی لکھا گیا تھا مرزا اسپر اعتراض کرتے ہیں اور اسکو تسلیم نہیں کرتے وہ کہتے ہیں کہ وجود ایک عطیۂ الہی ہے۔ پس اسکو ہمارا گناہ کیونکر کہا جا سکتا ہے؟ البتہ دعوی وجود گناہ ہے۔ اگر اہل راز سے اس طرح کہا جائے تو وہ تسلیم کرسکتے ہیں مگر معلوم رہے کہ جن لوگوں کا یہ قول ہے کہ "وجودک ذنب" وہ ایک وجود واجب کے سوا اور کسی وجود کے قائل نہیں ہیں ۔ وحدت وجود انکا اصل اصول ہے۔ پس انکے نزدیک وجود ماسوا عطیۂ حق نہیں ہے بلکہ وہم و خیال انسانی کے مخترعات میں سے ہے اسلئے وہ کہتے ہیں کہ وجودک ذنب"۔ ۱۲

دوید ریشہ بدلہا چو حرفِ مہر زدی — دمید نخلِ تمنا چو از وفا گفتی
گہر بہ بزم فشاندی اگر ثنا خواندی — اثر ز لفظ وماندی اگر دعا گفتی
ہزار عقدۂ سربستہ باز بکشودی — ہزار نکتۂ پوشیدہ برملا گفتی
ز سرِ تفرقۂ جمع قصہ ہا راندی — ز سیر انفس و آفاق راز ہا گفتی
برآمد از دلِ بیگانگان ترانۂ ذوق — بہ محفلے کہ سخنہائے آشنا گفتی
لطیفہا کہ بلفظ و بیاں نمی گنجید — تو چوں فرشتۂ زغیب آمدی و وا گفتی
بحقِ لطفِ کلامت کہ ہست بر دلِ ما — کہ پایۂ سخن افراشتند تا گفتی
تو اے کہ ہر سخنِ نغز تو بدل جا کرد — جز آں کہ درحق حالی بہ رمز وا گفتی
ہر انچہ گفتۂ اندر جواب عرضِ نیاز — خطا بود کہ بگیرم اگر خطا گفتی
ولے بعربدہ از حرف چند با خویشم — کہ گر نگفتہ ام آخر تو از کجا گفتی
عجب کہ قاعدہ دانِ نیاز مندی را — سفیہ و معجب و خود بین و خود نما گفتی
عجب کہ چاشنی اندوزِ خاکساری را — رہینِ ذوق نوا سنجی انا گفتی
عجب کہ منفعلے راز نقد ناسرہ اش — بہ رزق در گرو عرضِ کیمیا گفتی
نہ راہِ حرف بسوئیت نہ جائے من بدلت — جواب چیست اگر پرسم از کجا گفتی
اگر نہ روے سخن با تو بود - می گفتم — چگونہ گفتی، وچون گفتی، وچرا گفتی
ولیک شرطِ ادب نیست بر تو خردہ گرفت — ہر انچہ درحق من گفتۂ بجا گفتی

جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا اس زمانے میں مجھکو نواب محمد مصطفیٰ خان مرحوم متخلص بہ شیفتہ وحسرتی رئیس جہانگیر آباد کے ہاں تعلق تھا، اور اُن دنوں میں وہ دلی آئے ہوئے تھے، اور میں اُنھیں کے مکان پر مقیم تھا۔ جب یہ قطعہ مرزا صاحب کی نظر سے گزرا تو انھوں نے چار بیت کا ایک نہایت لطیف قطعہ نواب مرحوم کے پاس لکھکر بھیجا جو ذیل میں درج ہے۔

قطعہ

تو اے کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری — ہمی بہ لطف تو خود را امیدوار کنم
چو حالی از من آشفتہ بے سبب رنجید — تو گر شفیع نگردی بگو چہ کار کنم
دو بارہ عمر دہندم اگر بفرض محال — براں سرم کہ دراں عمر ایں دو کار کنم
یکے ادائے عباداتِ عمر پیشینہ — دگر بہ پیشگہِ حالی اعتذار کنم

اگرچہ مجھکو شرم آتی ہے کہ مرزا کے عالی رتبہ کلام کے ساتھ اپنا کم وزن و بے وقعت کلام ناظرین کے سامنے بار بار پیش کروں، مگر مقام اور موقع اس بات کا مقتضی ہے کہ جس واقعے کا ذکر چھڑ گیا ہے اسکو انجام تک پہونچایا جائے۔ مرزا صاحب کے اس قطعے پر میں نے ایک اور قطعہ لکھکر انکی خدمت میں بھیجا جو ذیل میں لکھا جاتا ہے

قطعہ

تو اے کہ عذر فرستادہ بسوے رہی — سزد کہ جان گرامی براں نثار کنم
شکایتے کہ تواں گفت عین اخلاصش — گرم تو دوست شماری ہزار بار کنم
نماند قاعدۂ شکر بے ریا بجہاں — اساس دوستی از شکوہ استوار کنم
چو شکوہ جز بہ تقاضای دوستی نبود — زغیر شکر و شکایت ز دوستدار کنم
سرشت پاک و دل صاف دادہ اند مرا — بحرف تلخ ولے خالی از غبار کنم
خوش آنکہ ساز کنم از تو شکوۂ بیجا — تو اعتذار کنی و من افتخار کنم
خوش آنکہ عذر تو چوں در کند مرا بہ زمیں — دگر بہ پیشش تو تمہید اعتذار کنم
براں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد زیں پس — زکارہاے جہاں خاصہ ایں سہ کار کنم
زکردہ توبہ نمایم زگفتہ استغفار — وگر سپاس تو پنہان و آشکار کنم

جب یہ قطعہ مرزا صاحب کے پاس پہنچا اس پر یہ لکھکر کہ بس اب بیت بحثی موقوف میرے پاس بھیجدیا۔ اسکے بعد پھر اور کچھ نہیں لکھا گیا۔

استعداد عربی مرزا نے عربی میں صرف و نحو کے سوا اور کچھ اُستاد سے نہیں پڑھا تھا، مگر چونکہ علم لسان سے انکو فطری مناسبت تھی انکی نظم و نثر اُردو فارسی کے دیکھنے سے کہیں اس بات کا خطرہ تک دل میں نہیں گزرتا کہ یہ شخص عربیت اور فن ادب سے ناواقف ہوگا۔ عربی الفاظ کو انھوں نے ہر جگہ اسی سلیقے سے استعمال کیا ہے جس طرح ایک اچھے فاضل اور ادیب کو استعمال کرنا چاہیے۔

فارسی دانی شاعری جسکا ملکہ انکی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا اس سے قطع نظر کرکے فارسی زبان اور فارسی الفاظ و محاورات کی تحقیق اور اہل زبان کے اسالیب بیان پر مرزا کو اسقدر عبور تھا کہ خود اہل زبان میں بھی مستثنیٰ آدمیوں کو ایران کے مستند شعرا کی زبان پر اس قدر عبور ہوگا۔

عروض اسکے سوا فن عروض میں بھی انکو کافی دستگاہ معلوم ہوتی ہے اکثر بڑے بڑے نامور شعرا کو دیکھا اور سنا گیا ہے کہ باوجود کمال شاعری کے اس فن سے محض ناآشنا ہوتے ہیں اور سیدھی سیدھی بحروں کے سوا جن کے وزن اور قول کا اندازہ صرف استقامت طبع سے ہو سکتا ہے۔ اور بحروں میں کلام موزوں نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مولانا روم فرماتے ہیں "من ندانم فاعلاتن فاعلات + شعر میگویم به از قند و نبات"۔ مرزا کا ایسا حال نہ تھا۔ چنانچہ فارسی اُردو میں متعدد غزلیں اور نیز ایک آدھ فارسی قصیدہ ایسی ٹیڑھی بحروں میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ اکثر موزوں طبع بغیر واقفیت عروض کے ان بحروں میں نہیں چل سکتے۔

نجوم علم نجوم سے کسی قدر، اور اُسکی اصطلاحات سے پوری واقفیت انکو تھی چنانچہ انکی نظم فارسی میں جابجا اسکا کافی ثبوت ملتا ہے۔

تصوف علم تصوف سے جسکی نسبت کہا گیا ہے کہ "برای شعر گفتن خوب ست" انکو خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے

انکے مطالعہ سے گزرے تھے۔ اور سچ پوچھیے تو انھیں متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہمعصروں میں بلکہ بارہویں اور تیرہویں صدی کے تمام شعرا میں ممتاز بنادیا تھا۔

تاریخ فن تاریخ اور سیاق[1] و مساحت وغیرہ سے انکو مطلق لگاؤ نہ تھا۔ جس زمانے میں کہ وہ خاندانِ تیموریہ کی تاریخ یعنی مہرِ نیم روز لکھ رہے ہیں کسی نے انکو مورخ سمجھکر کچھ سوالات کیئے ہیں۔ اسکے جواب میں لکھتے ہیں "میں فن تاریخ و مساحت وسیاق سے اتنا بیگانہ ہوں کہ ان فنوں کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ کارپردازان دفتر شاہی خلاصہ حالات ازروے کتب اُردو میں لکھکر میرے پاس بھیجدیتے ہیں میں اسکو فارسی کرکے حوالے کرتا ہوں۔ میرے ہاں ایک کتاب بھی نہیں، میں اسی قدر ہوں کہ نظم و نثر بقدر اپنی استعداد کے لکھ سکتا ہوں، مورّخ نہیں ہوں۔

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم　　از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس"

خط مرزا کا خط نستعلیق شفیعہ آمیز نہایت شیریں اور دلآویز تھا جیسا کہ اکثر اہل ایران کا ہوتا ہے اور باوجود خوشخطی کے نہایت زود نویس اور تیز دست تھے۔

شعر خوانی شعر پڑھنے کا انداز بھی خاصکر مشاعروں میں حد سے زیادہ دلکش اور مؤثر تھا۔ میں نے غدر سے چند سال پہلے جبکہ دیوان عام میں مشاعرہ ہوتا تھا صرف ایک دفعہ مرزا صاحب کو مشاعرے میں پڑھتے سنا ہے چونکہ انکے پڑھنے کی باری سب کے بعد آئی تھی اسلیے صبح ہوگئی تھی۔ مرزا نے کہا صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں، یہ کہکر اول اُردو طرح کی غزل اور اسکے بعد فارسی کی غیر طرح نہایت پُردرد آواز سے پڑھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدر دان نہیں

---

[1] لطیفہ۔ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ صاحب سے کسی نے پوچھا کہ مرزا صاحب کو ریاضی میں بھی کچھ دخل تھا یا نہیں، انھوں نے کہا ایسا ہی دخل تھا جیسا کہ مجھے شاعری میں ہے۔

پاتے، اور اسلئے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

جس زمانے میں میر نظام الدین ممنون شاہ صاحب کے پرانے مدرسے میں مشاعرہ کرتے تھے ایک مشاعرے میں مرزا نے اپنا فارسی قصیدہ دریا گریستن اور تنہا گریستن جو جناب امام حسینؑ کی منقبت میں اُنھوں نے لکھا تھا پڑھا سُنا ہے کہ مجلس مشاعرہ بزم عزا بنگئی تھی۔ جب تک قصیدہ پڑھا گیا لوگ برابر روتے رہے۔ مفتی صدر الدین خان مرحوم بھی موجود تھے۔ اتفاق سے اُسی حالت میں مینہ برسنے لگا۔ مفتی صاحب نے کہا "آسمان ہم گریست"

اسی قصیدے کی نسبت سید اکبر مرزا خلف الصدق ناظر سید حسین مرزا مرحوم بیان کرتے ہیں کہ بندر گاہِ بصرہ میں ایک جگہ مجلس عزا تھی، اور بارش ہو رہی تھی۔ بانی مجلس نے مجھ سے کہا کہ تم بھی کچھ پڑھو۔ میرے پاس اسوقت پڑھنے کی کوئی چیز مرثیہ یا کتاب نہ تھی اسی قصیدے کے چند اشعار زبانی یاد تھے۔ میں نے وہی پڑھ دیے پانچ ہی سات شعروں پر مجلس میں خوب رقت ہوئی۔ عرب، عجم اور ہندی سب اس مجلس میں شریک تھے۔ مجلس کے بعد ہر ایک عجمی مجھ سے پوچھتا تھا کہ یہ اشعار کس شخص کے تھے؟ خصوصاً اس شعر کی بہت تعریف کرتے تھے۔

مزدِ شفاعت و صلۂ صبر و خونبہا ہیچ از کسے نخواستہ اِلّا گریستن

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ایک دفعہ مرزا دبیر مرحوم نے اسی شعر پر مصرعے لگائے تھے مگر اُنکو خود پسند نہ آئے اور یہ کہا کہ جس رُتبے کا یہ شعر ہے ویسے مصرعے نہیں لگ سکتے۔

مرزا کے اخلاق و عادات و خیالات

وسعت اخلاق | مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا، بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ اُن سے

مل آتا تھا اسکو ہمیشہ اُن سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھکر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے، اور انکی خوشی سے خوش اور انکے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اسلیے انکے دوست ہر ملت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بیشمار تھے۔ جو خطوط اُنھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں ان کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت غمخواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمے فرض عین سمجھتے تھے۔ انکا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمایشوں سے کبھی تنگدل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمایشیں انکے بعض خالص و مخلص دوست کرتے تھے اور وہ انکی تعمیل کرتے تھے۔ لوگ اکثر بیرنگ خط بھیجتے تھے مگر انکو کبھی ناگوار نہ گزرتا تھا۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھکر بھیجتا تھا تو سخت شکایت کرتے تھے۔ اُنھوں نے میسور کے ایک شہزادے کو اپنی کوئی کتاب بھیجی ہے، اُسنے کتاب کی رسید لکھی ہے اور قیمت دریافت کی ہے اسکے جواب میں لکھتے ہیں "حرفِ پرسشِ مقدارِ قیمت چرا بر زبانِ قلم رفت ؟ ہنجارِ نوازشِ نیازمندانِ بے نوا نہ انیست۔

بے سرمایہ ام نہ فرومایہ۔ سخنورم نہ سوداگر۔ موئینہ پوشم نہ کتاب فروش۔ پذیرندہ عطایم نہ گیرندہ بہا۔ ہرچہ آزادگاں بشہزادگاں فرستند نذر ست، ہرچہ شاہزادگان بہ آزادگاں بخشند تبرک۔ بیع و شرا نیست، چون و چرا نیست۔ ہرچہ فرستادہ ام ارمغانست و ہرچہ خواہم فرستاد ارمغاں خواہد بود"

مروت مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجہ غایت تھا۔ باوجودیکہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے، بااینہمہ۔ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں "جہاں تک ہو سکا

احباب کی خدمت بجالایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا، اور اصلاح دیتا تھا۔ اب آنکھ سے اچھی طرح سوجھے نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔"

لطیفہ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بو علی قلندر کو بسبب کبر سن کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کردی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمت اصلاح اشعار مجھے معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہوسکے گا لکھدیا کرونگا۔" باوجود اسکے بھی لوگ مرزا کو برابر ستاتے رہتے تھے۔

لطیفہ ایک دفعہ کہیں مرزا تفتہ نے یہ لکھدیا تھا کہ آپ نے بہ سبب ذوق سخن کے اصلاح اشعار منظور فرمائی تھی۔ اسکے جواب میں لکھتے ہیں "لاحول ولا قوۃ! کس ملعون نے بسبب ذوق شعر کے اشعار کی اصلاح منظور رکھی ہے؟ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بطریق قہر درویش بجان درویش لکھا تھا، جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے۔ میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔"

فراخ حوصلگی اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل اُنکے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ اُنکے مکان کے آگے اندھے لنگڑے لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے غدر کے بعد انکی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی ہوگئی تھی، اور کھانے پہننے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا، مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے اسلیے اکثر تنگ رہتے تھے۔ غدر کے بعد ایکبار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹنٹ گورنر کے دربار میں انکو حسب معمول سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا لفٹنٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا اسلیے انھوں نے دربار سے آتے ہی

خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لئے بھیجدی تھیں چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب انکو انعام دیکر رخصت کیا

وہ اپنے اُن دوستوں کے ساتھ جو گردشِ روزگار سے بگڑ گیے تھے نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دلّی کے عمائد میں سے ایک صاحب۔ جو مرزا کے دلی دوست تھے، اور غدر کے بعد اُنکی حالت سقیم ہوگئی تھی۔ ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے۔ مرزا نے کبھی انکو مالیدہ یا جامہ دار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل انکے بدن پر دیکھکر دل بھر آیا۔ اُن سے پوچھا کہ یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی ہے مجھے اسکی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے "آپ مجھے بھی فرغل کے لیے یہ چھینٹ منگوادیں۔ اُنھوں نے کہا یہ فرغل آج ہی بنکر آیا ہے" اور میں نے اسی وقت اسکو پہنا ہے، اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔ مرزا نے کہا جی تو یہی چاہتا کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں مگر جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے آپ یہاں سے مکان تک کیا پہنکر جائینگے؟ پھر اِدہر اُدھر دیکھکر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چغہ اُتار کر اُنھیں پہنادیا اور اس خوبصورتی کے ساتھ وہ چغہ انکی نذر کیا۔

وہ ایک خط میں لکھتے ہیں قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چل دوں، کبھی شیراز جانکلا کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہونچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاوں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں،

بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار۔ میرے اور معاملاتِ کلام و کمال سے قطع نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔"

جیسی مرزا کی طبیعت میں دراکی اور ذہن میں جودت اور سرعتِ انتقال تھی اسی طرح انکا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا، ہمیشہ کرایے کی کتابیں منگوا لیتے تھے، اور انکو دیکھکر واپس بھیجدیتے تھے۔ مگر جو لطیفہ یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی تھی انکے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے جسکی سند اہل زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں۔ کلکتے میں جن لوگوں نے انکے کلام پر اعتراض کیے تھے اور جن کے جواب میں مرزا نے مثنوی بادِ مخالف لکھی تھی، انکو مثنوی کے علاوہ ایک ایک اعتراض کے جواب میں دس دس بارہ بارہ سندیں اساتذہ کے کلام سے لکھکر علیحدہ بھیجی تھیں۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے خطوط میں انکو مفصل بیان کیا ہے۔ برہان قاطع پر جو کچھ اُنھوں نے لکھا وہ محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر لکھا۔ فکر شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالمِ سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے۔ اور جب کوئی شعر سرانجام ہوتا تھا تو کمربند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلمبند کر لیتے تھے۔

شعر فہمی

شعر فہمی اور کتاب فہمی میں وہ ایک مستثنیٰ آدمی تھے۔ کیسا ہی مضمون ہو وہ اکثر ایک سرسری نظر میں اُسکی تہ کو پہنچ جاتے تھے۔ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم "گلشنِ بیخار" میں مرزا کی نسبت لکھتے ہیں "مضامینِ شعری را کما ہو حقہ، می فہمد و بجمیع نکات و لطائف پے می برد، وایں فضیلتے است کہ مخصوص خواص اہل سخن است اگر طبع سخن شناس داری بایں نکتہ می رسی، چہ خوش فکر اگرچہ کمیاب است اما خوش فہم کمیاب تر۔ خوشا حال کسیکہ ازہر دو شربے یافتہ، در خطے ربودہ۔ بالجملہ

چنیں نکتہ سنج نغز گفتار کمتر مرئی شدہ"۔ نواب ممدوح نے مجھ سے ایک واقعہ بیان کیا جس سے مرزا کی سخن سنجی کا بہت بڑا ثبوت ملتا ہے۔ مولانا آزردہ نے "دور نہیں" جو زمیں اس زمین میں غزل لکھی تھی۔ اس میں اتفاق سے مطلع بہت اچھا نکل آیا تھا۔ مولانا نے اپنی غزل دوستوں کو سنا کر انسے کہا کہ اگرچہ بحر دوسری ہے مگر اس ردیف و قا۔ میں نظیری کی بھی ایک غزل ہے جسکا مطلع یہ ہے کہ "عشق عصیا النست اگر مستور نیست + کشتۂ جرم زباں مغفور نیست + ظاہر ہے کہ اگر نظیری ہندی نژاد ہوتا اور اسی زمین جس میں ہماری غزل ہے۔ اردو غزل لکھتا تو اسکا مطلع اس طرح ہوتا۔ عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں + کشتۂ جرم زباں ناجی و مغفور نہیں آؤ آج مرزا غالب کے ہاں چلیں اور بغیر اسکے کہ قائل کا نام لیا جائے۔ اپنا مطلع اور نظیری کے مطلع کا یہی اردو ترجمہ (جو اوپر مذکور ہوا) مرزا کو سنائیں اور پوچھیں کہ کونسا مطلع اچھا ہے چونکہ نظیری کا مطلع اردو ترجمہ سے بہت پست ہوگیا تھا۔ سب کو یقیں تھا کہ مرزا نظیری کے مطلع کو ناپسند کرینگے۔ اور مولانا آزردہ کے مطلع کو ترجیح دینگے چنانچہ مولانا اور نواب صاحب اور بعض اور احباب مرزا کے ہاں پہنچے معمولی بات چیت کے بعد مولانا نے کہا کہ اردو کے دو مطلعے ہیں! ان میں آپ محاکمہ کیجئے کہ کونسا مطلع اچھا ہے؟ اور بطور ہیٹھن کے اوّل نظیری کے مطلع کا یہی ترجمہ پڑھا۔ ابھی مولانا اپنا مطلع پڑھنے نہیں پائے تھے کہ مرزا اُس مطلع کو سنکر سر دھننے لگے، اور متحیر ہوکر پوچھنے لگے کہ یہ مطلع کس نے لکھا؟ اور اس قدر تعریف کی کہ مولانا آزردہ کو یہ اُمید نہ رہی کہ اس سے زیادہ میرے مطلع کی داد ملیگی چنانچہ اُنھوں نے اپنا مطلع نہیں پڑھا۔ اور سب لوگ نہایت تعجب کرتے ہوئے وہاں سے اُٹھے۔

کتاب فہمی مرزا حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور انکو خوب سمجھتے تھے۔ نواب فرماتے تھے کہ میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ۔ جو

حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا۔ مطالعہ کر رہا تھا، اور ایک مقام پر بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اتفاقاً اسی وقت مرزا صاحب آنکلے۔ میں نے وہ مقام مرزا کو دکھایا۔ اُنھوں نے کسی قدر غور کے بعد اسکا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب بھی شاید اُس سے زیادہ نہ بیان کر سکتے۔

حسنِ بیان اور ظرافت مرزا کی تقریر میں انکی تحریر اور انکی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا اور اسی وجہ سے لوگ ان سے ملنے اور انکی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے، مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حسن بیان، حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا اُنکی خصوصیات میں سے تھا۔

لطیفہ ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تو قلعے میں گئے بادشاہ نے پوچھا مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟ عرض کیا پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔

لطیفہ۔ ایک دن نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر ملنے کو آئے۔ ان کے مکان کے آگے چھتہ بہت تاریک تھا۔ جب چھتے سے گزر کر دیوان خانے کے دروازے پر پہنچے۔ تو وہاں نواب صاحب انکے لینے کو کھڑے تھے۔ مرزا نے انکو دیکھکر یہ مصرع پڑھا کہ آب چشمۂ حیواں دروں تاریکیست" جب دیوان خانے میں پہنچے تو اُسکے دالان میں بسبب شرق رویہ ہونے کے دھوپ بھری ہوئی تھی۔ مرزا نے وہاں یہ مصرع پڑھا "ایں خانہ تمام آفتاب ست"

لطیفہ ایک صحبت میں مرزا۔ میر تقی کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے، اُنھوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی مرزا نے کہا میں تو تم کو میری

سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں"۔

لطیفہ مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھتے اُٹھتے تھے وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا، اور اسکے ایک جانب ایک کوٹھری تنگ و تاریک تھی۔ جسکا در اسقدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں بہت جھک کر جانا پڑتا تھا، اُس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور لُو کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے۔ ایک دن۔ جبکہ رمضان کا مہینا اور گرمی کا موسم تھا۔ مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اُسوقت مرزا صاحب اُسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں پہنچے، اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھکر کہنے لگے کہ ہمنے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے، مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا۔ مرزا نے کہا "قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے، مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری تو ہے"۔

الغرض مرزا کی کوئی بات لطف اور ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ اگر کوئی انکے تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف و ظرائف کی تیار ہو جاتی

خودداری باوجودیکہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا، مگر خودداری و حفظ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ شہر کے امرا و عمائد سے برابر کی ملاقات تھی کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے۔ عمائد شہر میں سے جو لوگ ان کے مکان پر نہیں آتے تھے۔ وہ بھی کبھی انکے مکان پر نہیں جاتے تھے اور جو شخص انکے مکان پر آتا تھا وہ بھی اسکے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ ایک روز کسی سے ملکر نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے مکان پر آئے، میں بھی

اسوقت وہاں موجود تھا، نواب صاحب نے کہا آپ مکان سے سیدھے یہیں آتے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا؟ مرزا نے کہا مجھکو اُنکا ایک آنا دینا تھا، اسلیے اول وہاں گیا تھا، وہاں سے یہاں آیا ہوں۔

لطیفہ ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم، جُرنٹ میں سوار۔ مرزا کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو انھوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا مضمون یہ کہ آج مجھکو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس طرف سے گزریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔ جب یہ رقعہ دیوان جی کے پاس پہنچا وہ نہایت شرمندہ ہوے اور اُسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔

خوراک مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے، یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی اُنھوں نے کھچڑی یا شولہ کبھی نہیں کھایا اخیر میں انکی خوراک بہت کم ہو گئی تھی۔ صبح کو وہ اکثر شیرہ بادام پیتے تھے۔ دن کو جو کھانا ان کے لئے گھر میں سے آتا تھا اس میں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا۔ ایک پیالے میں بوٹیاں دوسرے میں لعاب یا شوربا ایک پیالی میں ایک پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا، ایک پیالی میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی ایک اور پیالی میں دو تین پیسے بھر دہی۔ اور شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب بس اس سے زیادہ انکی خوراک اور کچھ نہ تھی۔

لطیفہ ایک روز دوپہر کا کھانا آیا، اور دسترخوان بچھا، برتن تو بہت سے تھے مگر کھانا نہایت قلیل تھا مرزا نے مسکرا کر کہا اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجیے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھیے

تو بایزید کا"

آموں کی رغبت فواکہ میں آم انکو نہایت مرغوب تھا۔ آموں کی فصل میں انکے دوست دور دور سے انکے لیے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے، اور وہ خود اپنے بعضے دوستوں سے تقاضا کر کے آم منگواتے تھے۔

حسن طلب انکے فارسی مکتوبات میں ایک خط ہے جو غالباً کلکتے کے قیام کے زمانے انھوں نے امام باڑہ ہگلی بندر کے متولی صاحب کو آموں کی طلب میں لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں "تختی شکم بندہ ام، و قدرے ناتواں ہم آرایش خواں جویم، وہم آسایشِ جاں۔ خرد وراں دانند کہ ایں ہر دو صفت بہ انبہ اندر ست، اہل کلکتہ بر آنند کہ قلم وانبہ ہگلی بندرست آرائے انبہ از ہگلی، وگل از گلشن، ایثار از جناب وسپاس از من، شوق می سگالد کہ تا پایانِ موسم دو سہ بار بخاطرِ دلی نغمت خواہم گذشت۔ وآز می نالد کہ حاشا بدیں مایہ برخورداری خورسند نخواہم گشت"

لطیفہ ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ، جن میں مرزا بھی تھے باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لدرہے ہے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آسکتا تھا۔ مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟ مرزا نے ہاتھ باندھکر عرض کیا "پیر و مرشد یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے" بر سر ہر دانہ بنوشتہ عیاں + کایں فلاں ابن فلاں ابن فلاں" اسکو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔ بادشاہ مسکرائے اور اُسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی

لطیفہ حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے انکو آم نہیں بھاتے تھے۔ ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔

ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے گلی سے گزرا - آم کے چھلکے پڑے تھے، گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیا۔ حکیم صاحب نے کہا دیکھیے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔" مرزا نے کہا بیشک گدھا نہیں کھاتا۔

مرزا کی نیت آموں سے کسی طرح سیر نہ ہوتی تھی - اہل شہر تحفۃً بھیجتے تھے، خود بازار سے منگواتے تھے، باہر سے دُور دُور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا، مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا - نواب مصطفٰے خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے، اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہییں جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی رائے بیان کرو۔ مرزا صاحب نے کہا بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونا چاہییں میٹھا ہو اور بہت ہو۔" سب حاضرین ہنس پڑے۔

ناؤنوش | مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی جو مقدار انھوں نے مقرر کر لی تھی اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اسکی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی، اور اسکو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھکو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا، اور کنجی مجھکو نہ دینا - اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے، اور نشے کی جھانجھ میں داروغہ کو بہت بُرا بھلا کہتے تھے، مگر داروغہ نہایت خیرخواہ تھا ہرگز کنجی نہ دیتا تھا۔ اول تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے، دوسرے اُس میں دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے جس سے اُسکی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوے اوست   آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

مگر باوجود اس قدر احتیاط اور اعتدال کے اس کافر نشے کی عادت نے

آخر کار مرزا کی صحت کو سخت صدمہ پہونچایا جس کی شکایت سے اُنکے تمام اُردو رقعات بھرے ہوے ہیں۔

لطیفہ | مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست ۔ جنسے نہایت بے تکلفی تھی ۔ اکثر شام کو اُنکے پاس جاکر بیٹھتے تھے ۔ اور مرزا سرور کے عالم میں اس وقت بہت پُرلطف باتیں کیا کرتے تھے ۔ ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے ، اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوے کراہ رہے تھے ۔ میر مہدی پاؤں دابنے لگے ۔ مرزا نے کہا بھئی تو سیدزادہ ہے ، مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے ؟ اُنھوں نے نہ مانا ، اور کہا آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اُجرت دیدیجئے گا ۔ مرزا نے کہا ہاں اسکا مضائقہ نہیں ۔ جب وہ پیر داب چکے اُنھوں نے اُجرت طلب کی ۔ مرزا نے کہا بھیا کیسی اُجرت ؟ تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمھارے پیسے دابے ، حساب برابر ہوا۔

لطیفہ | ایک دن قبل غروب آفتاب کے مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں صرف شامی کباب تھے ۔ میں بھی وہاں موجود تھا اور انکے سامنے بیٹھا رومال سے مکھیاں جھل رہا تھا مرزا نے کہا آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں ، میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دونگا ۔ پھر آپ ہی یہ حکایت بیان کی کہ نواب عبدالاحد خاں کے دستر خوان پر اُنکے مصاحبوں اور عزیزوں اور دوستوں کے لیے ہر قسم کے کھانے چنے جاتے تھے ، مگر خاص اُن کے لئے ہمیشہ ایک چیز تیار ہوتی تھی وہ اسکے سوا اور کچھ نہ کھاتے تھے ۔ ایک روز انکے لیے مزعفر پکا تھا ، وہی انکے سامنے لگایا گیا ۔ مصاحبوں میں ایک ڈوم بہت منہ لگا ہوا تھا جو اس وقت دستر خوان پر موجود تھا ۔ نواب نے اُسکو کھانا دینے کے لیے خالی رکابی طلب کی ۔ اُسکے آنے میں دیر ہوئی ۔ نواب کھانا کھاتے جاتے تھے اور خالی رکابی بار بار مانگتے تھے ۔ وہ مصاحب نواب کے آگے رومال ہلانے لگا ، اور کہا حضور اور رکابی کیا کیجیگا

اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے" نواب یہ فقرہ سُنکر پھڑک گئے اور وہی رکابی اس کی طرف سرکادی "

لطیفہ| ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تاروں کی ظاہری بے نظمی اور انتشار دیکھکر بولے "جو کام خودرائی سے کیا جاتا ہے اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ ستاروں کو تو دیکھو۔ بس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں؛ نہ تناسب ہے نہ انتظام ہے، نہ بیل ہے نہ بوٹا ہے، مگر بادشاہ خودمختار ہے، کوئی دَم نہیں مار سکتا۔

لطیفہ| ایک دن سید سردار مرزا مرحوم شام کو چلے آئے۔ جب تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ جانے لگے تو مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمعدان لیکر کھسکتے ہوئے لب فرش تک آئے تاکہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں اُنھوں نے کہا قبلہ و کعبہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؛ میں اپنا جوتا آپ پہن لیتا۔ مرزا نے کہا "میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمعدان نہیں لایا، بلکہ اسلیئے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔

اگرچہ شاعری کی حیثیت سے اُنھوں نے شراب کی جابجا تعریف کی ہے مگر اعتقاداً وہ اسکو بہت بُرا جانتے تھے، اور اپنے فعل پر سخت نادم تھے۔ باوجود اسکے اُنھوں نے کبھی اپنے اس فعل کو چھپایا نہیں۔

شراب کے متعلق انکی ظرافت آمیز باتیں بہت مشہور ہیں۔ ایک شخص نے انکے سامنے شراب کی نہایت مذمت کی اور کہا کہ شرابخوار کی دعا قبول نہیں ہوتی مرزا نے کہا بھائی جسکو شراب میسر ہے اسکو اور کیا چاہئے جسکے لیے دعا مانگے۔

لطیفہ| ایک خط کو اس طرح شروع کرتے ہیں "بے مے نکند در کفِ من خامہ روانی + سردست ہُوا آتش بے دود کجائی + میر مہدی! صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑرہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے دو حرف لکھتا ہوں، ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی مگر وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے فوراً رگ وپے میں

دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا، دماغ روشن ہو گیا، نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب!!! ہائے غضب ہائے غضب"۔ یہ خط غدر کے بعد اُس زمانے میں لکھا ہے جب پنشن وغیرہ سب بند ہے اور بسبب عسرت و تنگدستی کے کچھ پیتے پلاتے نہیں ہیں۔

لطیفہ | میر مہدی مجروح نے جے پور سے خط بھیجا ہے اور وہاں جو کسی تقریب میں کئی سو من مصری کا شربت مہمانوں کے لیے کیا گیا تھا اسکا ذکر لکھا ہے اسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں۔

"میر احمد حسین و مرزا قربان بیگ نامۂ شمارا خوانند و بذوق شربت ہفت صد من نبات ہر دو را آب در دہن گشت سخن از بادۂ ناب بود ورنہ مرا نیز دل از جا رفتے"۔

مرزا نے غزلیات و قصائد و قطعات و رباعیات میں شراب کے متعلق جسقدر مضمون باندھے ہیں وہ خواجہ حافظ اور عمر خیام سے کم نہ ہونگے، یہاں ایک شعر اُردو غزل کا اور ایک فارسی غزل کا اور ایک فارسی رباعی لکھی جاتی ہے

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں	یہ سوء ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند	جز روزۂ درست بہ صہبا کشودۂ

رباعی

غالب بہ سخن گرچہ گست ہمسر نیست	از نشۂ ہوش ہیچت اندر سر نیست
مے خواہی و مفت و نغز انگہ بسیار!!	ایں بادہ فروش ساقیِ کوثر نیست

اسلام کا یقین | مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل اصول اور رکن رکین جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بظاہر اہل حال سے نہ تھے، مگر جیسا کہ کہا گیا ہے "من احب شئیاً اکثر ذکرہٗ"، توحید وجودی

اُنکی شاعری کا عنصر بن گئی تھی۔ اس مضمون کو اُنھوں نے جسقدر اصنافِ سخن میں بیان کیا ہے غالباً **نظیری** اور **بیدل** کے بعد کسی نے نہیں بیان کیا۔ مرزا کے حق میں اگر اور کچھ نہیں تو عرفی کا یہ شعر ضرور صادق آتا ہے۔

اُمید ہست کہ بیگانگیِ عرفی را ۔ بدوستیِ سخنہائے آشنا بخشند

اُنھوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک توحید وجودی اور دوسرے نبی اور اہلبیت کی محبت، اور اسی کو وہ وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔

اگرچہ شاعر کے کلام سے اسکے عقائد پر استدلال نہیں ہو سکتا مگر جو بات دل سے نکلتی ہے وہ چھپی نہیں رہتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر حکمائے اسلام نے نعیم جسمانی سے انکار کیا ہے مرزا بھی اسکے قائل نہ تھے چنانچہ اُنھوں نے اس خیال کو اپنے شاعرانہ انداز میں متعدد جگہ ظاہر کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

"ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ✦ دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"

یہی خیال ایک فارسی رباعی میں اس طرح ظاہر کیا ہے

گردیدن زاہداں بجنت گستاخ ۔ دست درازی بہر شاخ بہ شاخ

چوں نیک نظر کنی ز روئے تشبیہ ۔ ماند بہ بہائم و علف زار فراخ

مرزا باوجودیکہ احکام ظاہری کے بہت کم پابند تھے، لیکن مسلمانوں کی ذلت کی کوئی بات سن پاتے تھے تو انکو سخت رنج ہوتا تھا۔ ایک روز میرے سامنے اسی قسم کے ایک واقعے پر نہایت افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں ہے، پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھکو کیوں اس قدر رنج و تاسف ہوتا ہے؟ مگر چونکہ طبیعت نہایت شوخ واقع ہوئی تھی۔ جب کوئی گرم فقرہ سوجھ جاتا تھا پھر اُن سے بغیر کہے نہیں رہا

جاتا تھا، خواہ اس میں انکو کوئی کافر سمجھے یا رند مشرب کہے، یا بدمذہب جانے۔

لطیفہ غدر کے بعد۔ جبکہ پنشن بند تھی اور دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہ ہوئی تھی۔ پنڈت موتی لال میر منشی لفٹننٹی پنجاب مرزا صاحب سے ملنے کو آئے کچھ پنشن کا ذکر چلا۔ مرزا صاحب نے کہا "تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر، اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار، پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا؟

اگرچہ میرزا کا اصل مذہب صلح کُل تھا مگر زیادہ تر انکا میلان طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیرؑ کو وہ رسول خدا کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے۔

ایک بار مرحوم بہادر شاہ نے دربار میں یہ کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب شیعی المذہب ہیں۔ مرزا کو بھی اطلاع ہو گئی۔ چند رباعیاں لکھکر حضور کو سنائیں۔ جن میں تشیع اور رفض سے تحاشی کی تھی۔ ان میں سے ایک رباعی جو بہت لطیف ہے مجھکو یاد رہ گئی ہے جو یہاں لکھی جاتی ہے

شوخی بیان

رباعی

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری — کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی — شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری؟

دہریت اور تصوف میں جو بُعد ہے وہ ظاہر ہے، دہری خدا کے وجود ہی کا قائل نہیں اور صوفی صرف خدا ہی کو موجود جانتا ہے اور ماسوا کو ہیچ سمجھتا ہے۔ پس صوفی دہری کیونکر ہو سکتا ہے؛ چوتھے مصرع کا یہ مطلب ہے کہ ماوراء النہری یعنی ترکستان کے لوگ متعصب سُنّی ہونے میں ضرب المثل ہیں، یہاں تک کہ شیعہ انکو ناصبی اور خارجی سمجھتے ہیں۔ چونکہ مرزا کی اصل ماوراء النہری

سے تھی اسلئے کہتے ہیں کہ ایک ماورالنہری رافضی یا شیعی کیونکر ہو سکتا ہے؟

جو لوگ مرزا کی طرز مزاج اور طرز کلام سے نا آشنا ہیں وہ شاید یہ سمجھیں کہ مرزا نے بادشاہ کے حضور میں اپنا رسوخ قائم رکھنے کے لئے اپنا مذہب غلط بیان کیا، لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سب رباعیاں صرف بادشاہ کو خوش کرنے اور اہل دربار کے ہنسانے کے لئے لکھی گئی تھیں، کیونکہ دربار میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی یا کم سے کم تفضیلی نہ جانتا ہو۔ مرزا اکثر مواقع پر بادشاہ کے خوش کرنے کو اس قسم کے اشعار دربار میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک روز سلطان نظام الدین قدس سرہٗ اور امیر خسرو کی خصوصیت کا ذکر دربار میں ہو رہا تھا۔ مرزا نے اسی وقت یہ شعر انشا کر کے پڑھا۔

نظام الدین کو خسرو سراج الدین کو غالبؔ ہے — ملے دو مرشد و ںکو قدرت حق سے ہیں دو طالب

لطیفہ رمضان کا مہینا تھا، ایک سُنی مولوی مرزا سے ملنے کو آئے۔ عصر کا وقت تھا۔ مرزا نے خدمتگار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے تعجب سے کہا کیا جناب کا روزہ نہیں ہے؟ مرزا نے کہا سُنی مسلمان ہوں چار گھڑی دن رہے روزہ کھول لیتا ہوں۔

بہادر شاہ کا شیعہ مشہور ہونا ایک دفعہ بہادر شاہ بہت سخت بیمار ہوئے۔ اُس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ جو اکبر شاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں میہمان تھے۔ انکا مذہب اثنا عشری تھا۔ جب بادشاہ کو کسی طرح آرام نہ ہوا مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاک شفا دی گئی اور اسکے بعد بادشاہ کو صحت ہو گئی۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہو جائیگی تو حضرت عباسؑ کی درگاہ میں جو کہ لکھنؤ میں ہے علم چڑھاؤنگا

چنانچہ اُنھوں نے لکھنؤ جاکر بادشاہ کو عرضداشت بھیجی کہ میرا مقدور نذر ادا کرنے کا نہیں ہے حضور مدد فرمائیں۔ یہاں سے بادشاہ نے کچھ روپیہ مرزا حیدر شکوہ کو بھجوایا اور اُنھوں نے بڑی دھوم دھام سے علم چڑھایا جس میں اودھ کا تمام شاہی خاندان اور امراء و علما سب شریک تھے اور مجتہد العصر کے ہاتھ سے علم چڑھوایا گیا

اس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہوگئی کہ بادشاہ شیعہ ہوگئے۔ اس شہرت کا بادشاہ کو بہت رنج ہوا، اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اسکے تدارک کے لیے کچھ رسالے شایع کرائے۔ اور بہت سے اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گئے، اور بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی۔ جسکا نام غالباً "دمغ الباطل" رکھا گیا تھا، اور جسمیں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا۔ اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی بلکہ جو مضامین حکیم احسن خاں نے بتائے تھے اُن کو فارسی میں نظم کردیا تھا۔

جب یہ مثنوی لکھنؤ پہنچی تو مجتہد العصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اس مثنوی میں ایسا اور ایسا لکھا ہے؟ مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں ملازم شاہی ہوں، جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اُسکی تعمیل کرتا ہوں۔ اس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں،

سلامتیِ طبع | مرزا کی طبیعت نہایت سلیم واقع ہوئی تھی۔ باوجودیکہ تیزیِ ذہن اور سلامتیِ طبع دونوں ایک جگہ بہت کم جمع ہوتی ہیں، مرزا میں یہ

دونوں باتیں بوجہ اتم موجود تھیں۔ اسی سلامتی طبع کا اقتضا تھا کہ ابتدائے مشق سخن میں جو ٹیڑھا راستہ اُنھوں نے اختیار کیا تھا۔ بغیر اسکے کہ کوئی استاد رہبری کرے۔ جس قدر عقل و تمیز بڑھتی گئی اسی قدر آہستہ آہستہ اس سے انحراف ہوتا گیا، اور آخرکار اساتذۂ مسلم الثبوت کی روش مستقیم پر آرہے۔

مرزا ازراہِ عجز و انکسار کہا کرتے تھے کہ قصائد کی تشبیب میں تو میں بھی جہاں عرفی و انوری پہنچتے ہیں اُفتاں و خیزاں پہنچ جاتا ہوں، مگر مدح و ستایش میں مجھ سے انکا ساتھ نہیں دیا جاتا کا یہ کہنا بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ جو زور انکی تشبیبوں میں پایا جاتا ہے وہ مدح میں اگر باقی نہیں رہتا۔ مگر ہم اسکو انکے نقص شاعری پر محمول نہیں کرتے، بلکہ غایت درجے کی سلامتی ذہن و استقامتِ طبع جانتے ہیں۔ جھوٹی اور بے اصل باتوں کو چمکانا، اور زمین و آسمان کے قلابے ملانا، اور مبالغہ و اغراق کا طوفان اُٹھانا فی الحقیقۃ شاعر کا کمال نہیں ہے، بلکہ جس قدر اُسکی طبیعت ان باتوں سے ابا کرتی ہے اسی قدر جاننا چاہئے کہ وہ شاعری سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مرزا کی ساری عمر قصیدہ گوئی اور مدح سرائی میں گزری، کیونکہ ضرورت انسان سے سب کچھ کراتی ہے مگر فی الحقیقۃ جیسا کہ ہم آگے بیان کرینگے۔ انکو خوشامد کرنے کا طریقہ جیسا کہ چاہئے ویسا نہیں آتا تھا۔

مسئلہ امتناع نظیر خاتم النبیین

اس مقام پر ہم ایک واقعہ لکھتے ہیں۔ جس سے مرزا کی سلامتیِ طبع کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔ مولانا فضل حق مرحوم مرزا کے بڑے گاڑھے دوست تھے اور انکو فارسی زبان کا نہایت مقتدر شاعر مانتے تھے۔ چونکہ مولانا کو وہابیوں سے سخت مخالفت تھی، اُنھوں نے مرزا پر نہایت اصرار کے ساتھ یہ فرمایش

کی کہ فارسی میں وہابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھدو جس میں اُنکے بڑے بڑے اور مشہور عقیدوں کی تردید اور خاصکر امتناعِ نظیرِ خاتم النبیین کے مسئلے کو زیادہ شرح وبسط کے ساتھ بیان کرو۔ اس مسئلے میں مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی یہ راے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر نہیں ہے۔ یعنی آنحضرت کا مثل اسلیے پیدا نہیں ہوسکتا کہ اُسکا پیدا ہونا آپ کی خاتمیت کے منافی ہے، اسلیے کہ خدا اسکے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے برخلاف اسکے مولانا فضل حق کی یہ راے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممتنع بالذات ہے۔ اور جس طرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کرسکتا اسی طرح خاتم النبیین کا مثل بھی پیدا نہیں کرسکتا۔

مرزا صاحب پر یہ فرمایش ہوئی کہ اس مسئلے پر جو راے مولانا فضل حق کی ہے وہ فارسی نظم میں بیان کیجائے۔ مرزا نے اوّل عذر کیا کہ مسائلِ علمی کا نظم میں بیان کرنا مشکل ہے مگر اُنھوں نے نہ مانا۔ لاچار مرزا نے ایک مثنوی۔ جو کہ ان کے کلیات میں مثنویات کے سلسلے میں چھٹی مثنوی ہے لکھکر مولانا کو سنائی۔ اُنھوں نے بے انتہا تعریف کی اور یہ کہا کہ اگر میں فارسی شعر میں تمھارے برابر مشاق ہوتا تو بھی ایسی خوبی سے ان مطالب کو نہ ادا کرسکتا۔ مگر جو کچھ مرزا مسئلہ نظیر خاتم النبیین کے باب میں کسی قدر مولانا کی راے کے خلاف لکھا تھا۔ اس پر مولانا سخت ناراض ہوسے۔ مرزا نے صاف صاف یہ تو نہیں لکھا تھا کہ خدا خاتم النبیین کا مثل پیدا کرنے پر قادر ہے۔ مگر اس مضمون کو اس پیرایے میں ظاہر کیا تھا کہ اس موجودہ عالم میں تو ایک خاتم کے سوا دوسرا خاتم پیدا نہیں ہوسکتا لیکن خدا قادر ہے کہ ایک ایسا ہی عالم پیدا کردے اُس میں خاتم النبیین کا مثل جو اس دوسرے عالم کا خاتم النبیین ہو خلق فرمائے۔ چنانچہ اُنھوں نے

اس مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے۔

یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است　　قدرتِ حق را نہ یک عالم بس است
خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے　　ہم بود ہر عالمے را خاتمے
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود　　رحمتہ للعالمینے ہم بود
کثرتِ ابداعِ عالم خوب تر؟　　یا بیک عالم دو خاتم خوب تر؟
در یکے عالم دو خاتم تا مجوے　　صد ہزاراں عالم و خاتم بگوے

جب مرزا اول بار مثنوی لکھکر مولانا کے پاس لائے تو مضمونِ مذکور اس اخیر شعر پر ختم کرکے لائے تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ تم نے کیا بکا ہے کہ متعدد عالموں میں متعدد خاتم ہو سکتے ہیں؟ نہیں۔ بلکہ اگر لاکھ عالم خدا پیدا کرے تو بھی خاتم النبیین ایک ہی ہوگا۔ پس اس مضمون کو مثنوی میں سے بالکل نکال ڈالو اور جس طرح میں کہتا ہوں اس طرح بیان کرو۔ مرزا کو نہ وہابیوں سے کچھ خصومت تھی اور نہ انکے مخالفوں سے کچھ تعلق تھا، بلکہ صرف دوست کی رضا جوئی مقصود تھی انھوں نے مولانا کے حکم کی فوراً تعمیل کی جو کچھ پہلے لکھ چکے تھے اسکو تو اسی طرح رہنے دیا مگر اسکے آگے چند اشعار اور اضافہ کرکے کلام کو اس طرح مربوط کر دیا

غالب این اندیشہ نپذیرم ہمے　　خردہ۔ ہم برخویش می گیرم ہمے
اے کہ ختم المرسلینش خواندہ　　دانم از روئے یقینش خواندہ
ایں الف لامے کہ استغراق راست　　حکم ناطق معنی اطلاق راست
منشاء ایجاد ہر عالم یکے ست　　گر دو صد عالم بود خاتم یکے ست

اسکے بعد اسی مضمون کو اور زیادہ پھیلایا ہے اور پھر مثنوی کو ان دو شعروں پر جنمیں نظیر خاتم النبیین کے ممتنع بالذات ہونے کی تصریح ہے ختم کر دیا ہے۔

منفرد اندر کمالِ ذاتی است | لاجرم مثلش محالِ ذاتی است
زین عقیدت بر نگردم والسلام | نامہ را درمی نوردم والسلام

اوپر کے بیان سے ناظرین کو معلوم ہوا ہوگا کہ مرزا کی طبیعت میں کس قدر سلامت روی تھی؛ اور اعوجاج سے کس قدر انکا ذہن اُبا کرتا تھا؛ باوجودیکہ مولانا فضل حق نے اس مسئلے کے متعلق جو کچھ انکی رائے تھی مرزا کے خوب ذہن نشین کردی تھی اور مرزا اسی کو اپنی مثنوی میں بیان کرنا چاہتے تھے مگر جس طرح ایک ٹیڑھی چیز نلکی میں آکر سیدھی ہو جاتی ہے اسی طرح مرزا کی راست بیانی نے اُس ٹیڑھی رائے کے تمام بل نکال ڈالے اور بغیر اسکے کہ مرزا کو وہابیوں کی جماعت منظور ہو جو ٹھیک بات تھی وہ اُنکے قلم سے بے اختیار ٹپک پڑی۔ پھر اُسکے بعد جو کچھ لکھا ہے وہ مولانا کے جبر سے لکھا ہے اُسکو مرزا کے اصلی خیالات سے کچھ تعلق نہیں۔

دادِ سخن ہماری سوسائٹی میں جو ایک عام دستور ہے کہ جو شخص اپنا کلام سناتا ہے اسکے ہر ایک شعر پر خواہ اچھا ہو خواہ بُرا۔ برابر تحسین و آفریں کیجاتی ہے اور اچھے بُرے شعر میں کچھ تمیز نہیں کیجاتی، مرزا کی عادت بالکل اسکے برخلاف تھی کوئی کیسا ہی معزز و محترم آدمی ہو جب تک اُسکا کوئی شعر فی الواقع مرزا کو پسند نہ آتا تھا وہ ہرگز اُسکی تعریف نہ کرتے تھے، اخیر عمر میں تو اُنکا ثقل سماعت انتہا کو پہنچ گیا تھا، مگر پہلے ایسا حال نہ تھا۔ وہ کسی قدر اونچی آواز سے بات چیت اور شعر و سخن سُن لیتے تھے، مگر جب تک کوئی شعر انکے دل میں نہ چُبھتا تھا اُس سے مس نہ ہوتے تھے۔ اُنکے بعض معاصرین اس بات سے آزردہ رہتے تھے، اور اسی لئے اُنکی شاعری پر نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ مگر مرزا باوجودیکہ انکی طبیعت نہایت صلح جو واقع ہوئی تھی۔ شعر کی داد دینے کا جو طریقہ اُنھوں نے اختیار کیا تھا اسکو وہ کبھی ہات سے نہ دیتے تھے۔ لیکن جو شعر اُنکے دل میں چبھ جاتا تھا اُسکی تعریف

بھی ایسی کرتے تھے جو مبالغے کی حد کو پہنچ جاتی تھی۔ وہ درحقیقت کسی کے خوش کرنے کے لیے ایسا نہیں کرتے تھے بلکہ ذوق سخن انکو بے اختیار کردیتا تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق جنکی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو اُن سے چشمک تھی۔ ایک روز جبکہ مرزا شطرنج میں معروف تھے منشی غلام علی خاں مرحوم نے انکا یہ شعر کسی دوسرے شخص کے سُنانے کو پڑھا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

خاں مرحوم کہتے تھے کہ مرزا کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑگئی فوراً شطرنج چھوڑدی اور مجھ سے کہا بھیا تم نے کیا پڑھا؟ میں نے پھر وہ شعر پڑھا۔ پوچھا کس کا شعر ہے میں نے کہا ذوق کا۔ یہ سنکر نہایت متعجب ہوے، اور مجھ سے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے اُردو خطوں میں اس شعر کا جابجا ذکر کیا ہے۔ جہاں عمدہ شعر کی مثالیں دی ہیں وہاں اس شعر کو ضرور لکھا ہے اسی طرح مومن خاں کا جب یہ شعر سُنا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اسکی بہت تعریف کی اور یہ کہا کاش مومن خاں میرا سارا دیواں لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھکو دیدیتا، اس شعر کو بھی انھوں نے اپنے متعدد خطوں میں نقل کیا ہے۔ اسی طرح سودا کا یہ شعر بھی ایک مقام پر لکھا ہے۔

دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار　　لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنس گراں کا

ایک صحبت میں نواب مرزا خاں داغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اس پر وجد کرتے تھے۔

رُخ روشن کے آگے شمع رکھکر وہ یہ کہتے ہیں　　اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

بعض اوقات وہ اپنے شاگردوں کے کلام سے اسقدر متاثر ہوتے تھے

کہ اُنکی تعریف میں شاید اُنکا دل بڑھانے کو حد سے زیادہ مبالغہ کرتے تھے۔ اُنھوں نے اخیر عمر میں اپنے ایک شاگرد کی غزل دیکھکر اُسکی بے انتہا تعریف کی، اور یہ کہا کہ "اگر اب میں رشک کرنے کے قابل ہوتا تو تم محسود ہوتے اور میں حاسد"

تقریظ لکھنے کا ڈھنگ

مرزا پر تقریظوں کی بے انتہا فرمائشیں ہوتی تھیں اور جیساکہ ظاہر ہے تعریف کی مستحق فی الحقیقۃ بہت ہی کم کتابیں ہوتی ہیں مرزا کی طبیعت چونکہ صلح جو اور مرنج و مرنجاں واقع ہوئی تھی وہ کسی سے انکار تو نہیں کرتے تھے مگر تقریظ نگاری کا اُنھوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات راستی کے خلاف بھی نہ ہو اور صاحب کتاب خوش بھی ہو جائے۔ بہت سا حصہ تمہید میں، یا مصنف کی ذات اور اُسکے اخلاق، یا اُسکی محبت اور دوستی کے بیان میں، یا اور لطیف اور پاکیزہ باتوں کے ذکر میں۔ جو بے محل نہ ہوں۔ ختم ہو جاتا تھا۔ اخیر میں کتاب کی نسبت چند جملے جو اصلیت سے خالی نہ ہوتے تھے اور مصنف کے خوش کرنے کے لئے کافی ہوتے تھے، لکھدیتے تھے۔ اسی وجہ سے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوگ مرزا سے شکایت کرتے تھے کہ آپنے ستائش میں مضائقہ کیا ہے۔

تقریظ دیوان تفتہ

جب مرزا نے منشی ہرگوپال تفتہ کے دیوان کی تقریظ۔ جو کلیات نثر غالب میں موجود ہے۔ لکھکر بھیجی تو اُنھوں نے بھی اسی قسم کی شکایت کی تھی۔ مرزا اسکے جواب میں لکھتے ہیں "کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھکو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کروں۔ میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤگے، اور مدح کے شعر کمتر نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ اُنکی مدح کتنی ہے؟ مرزا

رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کے دیباچے کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ انطباع دیوان حافظ کی، جان جاکوب بہادر کی فرمایش سے لکھی ہے اسکو دیکھو، کہ فقط ایک بیت میں اُنکا نام اور انکی مدح آئی ہے اور باقی نثر میں اور ہی مطالب ہیں واللہ باللہ اگر کسی شاہزادے یا امیرزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی مدح اتنی نہ کرتا کہ جتنی تمھاری مدح کی ہے ہمکو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمھاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمھارے نام کا بدلکر اسکے عوض ایک فقرہ اور لکھدیا ہے۔ اس سے زیادہ بھیئی میری روش نہیں۔ ظاہرا تم خود فکر نہیں کرتے، اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیشتر اس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے۔ کس واسطے کہ اُن کے کان اس آواز سے آشنا نہیں جو لوگ کہ قتیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے"

تقریظ تصیح آئین اکبری

سر سید احمد خاں نے جب نہایت جانفشانی اور عرق ریزی سے آئین اکبری کی تصیح کی، تو دلی کے مشاہیر نے اس پر نثر میں تقریظیں لکھی تھیں، اور مرزا نے نظم میں ایک مثنوی لکھی تھی جو انکے کلیات میں موجود ہے۔ باوجودیکہ مرزا کو سر سید کی خاطر بہت عزیز تھی، اور وہ اُن سے اور اُن کے خاندان سے مثل یگانوں[1] کے ملتے تھے، مگر چونکہ مرزا، ابوالفضل کی طرز تحریر کو پسند نہیں کرتے تھے اور جو آئین اس کتاب میں لکھے ہیں انکو اس زمانے کے آئینوں کے مقابلے میں ہیچ و پوچ سمجھتے تھے، اور تاریخ کا مذاق جیسا کہ خود انھوں نے اعتراف کیا ہے بالکل نہ رکھتے تھے۔ اسلیے آئین اکبری

---

[1] مرزا آثار الصنادید کی تقریظ میں سر سید کی نسبت لکھتے ہیں "باہمگنان نش ولیست از فرزانگی باین مردمی دانا، و بانش پیمان مہر بست از دلنشینی بہ پیوند خون مانا"

کی تصحیح کو اُنھوں نے ایک فضول کام سمجھا۔ گو انکی یہ راے غلط ہو یا صحیح۔ مگر جو کچھ آئین اکبری اور اُسکی تصحیح کی نسبت اُنکا خیال تھا اسکو تقریظ میں ظاہر کیے بغیر نہیں رہے۔ چنانچہ اُس مثنوی کے اوّل کے چند شعر ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

مژدہ یاراں را کہ ایں دیریں کتاب ۔ یافت از اقبالِ سیّد فتح باب
دیدہ بینا آمد و بازو قوی ۔ کہنگی پوشید تشریفِ نوی
ویں کہ در تصحیح آئیں راے اوست ۔ ننگ و عارِ ہمت والاے اوست
دل بہ شغلے بست و خود را شاد کرد ۔ خود مبارک[۱] بندہ آزاد کرد
گوہرش را آنکہ نتواند ستود ۔ ہم بدیں کارش ہمی داند ستود
بہر چنیں کارے کہ اصلش ایں بود ۔ آں ستاید کش ریا آئیں بود
من کہ آئینِ ریا را دشمنم ۔ در وفا اندازہ دانِ خود ہمم
گر بدیں کارش نگویم آفریں ۔ جاے آں دارد کہ جویم آفریں

اسکے بعد انگریزوں کے آئین و قانون و ایجادات کسی قدر بیان کیے ہیں اور لکھا ہے کہ ان چیزوں کے سامنے پچھلے آئین سب تقویم پارینہ ہوگئے ہیں۔ اسکے بعد لکھتے ہیں:۔

طرزِ تحریرش اگر گوئی خوش ست ۔ نے فزوں از ہر چہ می جوئی خوش ست
ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است ۔ گر بسے ہست افسرے ہم بودہ است
مبدأ فیاض را مشمر بخیل ۔ نوز[۲] می ریزد رطب ہا زاں نخیل
مردہ پروردن مبارک کار نیست ۔ خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

۱؎ مبارک بندہ آزاد کردن عبث کام کرنے کو کہتے ہیں۔ اسمیں لطف یہ ہے کہ ابو الفضل کے باپ کا نام مبارک تھا۔

۲؎ یہ اپنی نثاری اور انشاپردازی کی طرف اشارہ ہے۔

غالب آئین خموشی دلکش ست | گرچہ خوش گفتی نہ گفتن ہم خوش ست
درجہاں سید پرستی دین تست | از ثنا بگذر دعا آئین تست
ایں سراپا فرّہ و فرہنگ را | سید احمد خانِ عارف جنگ را
ہرچہ خواہد از خدا موجود باد | پیشکارش طالع مسعود باد

چونکہ اس تقریظ میں آئینِ اکبری کی تنقیص کی گئی تھی اور سرسید نے جو ایک نہایت مفید کام کیا تھا اُسکی کچھ داد نہیں دی گئی تھی بلکہ اُسکو غیر مفید ظاہر کیا گیا تھا اسلئے اُنھوں نے آئینِ اکبری کے آخر میں مرزا کی تقریظ کو نہیں چھپوایا۔

محققانہ نظر مرزا کی ذکاوت اور عالی فطرتی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ باوجودیکہ ایسی سوسائٹی میں گھرے ہوئے تھے جس میں سلطنت کی تقلید سے ایک قدم تجاوز کرنا ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ اپنے فن میں محققانہ چال چلتے تھے اندھا دھند اگلوں کی تقلید ہرگز نہ کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ جامع برہان قاطع کی شہرت اور ناموری انکو اسکا تخطیہ کرنے سے مانع نہیں ہوئی۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "یزداں دل دانا و چشم بینا بہرآں دادہ است کہ کار دانش و بینش ازیں ہر دو گوہر پے فرگیرم، و ہرچہ بنگریم جز بدستوری دانش آں را نہ پذیریم استادی و شاگردی پیری و مریدی نیست کہ انتہا اعتقاد بس باشد و بدیں کلمہ مشہور کہ پیرِ من خس است و اعتقادِ من بس ست از باز پرس ایمنی روے دہد" حالانکہ وہ ایران کے نامور شعرا کا نہایت ادب کرتے تھے اور اُنکا ذکر ہمیشہ تعظیم اور احترام کے ساتھ کرتے تھے، پھر بھی اندھوں کی طرح انکی تقلید کرتے تھے۔ جو امور سماع اور نقل سے علاقہ رکھتے تھے اُن میں اُن کے کلام کو بیچوں وچرا تسلیم کرتے

تھے اگرچہ جو باتیں عقل اور درایت سے تعلق رکھتی ہیں ان میں انکی تقلید کو جائز نہ سمجھتے تھے - ایک خط میں حزیں کا - جسکو وہ بہت بڑا اُستاد جانتے تھے یہ مطلع نقل کرتے ہیں "ز ترکتازیِ آں نازنین سوار ہنوز * ز سبزہ می دمد انگشتِ زینہار ہنوز۔" پھر لکھتے ہیں کہ اس مطلع میں ایک ہنوز، زائد اور بیہودہ ہے، تتبع کے واسطے سند نہیں ہوسکتا، یہ غلط محض ہے - یہ سُقم ہے، یہ عیب ہے، اسکی کون پیروی کریگا - حزیں تو آدمی تھا یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہو تو اسکو سند نہ جانو، اور اس کی پیروی نہ کرو - ایک خط میں منشی ہرگوپال کو لکھتے ہیں "یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ حق ہے، کیا اُسوقت آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے؟

حق پسندی مرزا کے کلام پر اگر کوئی ٹھیک اعتراض کرتا تھا، یا کوئی عمدہ تصرف انکے شعر میں کرتا تھا اُسکو فوراً تسلیم کر لیتے تھے اور شعر کو بدل ڈالتے تھے - مثنوی درد و داغ میں اُنکا ایک مصرعہ تھا "خوک شد و پنجہ زدن ساز کرد" جب مرزا نے یہ مثنوی تحفۂ ناطق مکرانی کو بھیجی تو اُس نے مرزا کو لکھا "خوک سُم دارد نہ پنجہ، اگر نزدیک اساتذہ اطلاق سُم و پنجہ بیک محل روا باشد اعلام باید فرمود" مرزا نے اسکے جواب میں صاف لکھ بھیجا کہ "اگر کلیاتِ فارسی کے چھپنے سے پہلے آپ کا خط پہنچ جاتا تو میں اس لفظ کو بدل ڈالتا، اور اس مصرعے کو یوں بنا دیتا "خوک شد و بدنفسی ساز کرد" چنانچہ جب مرزا کا کلام دوسری بار چھپا تو اُنھوں نے یہ مصرع اِسی طرح بنا دیا۔

مرزا کے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب کا یہ شعر ہے

ہمچناں در تتق غیب ثبوتے دارند بوجودے کہ ندارند ز خارج اعیاں

مرزا صاحب خود مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے ثبوتے کی جگہ نمودے لکھا تھا مولوی فضل حق کو جب یہ شعر سُنایا تو اُنھوں نے کہا کہ اعیانِ ثابتہ کے لئے

نمود کا لفظ نامناسب ہے اسکی جگہ ثبوت بنادو چنانچہ طبع ثانی میں انھوں نے بجائے نمود کے ثبوت بنادیا ہے۔ اسی طرح ایک قصیدے کے مطلع کا پہلا مصرع یہ ہے "عیدِ اضحےٰ بسر آغازِ زمستان آمد" مرزا نے اول عیدِ قرباں لکھا تھا پھر نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے کہنے سے عید اضحےٰ بنادیا گیا۔ حالانکہ نواب موصوف خود مرزا سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور مومن خاں مرحوم کے بعد ہمیشہ انھیں کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔

ان باتوں کے بیان کرنے سے مرزا کی لغزشیں خلقت کو دکھانی مقصود نہیں بلکہ انصاف اور حق پسندی کی شریف خصلت اور وہ ملکہ جسکے بغیر انسان کبھی ترقی نہیں کرسکتا، مرزا کی ذات میں دکھانا مقصود ہے۔ جن لوگوں میں اپنی غلطی تسلیم کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی انکا اپنے فن میں ترقی کرنا ناممکن ہے۔

راست گفتاری حالانکہ ایشائی شاعری جسکی بنیاد جھوٹ اور مبالغے پر رکھی گئی ہے مرزا کی رگ و پے میں سرایت کرگئی تھی باوجود اسکے وہ روایت اور حکایت اور وعدہ و اقرار اور بات چیت میں نہایت راست گفتار اور صادق اللہجہ تھے۔ اسی لیے جو شخص انکے وعدے یا اقرار کا یقین نہ کرتا تھا اُس سے نہایت ناراض ہوتے تھے۔ تفضل حسین خاں مرحوم خلف دیوان فضل اللہ خاں سے مرزا نے اپنا دیوان مانگا ہے اور اقرار کیا ہے کہ میں اُسکو دیکھکر واپس بھیجدونگا اُنھوں نے دیوان کے دینے سے انکار کیا ہے اُنکے انکار کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں "کیوں صاحب! یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و اُستادی سب پر پانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے؟ میرا کلام! خرید آٹھ دس روپے کی! سو وہ بھی میں یہ نہیں کہتا مجھکو دیڈالو، تم کو مبارک رہے مجھکو مستعار دو، میں اسکو دیکھ لوں، جو میرے

پاس نہیں ہے اسکی نقل کرلوں، پھر تم کو واپس بھیجدوں، اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل اسکی ہے کہ مجھکو جھوٹا جانتے ہو، میرا اعتبار نہیں، یا یہ کہ مجھکو آزار دینا اور ستانا بدل منظور ہے۔ وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دیدو۔ واللہ باللہ میں اُس میں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کرکے بھیجدونگا؛ اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھپر لعنت؛ اور اگر تم میری قسم کو نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ کو دو تو تم کو آفریں۔"

اسی طرح ایک خط میں نواب علاؤ الدین خاں کو لکھتے ہیں۔

بدست مرگ، وے بدتر از گمان تو نیست

مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا، مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کونسی رباعیات مانگتے ہو، پھر لکھتے ہو رباعیاں بھیج، قصیدہ بھیج، معنی اسکے یہ کہ تو جھوٹا ہے، اچھے تو مقرر بھیجیگا۔ بھائی قرآن کی قسم، انجیل کی قسم توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم، پاژند کی قسم اُستاد کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔ کلیات کے باب میں جو عرض کرچکا ہوں ؎

برہمانیم کہ ہستیم و ہماں خواہد بود

مرزا کی اسی راستبازی کا سبب تھا کہ وہ کوئی کام چھپا کر نہیں کرتے تھے جو دل میں تھا وہی زبان پر تھا۔ جو خلوت میں کرتے تھے وہی جلوت میں کرتے تھے۔ پس اگر ان میں کوئی عیب تھا تو وہی تھا جسکو ہر کس و ناکس جانتا تھا، مخفی عیبوں سے وہ بالکل پاک تھے۔

ناقدردانی کی شکایت

وہ اس خیال سے کہ اُنکے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے اکثر تنگدل رہتے تھے چنانچہ اس بات کی اُنھوں نے فارسی اور اُردو نظم میں جابجا شکایت کی ہے۔ ایک روز گلے سے سیدھے

نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر آئے، اور کہنے لگے کہ آج حضور نے ہماری بڑی قدر دانی فرمائی عید کی مبارکباد میں قصیدہ لکھکر لے گیا تھا، جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ "مرزا تم پڑھتے بہت خوب ہو" اسکے بعد نواب صاحب اور مرزا زمانے کی ناقدر دانی پر دیر تک افسوس کرتے رہے۔ مہر نیمروز میں اس مضمون کو کہ میں نے اپنا کمال شاعری محض ناقدر دانوں کی مدح سرائی میں صرف کیا وہ ایک جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں "سینۂ من نفسی داشت بہ روان آسانی نیے کہ از نستر ن زار و زد زیاں زدہ من۔ کہ دم جز بہ نا بایست نہ زدم بہنان مرا قلمی بود بہ دجلہ باری ابرے کہ از قبلہ خیزد، بیہدہ کوش۔ من کہ باران بشورہ زار فرو ریختم" یہی وجہ تھی کہ جب حسن اتفاق سے انکو کوئی سخن سنج اور سخن فہم میسر آجاتا تھا تو اسکو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔

سخن فہموں کی قدر منشی حقیر کی تعریف

منشی نبی بخش حقیر تخلص جو ایک زمانے میں کول میں سر رشتہ دار تھے، اور جنکی سخن فہمی اور سخن سنجی کی بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سُنی گئی ہے۔ کہیں وہ دلی میں آئے ہیں اور مرزا کے مکان پر ٹھہرے ہیں اُنکی نسبت منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں جسکا ماحصل یہ ہے کہ خدا نے میری بیکسی اور تنہائی پر رحم کیا، اور ایک ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم، اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا، اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اُس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی جسکی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی۔ دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانۂ یگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجے کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت

ہوئی ہے؛ حالانکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں، مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے؟ اور سخن فہم کسکو کہتے ہیں؟ مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کیئے، آدھا یوسفؑ کو دیا اور آدھا تمام بنی نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن اور ذوق معنی کے بھی دو حصے کیے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو۔ گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو۔ میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بیفکر ہوں، اور اس نعمت پر دنیا سے قانع۔

اپنے عجز کا اقرار مرزا پر جب شعر کے متعلق کوئی ایسی فرمایش کیجاتی تھی جو اُن سے باسانی سرانجام نہ ہوسکتی تھی تو وہ اس بات کا کچھ خیال نہ کرتے تھے کہ میری شاعری کی شہرت و ناموری پر حرف آئیگا، بلکہ صاف لکھ بھیجتے تھے کہ میری طاقت سے باہر ہے۔ ایک بار غالباً مجتہد العصر سید محمد صاحب مرحوم و مغفور نے مرزا سے اس بات کی خواہش کی کہ اُردو میں جناب سید الشہداء کا مرثیہ لکھیں۔ چونکہ مرزا اُنکی بہت تعظیم کیا کرتے تھے اور اُنکے سوال کو رد کرنا نہیں چاہتے تھے اُنکے حکم کی تعمیل کے لئے مرثیہ لکھنے بیٹھے۔ چونکہ اس کوچے میں کبھی قدم نہ رکھا تھا، اور فرمایش ایسی چیز کی ہوئی تھی جسکو اور لوگ حد کمال تک پہنچا چکے تھے، اور قویٰ میں انحطاط شروع ہوگیا تھا، مشکل سے مسدس کے تین بند لکھے جن میں سے پہلا بند ہمکو یاد ہے اور یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

ہاں اے نفس بادِ سحر شعلہ فشاں ہو　　اے دجلۂ خوں چشم ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم لب عیسیٰ پہ فغاں ہو　　اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو

بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

ایک یہ اور دو بند اور لکھکر مجتہد العصر کی خدمت میں بھیجدیئے، اور صاف لکھ بھیجا کہ یہ تین بند صرف امتثال امر کے لئے لکھے ہیں، ورنہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں یہ اُن لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس وادی میں عمریں بسر کی ہیں، مجھکو انکے درجے تک پہنچنے کے لئے ایک دوسری عمر درکار ہے پس مجھے اس خدمت سے معذور و معاف رکھا جائے" انکا قول تھا کہ ہندوستان میں انیس اور دبیر جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے نہ آیندہ ہوگا۔

لطیفہ | بعض اوقات ایسی فرمایشوں سے جنکے سرانجام کرنے میں انکو دقت اٹھانی پڑتی تھی بڑے لطف کے ساتھ پہلو بچاتے تھے۔ یہ بات معلوم ہے کہ مادہ تاریخ نکالنے سے وہ ہمیشہ گھبراتے تھے۔ ایکبار نواب علاءالدین خاں مرحوم نے اپنے لڑکے کی وفات کی تاریخ اور اسکے تاریخی نام کی فرمایش کی اُسکے جواب میں لکھتے ہیں شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، اور طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہوگئے، حسن طبع خداداد رکھتے ہو، ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو؟ کہ مجھ پیر غمزدہ دل مردہ کو تکلیف دو۔ علاءالدین خاں تیری جان کی قسم!! میں نے پہلے لڑکے کا جو اسم تاریخی نظم کر دیا تھا، اور وہ لڑکا نہ جیا، مجھکو اس وہم نے گھیرا ہے کہ وہ میرے نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیرالدین حیدر اور امجد علیشاہ ایک ایک قصیدے میں چلدیئے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے۔ جسکی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نا صاحب دہائی خدا کی! میں نہ تاریخ ولادت کہونگا نہ نام تاریخی ڈھونڈونگا۔

ہجو نہ لکھنا | باوجودیکہ مرزا کی تمام عمر قصیدہ گوئی اور مدح سرائی میں گزری،

اور اکثر ایسا اتفاق ہوا کہ مدح و ستائش کا صلہ انکو کچھ نہیں ملا، اور جو محنت وکاوش انکو قصیدوں کی ترتیب میں کرنی پڑی وہ سب رائگاں گئی، مگر اُنھوں نے کسی کی ہجو میں کوئی قطعہ یا قصیدہ کبھی نہیں لکھا - صرف ایک قطعہ جو مرزا کے مطبوعہ کلیات میں درج نہیں ہے، ہم کو اُنکے قلمی مسودات میں دستیاب ہوا ہے - جو میرے دوست اور مرزا کے عزیز شاگرد بہاری لال مشتاق دہلوی نے اس کتاب کے لکھتے وقت میرے پاس بھیجے ہیں - اس قطعے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے ایک امیر کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ مع عرضداشت کے ارسال کیا ہے، اور اُسکا جواب مدت دراز تک مرزا کو نہیں ملا - تب مرزا نے لبطور تقاضے کے یہ قطعہ بھیجا ہے - جسکو مشکل سے ہجو ملیح کہا جا سکتا ہے - چونکہ اس قطعے کا مضمون لطف سے خالی نہیں، اسلئے ہم اول اسکا خلاصہ اُردو زبان میں لکھتے ہیں، اسکے بعد قطعہ بجنسہ نقل کیا جائیگا -

قطعے کا ماحصل یہ ہے کہ میں نے عقل سے پوچھا کہ میں نے ایسا اور ایسا قصیدہ نواب کی خدمت میں بھیجا تھا، اور اُسکے ساتھ عرضداشت بھی گزرانی تھی، پھر کیا سبب ہے کہ جواب عنایت نہیں ہوا؟ اگر یہ بات ہے تو میں نے ناحق تعریف لکھی - خدا جانے میں نے کیا لکھدیا ہوگا - جسپر نواب کو آزردگی ہوئی - عقل نے کہا تو کیوں گھبراتا ہے؟ نواب جس ساز و سامان کے ساتھ صلہ بھیجنا چاہتا ہے وہ جلدی فراہم نہیں ہو سکتا - اُسنے بہت دن سے حکم دے رکھا ہے کہ دمشق سے دیبا، روم سے مخمل، معدن سے الماس، کان سے سونا، دکن سے ہاتھی، پہاڑ سے زمرد، عراق سے گھوڑا، دریا سے موتی، نیشاپور سے فیروزہ، بدخشاں سے یاقوت، بغداد سے ساندلی، اصفہان سے تلوار، کشمیر سے پشمینہ، ایران سے زربفت، یہ سب چیزیں فراہم کرکے لائیں،

تب غالب کو صلہ بھیجا جائے۔ پس جبکہ یہ ساری ڈھیل اسوجہ سے ہے تو اسکو نواب کی آزردگی کی دلیل نہ سمجھنا چاہیے۔ جب عقل نے مجھ کو یہ دم دیا تو میری تمام یاس وناامیدی اُمید کے ساتھ بدل گئی۔ میں نے بھی اپنے دل میں کہا کہ جب ممدوح میرے لیے یہ کچھ کرنا چاہتا ہے تو میں بھی اسکے لئے آئینہ اور تاج سکندر سے انگشتری اور تخت سلیمان سے جام جمشید، عالم غیب سے آب حیوان، چشمہ خضر سے، عمر ابد، نشاط جاوید، دل کی قوت، ایمان کی مضبوطی اپنے خدا سے، اور اپنی عرضی کا جواب اور قصیدے کا صلہ ممدوح سے کیوں نہ مانگوں۔"

قطعہ

گفتم بہ خرد بخلوتِ اُنس　　کاے شمع و چراغ ہفت ایوان
آیا زچہ رو بود کہ نواب　　ننوشت جوابِ نامہ ام۔ ہاں
آں گونہ عریضۂ کہ دانی　　درویش نوشتہ سوی سلطان
آں گونہ قصیدۂ کہ گوئی　　از صفحہ دمیدہ سنبلستان
ایں ہر دو رسید نیست پیدا　　زاں سو اثرے بہ ہیچ عنوان
رنجید مگر زمدح نواب　　اے کاش نہ گشتمے ثناخوان
ہیہات چہ گفتہ ام کہ باشم　　از گفتۂ خویشتن پشیمان
عقلم بجواب گفت "غالب!　　زنہار مخور فریبِ شیطان
نواب بفکر ارمغان ست　　تا نامہ فرستدت بساماں
وانہا کہ بخاطرش گزشتہ است　　زود آں ہمہ جمع کردنتوان
زود است کہ جمع نیز گردد　　دیر است کہ دادہ است فرمان
تا راہ رواں بحر و بر گرد　　آرند بکوششِ فراوان

دیبا ز دمشق و مخمل از روم — الماس ز معدن و زر از کان
فیل از دکن و زمرد از کوہ — توسن ز عراق و دُر ز عمان
فیروزۂ نغز از نشاپور — یاقوت گزیدہ از بدخشان
جمازۂ تیز رو ز بغداد — شمشیر برندہ از صفاہاں
پشمینۂ قیمتی ز کشمیر — زربفت گراں بہا ز ایراں
بالجملہ درنگ چوں ازیں رست — بر رنج و ملال نیست برہاں
چوں پیر خرد بدلفریبی — گفت ایں ہمہ رازہای پنہاں
گشتم بہ دمِ امید واری — مرہم بہ زخم یاس و حرماں
گفتم کہ چو بامن ایں کرم کرد — آں قبلہ و قبلہ گاہ اعیاں
ناچار ز راہ حق گزاری — تا کردہ شود تلافیِ آں
من نیز طلب کنم برائش — ایں خواہش اگرچہ نیست آساں
آئینہ و تاج از سکندر — انگشتر و تخت از سلیماں
از عالمِ غیب جامِ جمشید! — از چشمۂ خضر آبِ حیواں
عمرِ ابد و نشاطِ جاوید — نیروے دل و ثباتِ ایماں
توفیقِ جواب نامۂ خویش — توقیع عطا و بذل و احساں

خانگی تعلقات

مرزا کی بی بی - جو الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں وہ نہایت متقی پرہیزگار اور نماز روزے کی سخت پابند تھیں - جس قدر مرزا مذہبی معاملات میں بے مبالات تھے اُسی قدر اُنکی بی بی احکام مذہبی کی پابند تھیں - یہاں تک کہ بی بی کے کھانے پینے کے باسن الگ اور شوہر کے الگ رہتے تھے باایںہمہ بی بی شوہر کی خدمتگزاری اور خبرگیری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی تھیں - مرزا صاحب ہمیشہ

مردانے مکان میں رہتے تھے مگر اُنکے کھانے پینے اور دوا ٹھنڈائی اور جراول وغیرہ کا انتظام سب گھر میں ہوتا تھا - مرزا میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی ہمیشہ وقت معین پر ایک بار وہ گھر میں ضرور جاتے تھے - اور بی بی اور انکے تمام رشتے داروں کے ساتھ نہایت عمدہ برتاؤ رکھتے تھے ،اور اپنی جان سے بڑھکر اُنکی ضروریات اور اخراجات کا خیال رہتا تھا - مگر چونکہ شوخی اور ظرافت اُنکی گھٹی میں پڑی تھی انکی زبان وقلم سے بی بی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جنکو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلیمی پر محمول کرسکتا ہے -

لطیفہ | کسی نے امراؤ سنگھ نام ایک شاگرد کی دوسری بی بی کے مرنیکا حال مرزا کو لکھا اور اُس میں یہ بھی لکھا کہ اسکے ننھے ننھے بچے ہیں ،اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے ؟ اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو ؛ مرزا اسکے جواب میں لکھتے ہیں "امراؤ سنگھ کے حال پر اسکے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے - اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو دو بار انکی بیڑیاں کٹ چکی ہیں ،اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے - اسکو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لونگا - تو کیوں بلا میں پھنستا ہے" وہ ہمیشہ تعلقاتِ خانگی کو جداً یا ہزلاً ایک سخت مصیبت بتایا کرتے تھے -

لطیفہ | جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرا سامنے رکھا تھا - طوطا سردی کے سبب پروں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا - مرزا نے دیکھکر کہا "میاں مٹھو! نہ تمھارے جورو نہ بچے ، تم کس فکر میں یوں سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہو ؛

لطیفہ | ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے - ایک مکان آپ خود دیکھکر آئے ، اُسکا دیوان خانہ تو پسند آگیا ، مگر محلسرا خود نہ دیکھ سکے - گھر پر آکر اُسکے

دیکھنے کے لئے بی بی کو بھیجا۔ وہ دیکھکر آئیں تو اُن سے پسند ناپسند کا حال پوچھا۔ اُنھوں نے کہا اس میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں۔ مرزا نے کہا کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھکر کوئی بلا ہے؟ مرزا کا ایک قطعہ اور ایک رباعی مقتضاے مقام کے موافق لکھی جاتی ہے۔

قطعہ

گیر کہ در روز حشر چوں تو بہفتی | بر سرِ دوزخ نہند تیرہ نہیبش
لیک نباشد دراں مضیق مصیبت | در طلبِ ناں و جامہ کشمکش از زن کی بولش
لیک نباشد دراں مقام صعوبت | شورِ تقاضاے ناروا ے مہاجن۔

رباعی

اے آنکہ براہِ کعبہ روے داری | دانم کہ گزیدہ آرزوے داری
زیں گونہ کہ تند می خرامی۔ دانم | در خانہ زنے ستیزہ خوے داری

لطیفہ مرزا اپنی شوخی طبع کے ہات سے مجبور تھے، اور کسی موقع پر خوش طبعی کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش خاں معروف جنکے تقدس اور بزرگی کے سبب اُنکے بڑے بھائی زانوے ادب تہ کر کے اُنکے سامنے بیٹھتے تھے، اور جو مرزا کے خسر ہونے کے سبب اُنکے قبلہ و کعبہ تھے۔ اُنکے آگے بھی مرزا اپنی شوخی سے باز نہ آتے تھے۔ وہ لوگوں کو مرید بھی کیا کرتے تھے، اور جب بہت سے مرید ہو جاتے تھے تو انکو اپنے سلسلے کے تمام مشائخ کا شجرہ لکھوا کر ایک ایک کاپی سب کو تقسیم کیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے مرزا کو شجرہ دیا کہ اسکی نقل کر دو۔ آپ نے شجرے کی نقل اس طرح کی کہ ایک نام لکھدیا دوسرا حذف کر دیا تیسرا پھر لکھدیا چوتھا پھر ساقط۔ غرضکہ اسی طرح بہت سے حذف و اسقاط کر کے نقل اور اصل جا کر انکے حوالے کی۔ وہ دیکھکر بہت خفا ہوئے کہ یہ کیا غضب کیا؟ مرزا نے کہا حضرت!

آپ اسکا کچھ خیال نہ فرمائیے، شجرہ دراصل خدا تک پہونچنے کا ایک زینہ ہے، سو زینے کی ایک ایک سیڑھی اگر بیچ میں سے نکال دی جائے تو چنداں حرج واقع نہیں ہوتا آدمی ذرا اُچک اُچک کے اوپر چڑھ سکتا ہے۔ وہ یہ سن کے بہت جز بز ہوئے، اور وہ نقل پھاڑ ڈالی اور کسی اور شخص سے اُسکی نقل کرائی، اور مرزا ہمیشہ کے لئے اس تکلیف سے چھوٹ گئے۔

موت کی آرزو مرزا یا تو اس وجہ سے کہ اُنکی زندگی فی الواقع مصائب اور سختیوں میں گزری تھی، اور یا اسلیئے کہ اُن پر نا ملائم حالتوں کا بہت زیادہ اثر ہوتا تھا، آخر عمر میں موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے۔ ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے کہ اس سال ضرور مرجاؤنگا۔

لطیفہ ۱۲۷۷ھ میں اُنھوں نے اپنے مرنے کی تاریخ یہ کہی کہ "غالب مُرد" اس سے پہلے کئی مادے غلط ہو چکے تھے۔ منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص جو مرزا صاحب کے مخصوصین میں سے تھے اُن سے مرزا صاحب نے اس مادے کا ذکر کیا۔ اُنھوں نے کہا حضرت! انشاء اللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہوگا۔ مرزا نے کہا "دیکھو صاحب تم ایسی فال منہ سے نہ نکالو، اگر یہ مادہ مطابق نہ نکلا تو میں سر پھوڑ کر مرجاؤنگا"۔

لطیفہ ایک دفعہ شہر میں سخت وبا پڑی۔ میر مہدی حسین مجروح نے دریافت کیا کہ حضرت! وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی تک موجود ہے؟ اس کے جواب میں لکھتے ہیں "بھئی کیسی وبا؟ جب ایک ستر برس کے بڈھے اور ستر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکی تو تُف برین وبا! اسی قسم کی اور بہت سی باتیں اور حکایتیں اُن سے منقول ہیں جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ آخر عمر میں مرنے کے کس قدر آرزومند تھے۔

اخیر عمر کی حالت

مرنے سے کئی برس پہلے سے چلنا پھرنا بالکل موقوف ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی۔ چھ چھ سات سات دن میں اجابت ہوتی تھی۔ طشت چوکی پلنگ کے پاس ہی کسی قدر اوجھل میں لگی رہتی تھی۔ جب حاجت معلوم ہوتی تھی تو پردہ ہو جاتا تھا۔ آپ بغیر استعانت کسی نوکر چاکر کے کپڑے اُتار کر بیٹھے ہی بیٹھے کھسکتے ہوئے چوکی پر پہنچتے تھے۔ پلنگ پر سے چوکی تک جانا چوکی پر چڑھنا چوکی پر دیر تک بیٹھے رہنا، اور پھر چوکی سے اُتر کر پلنگ تک آنا، ایک بڑی منزل طے کرنے کے برابر تھا۔ مگر خطوں کے جواب اس حالت میں بھی برابر یا خود پلنگ پر پڑے پڑے لکھتے تھے، یا کسی دوسرے آدمی کو بتاتے جاتے تھے، وہ لکھتا جاتا تھا۔

مرض الموت کی حالت

مرنے سے چند روز پہلے بیہوشی طاری ہو گئی تھی۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لئے افاقہ ہو جاتا تھا، پھر بیہوش ہو جاتے تھے۔ جس روز انتقال ہو گا اُس سے شاید ایک دن پہلے میں اُنکی عیادت کو گیا تھا، اُس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا۔ اور نواب علاء الدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا، اسکے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر۔ جو غالباً شیخ سعدی کا تھا لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا کہ "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا" اور شعر کا پہلا مصرع مجھے یاد نہیں رہا دوسرا مصرع یہ تھا۔

نکرد ہجر مدارا بمن سر تو سلامت

مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر ورد زبان رہتا تھا۔

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے　　عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

تاریخ وفات آخر۔ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ کی دوسری اور فروری ۱۸۶۹ء کی پندرہویں کو تہتر برس اور چار مہینے کی عمر میں دنیا سے رحلت کی، اور درگاہ حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہٗ میں اپنے خسر کے پائینِ مزار دفن کئے گئے۔ اُنکی وفات کی تاریخیں جو مدت تک ہندوستان کے اُردو اخباروں میں چھپتی رہیں وہ گنتی اور شمار سے باہر ہیں، صرف ایک تاریخ جس میں دس بارہ آدمیوں کو توارد ہوا یاد رکھنے کے قابل ہے یعنی (آہ غالب بمرد) جسکو مختلف لوگوں نے مختلف طور پر قطعات میں منتظم کیا تھا۔ تاریخوں کے علاوہ مرزا قربان علی بیگ سالک میر مہدی حسین مجروح اور مولّف کتاب ہذا نے اُردو میں اور منشی ہرگوپال تفتہ نے فارسی میں مرزا کے مرثیے بھی لکھے تھے جو اُسی زمانے میں چھپکر شائع ہوگئے تھے

جنازے کی نماز مرزا کے جنازے پر جبکہ دلّی دروازے کے باہر نماز پڑھی گئی۔ راقم بھی موجود تھا، اور شہر کے اکثر عمائد اور ممتاز لوگ جیسے نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب محمد مصطفےٰ خاں، حکیم احسن اللہ خاں وغیرہم اور بہت سے اہل سنت اور امامیہ دونوں فرقوں کے لوگ جنازے کی مشایعت میں شریک تھے۔ سید صفدر سلطان نبیرۂ بخشی محمود خاں نے نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم سے کہا کہ۔ مرزا صاحب شیعہ تھے! ہم کو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقے کے موافق انکی تجہیز و تکفین کریں، مگر نواب صاحب نے نہیں مانا اور تمام مراسم اہل سنت کے موافق ادا کیئے گئے، اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب سے زیادہ اُنکے اصلی اور مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں ہوسکتا تھا، مگر ہمارے نزدیک بہتر ہوتا کہ شیعہ

اور سُنّی دونوں ملکر یا علیحدہ علیحدہ اُنکے جنازے کی نماز پڑھتے اور جس طرح زندگی میں اُنکا برتاؤ سُنّی اور شیعہ دونوں کے ساتھ یکساں رہا تھا اسی طرح مرنے کے بعد بھی دونوں فرقے اُنکی حق گزاری میں شریک ہوئے۔

شاگردوں کی کثرت

مرزا صاحب کے شاگرد اطراف ہندوستان میں بیشمار تھے۔ اُنکی وسعتِ اخلاق اور عام رضاجوئی نے یہ دائرہ بہت وسیع کر دیا تھا۔ جو شخص اصلاح کے لئے اُنکے پاس غزل بھیجتا تھا ممکن نہ تھا کہ وہ اسکے خط کا جواب اور اُسکی غزل میں اصلاح دیکر نہ بھیجیں۔ اگرچہ مرزا کی فطرت شاعری میں اپنے طبقے کے لوگوں سے اس قدر بلند واقع ہوئی تھی کہ وہ کسی شاگرد یا مستفید کو اپنے ساتھ ساتھ نہیں لے چل سکتے تھے۔ جیسا کہ اُنھوں نے خود ایک فارسی شعر میں اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

ماہمائے گرم پروازیم فیض از ما مجوئے — سایہ ہمچو دود بالا می رود از بالِ ما

باایںہمہ اہل دہلی ولواحِ دہلی میں چند اصحاب جو مرزا کے فیض صحبت اور مشورۂ سخن سے زیادہ مستفید ہوئے تھے اُنکے ارشد تلامذہ سمجھے جاتے تھے، جیسے نیّر رخشاں، عارف، سالک، مجروح، علائی، تفتہ وغیرہم۔ اُنکے سوا خاص اہل دہلی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو عرفاً مرزا کے شاگرد نہیں سمجھے جاتے تھے لیکن درحقیقت اُنکے شاگرد معنوی تھے، جیسے نواب مصطفٰے خاں مرحوم۔ جنھوں نے مومن خاں مرحوم کی وفات کے بعد ہمیشہ اپنا کلام فارسی ہو یا اردو مرزا ہی کو دکھایا۔ یا جیسے سید غلام علیخاں مرحوم متخلص بہ وحشت

لہ یہ صاحب دلّی کے ممتاز لوگوں میں تھے اُنکے والد کا نام سید فرحت اللہ خاں تھا اور مولانا رشید الدین خاں مرحوم کے داماد تھے۔ قطع نظر علم و فضل کے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت خوش بیان اور شعر کا مذاق

جو مرزا کے حد سے زیادہ ماننے والے اور معتقد اور انکی صحبت سے مستفید رہے تھے۔
مرزا نے انھیں دونوں صاحبوں کی طرف اپنے ایک اُردو غزل کے مقطع میں اشارہ
کیا ہے اور کہا ہے:-

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

لطیفہ یہ دونوں صاحب باہمدگر نہایت گہری دوستی رکھتے تھے، یہاں تک
کہ انکی دوستی عشق کے درجے تک پہونچ گئی تھی۔ ایک دفعہ جبکہ راقم بھی جہانگیرآباد
میں موجود تھا سید غلام علیخاں مرحوم نواب صاحب سے ملنے کو آئے ہوئے تھے
اور مرزا صاحب نے بھی انکا یہاں آنا سُن لیا تھا انھیں دنوں میں مرزا کا
خط نواب صاحب کے نام آیا۔ اس میں خانصاحب کو بھی سلام لکھا تھا اور
اخیر میں خواجہ حافظ کے مشہور شعر کا پہلا مصرع اس طرح بدل کر لکھا تھا۔

تو[1] با حبیب نشینی و جائے پیمائی بیاد آر حریفاں بادہ پیمارا

ایک عزیز نے یہ لطیفہ سنکر کہا کہ خواجہ حافظ کے اصل شعر میں اس قدر لطف
نہ تھا جیسا کہ اس موقع پر مرزا صاحب کے تصرف سے اُس میں لطف پیدا ہوگیا ہے۔
مرزا صاحب کے اُن شاگردوں کا حال جنکے نام کے بہت سے خطوط اردوئے
معلّی اور عود ہندی میں مرزا کے لکھے ہوئے موجود ہیں یہاں لکھنے کی ضرورت
نہیں، اسلئے ہم صرف دو صاحبوں کا مختصر ذکر اس مقام پر لکھتے ہیں ایک نواب

(بقیہ نوٹ صفحہ ۹۰) اعلیٰ درجہ کا رکھتے تھے اوّل سرکار انگریزی میں ملازم رہے پھر الور میں فوجدار ہوگئے پھر لکھنؤ میں نواب
سعید الدولہ مرحوم نائب وزیر کے توسط سے کہ ان سے قرابت قریبہ رکھتے تھے ایک معزز خدمت پر ممتاز ہوگئے
وہاں سے پھر الور چلے آئے تھے اور غدر تک وہیں رہے غدر کے بعد اخیر عمر تک سررشتہ تعلیم میں منسلک
رہے اور نواب مصطفیٰ خاں مرحوم انکی ہر حال میں مدد کرتے رہے ۱۲۔

[1] یعنی نواب صاحب تو شراب سے مجتنب تھے اور مرزا پیتے تھے اسلئے انکی نسبت جائے پیمائی اور اپنی نسبت بادہ پیما کا
لفظ کہا۔ ۱۲

ضیاءالدین احمد خاں مرحوم اور دوسرے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہ غالباً ان دونوں بزرگوں میں سے کسی کے نام کا کوئی خط مرزا کے اُردو مکاتبات میں نہیں ہے جس سے انکی خصوصیت مرزا صاحب کے ساتھ خاص و عام معلوم ہو۔

نواب ضیاءالدین احمد خاں

نواب ضیاءالدین احمد خاں۔ جو فارسی میں نیرّ اور اُردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے۔ قطع نظر کمالِ شاعری و انشاپردازی کے تاریخ، جغرافیہ، علم انساب، علم اسماء رجال، تحقیق لغات اور جنرل انفورمیشن (عام واقفیت) میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے فنون مذکورہ میں کوئی مستقل تصنیف اپنے نام سے نہیں چھوڑی، لیکن اکثر مصنفین اُنسے مدد لیتے تھے اور جو مشکل پیش آتی تھی اس میں اُن سے مشورہ کرتے تھے، خصوصاً الیٹ صاحب نے جو ہندوستان کی تاریخ کئی جلدوں میں لکھی ہے اُسکی تصنیف و ترتیب میں نواب ممدوح نے بے انتہا مدد پہنچائی تھی جسکا مصنف نے اپنی کتاب کے دیباچے میں خود اعتراف کیا ہے۔

چونکہ نواب ممدوح اہل کمال کے عاشق تھے اور خاصکر مرزا صاحب سے اُنکی حقیقی چچازاد بہن منسوب تھیں اسلئے مرزا کے ساتھ انکو خاص تعلق تھا۔ وہ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں فکر شعر کرتے تھے، مگر زیادہ تر فارسی نظم و نثر لکھتے تھے اور مرزا کے قدم بقدم چلتے تھے۔ مرزا نے جو ایک قصیدہ نہایت بلیغ و لطیف نواب ممدوح کی شان میں لکھا ہے اور جس میں اُنکا اُستاد ہونے پر فخر کیا ہے اسکے کچھ اشعار مختلف مقامات سے التقاط کر کے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

صدرِ آفتاب تواں ساختن ببازیچہ ‌ ‌ ‌ ز ذرہ کہ بود در ضیائے نیّر من

نہ ایں سپہر و نہ ایں مہر عالمے دگر است — من آسمانم و او مہر نور گستر من
من آں سپہر کہ دائم چنانکہ مہر بماہ — بہ مہر نور دہد نیّرہ منوّر من
من آں سپہر کہ ہر دم رسد عطیۂ فیض — بہ سعد اکبر گردوں ز سعد اصغر من
منم خزینۂ راز و در خزینۂ راز — ضیائے دین محمد کہیں برادر من
بدین و دانش و دولت یگانۂ آفاق — بعمر کہتر و از روئے رتبہ مہتر من
بمہر دل بہ برادر دہم - نہ یعقوبم — کہ پور خویش بود دلستان و دلبر من
سخن سرائے تو آئیں نوائے را نازم — بہ نالہ ہمنفس من بہ شور ہمسر من
بہ نکتہ شیوۂ شاگرد من بمن ماناست — صنم بصورت خود می تراشد آزر من
اگرچہ اوست ارسطو و من فلاطونم — بود بہ پایہ ارسطوئے من سکندر من
زمین کوئے مرا آسمان کند ہر صبح — طلوع نیّر رویش ز طرف منظر من
اگر شوم بہ مثل آتشے شرارہ فشاں — شود بہ قاعدۂ ہمدم سمندر من
بہ بحر گر فتدم رہ - بود سفینۂ من — بہ بخت گر بودم دائے گرد افسر من
بمہر دوست دہم دل - نشاط خاطر من — بکین خصم نہم رخ لوائے لشکر من
گرم ز غصہ تبہ گشتہ کار مونس من — ورم ز کار فرو ماندہ دست یاور من
زہے ز روئے تو پیدا فروغ دانش و داد — بدیں فروغ جہانتاب گشتہ اختر من
ز تو کہ آئینۂ فیض صحبت اولیٰ — ہوائے دیدن غالب فتادہ در سر من
مرا ستودی و گفتی کہ من ازان توام[۱] — فدائے آن تو باد اقل و اکثر من
سعادت و شرف چوں منے بعرض کمال — ز بس بود کہ بود چوں تو لی ثناگر من

نواب محمد مصطفیٰ خاں | نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اگرچہ مرزا کے تلامذہ میں شمار نہیں ہوتے تھے

---

[۱] معلوم ہوتا ہے کہ نواب نے مرزا کی مدح میں کوئی قصیدہ لکھا تھا جسکی طرف ان دونوں بیتوں میں اشارہ ہے ۱۲-

بلکہ جب تک مومن خاں مرحوم زندہ رہے انھیں سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ لیکن خان موصوف کی وفات کے بعد ریختہ اور فارسی دونوں زبانوں میں وہ برابر مرزا کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو مرزا کے بعد انکے معاصرین میں سے کسی کی فارسی غزل اُنکی غزل سے لگا نہیں کھاتی تھی اور شعر کا جیسا صحیح مذاق انکی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا ویسا بہت ہی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ لوگ انکے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا معیار جانتے تھے انکے سکوت سے شاعر کا شعر خود اُسکی نظر سے گر جاتا تھا اور انکی تحسین سے اُسکی قدر بڑھ جاتی تھی۔ یہی وہ شخص تھے جنکی نسبت مرزا غالب فرماتے ہیں:۔

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او | نوشت در دیوان غزل تا مصطفٰے خاں خوش نکرد

نواب ممدوح کی شان میں بھی مرزا کا ایک فارسی قصیدہ انکے دیوان میں موجود ہے جس میں اوّل فخریہ تشبیب لکھی ہے۔ فخریہ اشعار لکھتے لکھتے کہتے ہیں۔

دستِ رو بر تاجِ قیصر مے نہم | پشت پا بر تختِ خاقاں می زنم

خردہ می گیرند بر من قدسیاں | گر نفس در مدحِ سلطاں می زنم

آں ہمائے تیز پروازم کہ بال | در ہوائے مصطفٰے خاں می زنم

عرفی و خاقانیش فرماں پذیر | سگہ در شیراز و شروان می زنم

او خرامد مست و من چاوشِ وار | بانگ بر اجرام وارکاں می زنم

گلشن کوئیش گزرگاہ من است | دوش در رفتن بہ رضواں می زنم

خوبی خوئیش بد آموز من ست | دم ز یاری می زنم ہاں می زنم

مہر ورزی بیں کہ باشم ہمنشیں | من کہ زانو پیش درباں می زنم

بشنو دبے آنکہ باد آں را برد | نالہ گر در کنج زنداں می زنم

بنگر دبے آں کہ کلک آرا کشد | نقش گر بر صفحۂ جاں می زنم

دوسرا حصہ

مرزا کے کلام پر ریویو اور اُسکا انتخاب

تمہید

مرزا کے کلام پر ریویو کرنا، اور اُسکی حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی - ایک ایسے زمانے میں، جبکہ فارسی زبان ہندوستان میں بمنزلہ مُردہ زبان کے ہوگئی ہے اور ذوق شعر روز بروز کافور ہوتا جاتا ہے - ایک نہایت مشکل کام ہے - مرزا کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ گراں قدر ہے وہ اُنکی فارسی نظم و نثر ہے لیکن اوّل تو فارسی زبان سے ملک میں عام اجنبیت پائی جاتی ہے، دوسرے مرزا کے کلام میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے لوگوں کے مذاق بالکل ناآشنا ہیں پس جو شخص اس زمانہ میں انکے کلام پر ریویو کرنا اور اسکے ذریعہ سے مصنف کی حقیقت اور اُسکا رتبہ پبلک پر ظاہر کرنا چاہتا ہے وہ درحقیقت ایک ایسے کام کے درپے ہے جس میں کامیابی کی بہت ہی کم اُمید ہوسکتی ہے - لیکن اگر کچھ اُمید ہے تو اُسی صورت میں ہے کہ کچھ کیا جائے، نہ یہ کہ کام کی مشکلات پر نظر کر کے اُس سے ہاتھ اُٹھا لیا جائے -

دفع غم نیست جز بہ غم خوردن　　　چارۂ کار نیست جز کردن

استعداد و سبق

مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ انکی حالت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ملکہ اُنکی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا - اُنھوں نے جیسا کہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں تصریح کی ہے - گیارہ برس

کی عمر[1] میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے فارسی میں کچھ اشعار بطور غزل کے موزوں کیئے تھے، جنکی ردیف میں "کہ چہ" بجائے "یعنی چہ" کے استعمال کیا تھا۔ جب اُنھوں نے وہ اشعار اپنے اُستاد شیخ معظم کو سنائے تو اُنھوں نے کہا کہ یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے؟ ایسے بے معنی شعر کہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ مرزا یہ سنکر خاموش ہو رہے۔ ایک روز ملّا ظہوری کے کلام میں ایک شعر نظر پڑ گیا جسکے آخر میں لفظ "کہ چہ" "یعنی چہ" کے معنی میں آیا تھا۔ وہ کتاب لیکر دوڑے ہوئے اُستاد پاس گئے اور وہ شعر دکھایا۔ شیخ معظم اسکو دیکھکر حیران ہو گئے، اور مرزا سے کہا تم کو فارسی زبان سے خدا داد مناسبت ہے، تم ضرور فکر شعر کیا کرو، اور کسی کے اعتراض کی کچھ پروا نہ کرو۔

مرزا کو جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے باپ نے پانچ برس کی اور چچا نے نو برس کی عمر میں چھوڑا تھا۔ چچا کے بعد کوئی مربّی و سرپرست انکے سر پر نہ رہا تھا۔ مرزا کی نانہال جہاں اُنھوں نے پرورش پائی تھی بہت آسودہ حال تھی اور نانہال کی ثروت سے ظاہرا مرزا اور اُنکے بھائی سے بڑھکر کوئی فائدہ اُٹھانے والا نہ تھا۔ جبکہ سر پر کوئی مربّی نہ ہو، دولت و آسودگی سے زیادہ چیز خانہ برانداز نہیں ہو سکتی۔

---

[1] منشی بہاری لال مشتاق کا بیان ہے کہ لالہ کنھیا لال ایک صاحب آگرے کے رہنے والے جو مرزا صاحب کے ہمعمر تھے ایکبار دلّی میں آئے اور جب مرزا سے ملے تو اثنائے کلام میں انکو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے زمانے میں لکھی تھی وہ بھی آپ کو یاد ہے؟ اُنھوں نے انکار کیا لالہ صاحب نے کہا وہ اُردو مثنوی میرے پاس موجود ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے وہ مثنوی مرزا کو لاکر دی اور وہ اُسکو دیکھکر بہت خوش ہوئے۔ اسکے آخر میں یہ فارسی شعر کسی اُستاد کا پتنگ کی زبان سے لاحق کر دیا تھا۔ "رشتہ در گردنم افگندہ دوست + میکشد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست" لالہ صاحب کا بیان تھا کہ مرزا صاحب کی عمر جبکہ یہ مثنوی لکھی تھی آٹھ نو برس کی تھی۔ ۱۲

مرزا کی نوجوانی کے ساتھ اُس آسودگی نے وہ کام کیا جو کہ آگ بارود کے ساتھ کرتی ہے
جس آزادی اور مطلق العنانی میں مرزا کی جوانی گزری ہے اُسکی کیفیت کا خود انھیں
کے الفاظ سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ ایک جگہ اپنی جوانی کی حالت اس طرح ظاہر کرتے
ہیں "بافرو فرہنگ بیگانہ، و با نام و ننگ دشمن بافرومایگان ہمنشین، و با اوباس
ہمرنگ پائے بیراہہ پوے، و زبان بے صرفہ گوے، در شکست خویش گردوں را
دستیار، و در آزار خویش دشمن را آموزگار" اسکے بعد لکھتے ہیں "تیزی رفتار من
از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت، و خانقاہ و میکدہ را بیکدگر زد" الغرض مرزا کا لڑکپن
اور اُنکی جوانی ایسی حالت میں بسر ہوئی تھی کہ ایک ایسے فن میں جسکا نہ کوئی
قدردان نظر آتا تھا اور نہ کوئی خریدار دکھائی دیتا تھا، اعلیٰ درجے کا کمال بہم
پہنچانا در کنار، اُسکا خیال بھی دل میں گزرنا قریب ناممکن کے تھا۔ پس یہ
صرف اُنکی طبیعی مناسبت اور فطری قابلیت کا اقتضا تھا کہ اُس غفلت و بدمستی
کے عالم میں بھی شعر کا کھٹکا برابر لگا رہا اور شاعری کی تکمیل کا خیال ایسی بیخبری
کے زمانے میں بھی فراموش نہیں ہوا۔

دیوان ریختہ مرزا نے گل رعنا[1] کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے اوّل اُردو
زبان میں شعر کہنا شروع کیا تھا اسلیے ہم بھی پہلے اُنکے اُردو دیوان کا ذکر کرتے
ہیں۔ جس روش پر مرزا نے ابتدا میں اُردو شعر کہنا شروع کیا تھا۔ قطع نظر اُسکے
کہ اُس زمانے کا کلام خود ہمارے پاس موجود ہے۔ اُس روش کا اندازہ
اس حکایت سے بخوبی ہوتا ہے۔ خود مرزا کی زبانی سنا گیا ہے کہ

[1] مرزا نے اپنے کلکتے کے ایک دوست مولوی سراج احمد کی فرمایش سے اپنے تمام اُردو فارسی دیوان کا انتخاب
کیا تھا جسکا دیباچہ اُنکے کلیات نثر فارسی میں موجود ہے اسکا نام گل رعنا رکھا تھا۔

میر تقی[۱] نے جو مرزا کے ہموطن تھے انکے لڑکپن کے اشعار سُنکر یہ کہا تھا کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد ملگیا اور اُس نے اسکو سیدھے رستے پر ڈالدیا تو لاجواب شاعر بنجائیگا، ورنہ مہمل بکنے لگیگا"

مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر ملا عبد الصمد کی تعلیم کے سبب - فارسیت کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کی بول چال اور اُنکی قوت متخیلہ پر چڑھ گیا تھا - یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر ذکی الطبع لڑکے ابتدا میں سیدھے سادے اشعار کی نسبت مشکل اور پیچیدہ اشعار کو جو بغیر غور و فکر کے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے زیادہ شوق سے دیکھتے اور پڑھتے ہیں - مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا - چنانچہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی اسی روش پر مرزا نے اُردو میں چلنا اختیار کیا تھا جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں -

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے

یہاں بطور نمونے کے مرزا کے ابتدائی کلام میں سے چند اشعار لکھے جاتے ہیں

[۲]کرے گر فکر تعمیر خرابیہائے دل گردوں (۱) نہ نکلے خشت مثل استخواں بیروں زقالبہا

اسد ہر اشک ہے یک حلقہ بر زنجیر افزودں (۲) بہ بند گریہ ہے نقش بر آب اُمید رستن ہا

بحسرت گاہ ناز کشتۂ جاں بخشی خوباں (۳) خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے ترجبیں پایا

---

۱ مرزا کی ولادت ۱۲۱۲ھ میں ہوئی ہے اور میر کی وفات ۱۲۲۵ھ میں واقع ہوئی - اس سے ظاہر ہے کہ مرزا کی عمر میر کی وفات کے وقت تیرہ چودہ برس کی تھی، مرزا کے اشعار انکے بچپن کے دوست نواب حسام الدین حیدر خاں مرحوم والد ناظر حسین مرزا صاحب نے میر تقی کو دکھائے تھے - ۱۲

۲ یہ شعر مرزا نے اپنے دیوان ریختہ میں سے تو نکال ڈالا مگر دیوان فارسی میں بہ تغیر الفاظ داخل کر دیا - یعنی اس طرح

کند گر فکر تعمیر خرابیہائے ما گردوں نیاید خشت مثل استخواں بیروں زقالبہا

(۴) رکھا غفلت نے دور اُفتادۂ ذوقِ فنا ورنہ — اشارت فہم کو ہر ناخنِ بُریدہ ابرو تھا
(۵) پریشانی سے مغزِ سر ہوا ہے پنبۂ بالش — خیالِ شوخیِ خوباں کو راحت آفریں پایا
(۶) موسم گل میں مے گلگوں حلالِ میکشاں — عقد وصلِ دخترِ رزانگور کا ہر دانہ تھا
(۷) ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہوگیا — گو بُیا صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا

چونکہ مذکورہ بالا شعروں میں قطع نظر اسکے کہ طرز بیان اُردو بول چال کے خلاف ہے، خیالات میں بھی کوئی لطافت نہیں معلوم ہوتی، اسلیئے انکے معنی بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف چوتھے شعر کی جو کسی قدر آسان ہے یہاں بطور نمونے کے شرح کیجاتی ہے، تاکہ معلوم ہو کہ مرزا نے مشق سخن کس قسم کے خیالات سے شروع کی تھی اور کس قدر کاوش سے وہ یہ نئی قسم کے مضمون پیدا کرتے تھے۔

کہتا ہے کہ فنا میں جو لذت اور ذوق تھا ہماری غفلت نے اس سے ہمیشہ دور دور رکھا - اگر یہ غفلت نہ ہوتی تو اشارتِ فہم کے لئے ہر ایک ناخن جو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے - ابرو کا کام دیتا تھا - ابرو کا کام ہے اشارہ و ایما کرنا اور ناخنِ بُریدہ جو ابرو کی شکل ہوتا ہے وہ بھی فنا کی لذت کی طرف اشارہ کرتا تھا، کیونکہ ناخن کے کٹنے سے جو ایک قسم کی فنا ہے لذت اور راحت حاصل ہوتی ہے۔

یہ اوپر کی سات بیتیں ہم نے مرزا کے اُن نظری اشعار اور نظری غزلوں میں سے نقل کی ہیں جو اُنھوں نے اپنے دیوان ریختہ کو انتخاب کرتے وقت اس میں سے نکال ڈالی تھیں - مگر اب بھی ان کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب بہت سے اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن پر اُردو زبان کا اطلاق مشکل سے ہو سکتا ہے - جیسے ذیل کے اشعار جو اب دیوان میں موجود ہیں۔

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا ۔ تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا
ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل ۔ کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط ۔ تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا
شب خمارِ چشمِ ساقی رستخیز اندازہ تھا ۔ تا محیطِ بادہ صورتخانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا ۔ جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

ان اشعار کو مہمل کہو یا بےمعنی مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا نے وہ نہایت جانکاہی اور جگرکاوی سے سرانجام کیے ہونگے۔ جبکہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دُکھتا ہے تو مرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیوں نہ دکھا ہوگا؟ ظاہرا یہی سبب تھا کہ انتخاب کے وقت بہت سے اشعار۔ جو فی الواقع نظری کرنے کے قابل تھے انکے کاٹنے پر مرزا کا قلم نہ اٹھ سکا۔ ممکن ہے کہ ایک مدت کے بعد یہ اشعار انکی نظر میں کھٹکے ہوں، مگر چونکہ دیوان چھپکر شایع ہو چکا تھا۔ اسلئے اُنھوں نے ان اشعار کا نکالنا فضول سمجھا۔

مرزا کے حق میں جو پیشین گوئی میر تقی نے کی تھی اُسکی دونوں شقیں انکے حق میں پوری ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ مرزا اول ایسے رستے پر پڑلیے تھے کہ اگر استقامت طبع اور سلامت ذہن اور بعض صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک، اور اور نکتہ چین ہمعصروں کی خوردہ گیری اور طعن و تعریض سدّ راہ نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزل مقصود سے بہت دور جا پڑتے۔ سُنا گیا ہے کہ اہل دہلی مشاعروں میں جہاں مرزا بھی ہوتے تھے تعریضاً ایسی غزلیں لکھکر لاتے تھے جو الفاظ و ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پرشوکت و شاندار معلوم ہوتی تھیں، مگر معنی ندارد، گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔

ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے جو نہایت ظریف الطبع تھے اور

جنکو چند روز قلعہ دہلی سے تعلق رہا تھا - مرزا سے کسی موقع پر یہ کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا، اور اسی وقت دو مصرعے خود موزوں کر کے مرزا کے سامنے پڑھے۔

پہلے تو روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکال   پھر دوا جتنی ہے کُل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا یہ سنکر سخت حیران ہوئے اور کہا حاشا یہ میرا شعر نہیں - مولوی عبدالقادر نے ازراہ مزاح کے کہا میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے، اور دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں - آخر مرزا صاحب کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں، اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمھارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔

مرزا نے اس قسم کی نکتہ چینیوں پر اُردو اور فارسی دیوان میں جا بجا اشارہ کیا ہے - اُردو میں ایک جگہ کہتے ہیں -

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا   گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی"

ایک اور اُردو غزل کا مطلع ہے -

گر خامشی سے فائدہ اخفاے حال ہے   خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

یعنی اگر خاموشی سے یہ فائدہ ہے کہ حال دل ظاہر نہیں ہوتا تو میں خوش ہوں کہ میرا بولنا بھی خاموشی ہی کا فائدہ دیتا ہے، کیونکہ میرا کلام کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتا -

چونکہ مرزا کی طبیعت فطرتاً نہایت سلیم واقع ہوئی تھی اسلیے نکتہ چینیوں کی تعریضوں سے انکو بہت تنبہ ہوتا تھا، آہستہ آہستہ انکی طبیعت راہ پر آتی جاتی تھی - اسکے سوا جب مولوی فضل حق سے مرزا کی راہ و رسم بہت بڑھ گئی اور مرزا انکو اپنا خالص و مخلص دوست اور خیر خواہ سمجھنے لگے تو اُنھوں نے

اس قسم کے اشعار پر بہت روک ٹوک کرنی شروع کی، یہاں تک کہ اُنھیں کی تحریکوں سے اُنھوں نے اپنے اُردو کلام میں سے جو اُس وقت موجود تھا دو ثلث کے قریب نکال ڈالا اور اُسکے بعد اُس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔

مرزا نے ریختے میں جو روش ابتدا میں اختیار کی تھی ظاہر ہے کہ وہ کسی طرح مقبول خاص و عام نہیں ہوسکتی تھی۔ لوگ عموماً میر، سودا، میر حسن، جرأت اور انشا وغیرہ کا سیدھا سادا اور صاف کلام سننے کے عادی تھے۔ جو محاورے روزمرہ کی بول چال اور بات چیت میں برتے جاتے تھے اُنھیں کو جب اہل زبان وزن کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھتے تھے تو انکو زیادہ لذت آتی تھی اور زیادہ لطف حاصل ہوتا تھا۔ شعر کی بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی تھی کہ ادھر قائل کے منہ سے نکلا اُدھر سامع کے دل میں اُتر گیا، مگر مرزا کے ابتدائی ریختے میں یہ بات بالکل نہ تھی۔ جیسے خیالات اجنبی تھے ویسی ہی زبان غیر مانوس تھی فارسی زبان کے مصادر، فارسی کے حروف ربط اور توابع فعل۔ جو کہ فارسی کی خصوصیات میں سے ہیں۔ انکو مرزا اُردو میں عموماً استعمال کرتے تھے اکثر اشعار ایسے ہوتے تھے کہ اگر اُن میں ایک لفظ بدل دیا جائے تو سارا شعر فارسی زبان کا ہو جائے بعض اسلوب بیان خاص مرزا کے مخترعات میں سے تھے جو نہ اُن سے پہلے اُردو میں دیکھے گئے نہ فارسی میں۔ مثلاً انکے موجودہ اُردو دیوان میں ایک شعر ہے

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے"

میں نے خود اسکے معنی مرزا سے پوچھے تھے، فرمایا کہ اے کی جگہ جز پڑھو معنی خود سمجھ میں آجائینگے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری۔ جو ایک کفِ خاکستر سے زیادہ۔ اور بلبل۔ جو ایک قفس عنصری سے زیادہ نہیں۔ انکے جگر سوختہ

یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف انکے چیخنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔ یہاں جس معنی میں مرزا نے اسے کا لفظ استعمال کیا ہے ظاہرا یہ انھیں کا اختراع ہے۔ ایک شخص نے یہ معنی سنکر کہا کہ "اگر اسے کی جگہ چیز کا لفظ رکھدیتے یا دوسرا مصرع اس طرح کہتے "اے نالہ نشاں تیرے سوا عشق کا کیا ہے" تو مطلب صاف ہو جاتا اُس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے، مگر مرزا چونکہ معمولی اسلوبوں سے تابمقدور بچتے تھے اور شارع عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے اسلئے وہ بہ نسبت اسکے کہ شعر عام فہم ہو جائے، اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرز خیال اور طرز بیان میں جدّت اور نرالا پن پایا جائے۔

مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اُسکو اردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو، مگر اس میں شک نہیں کہ اس سے اُنکی اُرجنیلٹی اور غیر معمولی اُپیچ کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہی انکی ٹیڑھی ترچھی چالیں انکی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں، معمولی قابلیت و استعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس پگڈنڈی پر اگلی بھیڑوں کا گلہ چلا جاتا ہے اُسی پر آنکھیں بند کرکے گلے کے پیچھے پیچھے ہولیں اور ایک کے ادھر اُدھر آنکھ اُٹھاکر نہ دیکھیں۔ جو ہنر یا پیشہ اختیار کریں اس میں اگلوں کی چال ڈھال سے سر مو تجاوز نہ کریں، اور انکے نقش قدم پر قدم رکھتے چلے جائیں وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ایسا نہیں کرتے بلکہ دوسرے رستے پر چلنا انکی قدرت سے باہر ہوتا ہے۔

برخلاف اسکے جن کی طبیعت میں اُرجنیلٹی اور غیر معمولی اُپیچ کا مادہ ہوتا ہے وہ اپنے میں ایک ایسی چیز پاتے ہیں جو اگلوں کی پیروی پر انکو مجبور نہیں ہونے دیتی۔ انکو قوم کی شاہراہ کے سوا بہت سی راہیں ہر طرف

کھلی نظر آتی ہیں۔ وہ جس عام روش پر اپنے فنوں کو چلتا دیکھتے ہیں اُس پر چلنے سے اُنکی طبیعت اِبا کرتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جو طریق غیر مسلوک وہ اختیار کریں وہ منزل مقصود تک پہنچانے والا نہ ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ دائیں بائیں چل پھر کر طبیعت کی جولانیاں نہ دیکھ لیں اور تھک کر چور نہ ہو جائیں، عام رہگیروں کی طرح آنکھیں بند کر کے شارع عام پر پڑ جائیں۔

مرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی، وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے۔ وہ خست شرکا کے سبب خود شاعری سے نفرت ظاہر کرتے تھے۔ عامیانہ خیالات اور محاورات سے جہاں تک ہو سکتا تھا اجتناب کرتے تھے۔

لطیفہ ایک صاحب نے جو غالباً بنارس یا لکھنؤ سے دلّی میں آئے تھے مرزا کے ایک شعر کی انکے سامنے نہایت تعریف کی۔ مرزا نے کہا ارشاد تو ہو وہ کونسا شعر ہے؟ انھوں نے میر اماٰنی متخلص بہ اسد شاگرد مرزا رفیع کا یہ شعر پڑھا

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی   مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

چونکہ شعر میں اسد تخلص واقع ہوا تھا اُنھوں نے یہ سمجھا کہ مرزا غالب کا شعر ہے۔ مرزا یہ سنکر بہت جز بز ہوئے اور فرمایا اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اسکو رحمت خدا کی اور اگر مجھ اسد کا یہ شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی۔

مرزا کو اس شعر کا اپنی طرف منسوب ہونا غالباً اسلیئے ناگوار گذرا ہو گا کہ مرے شیر اور رحمت خدا کی یہ دونوں محاورے زیادہ تر عامیوں اور سوقیوں کی زبان پر جاری ہیں اور اسد کی رعایت سے مرے شیر کہنا بھی انکی طبیعت کے خلاف تھا کیونکہ وہ ایسی مبتذل رعایتوں کو جو ہر شخص کو باسانی سوجھ جائیں۔ مبتذل جانتے تھے۔

اس قسم کی اور بہت سی حکایتیں ہیں جن سے صاف ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف شاعری میں بلکہ وضع میں لباس میں طعام میں طریق ماند و بود میں یہاں تک کہ مرنے اور جینے میں بھی عام طریقے پر چلنا پسند نہ کرتے تھے۔ یہاں ایک لطیفہ قابل لکھنے کے ہے لطیفہ مرنے سے آٹھ سات برس پہلے انھوں نے ایک مادہ تاریخ اپنی وفات کا نکالا تھا۔ جسمیں ۱۲۷۷ھ نکلتے تھے۔ اتفاق سے اسی سال شہر میں وبا آئی، مگر مرزا بچ گئے اس امر کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں۔ میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی (یعنی اس سنہ میں مجھے مرنا چاہیے تھا) مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا، واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفع فسادِ ہوا کے سمجھ لیا جائیگا۔" اگرچہ یہ محض ایک ہنسی کی بات لکھی ہے۔ مگر انکی طبیعت کا اقتضا اس سے صاف جھلکتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب جسکو یہ خط لکھا ہے وہ انکی اس خصلت سے خوب واقف ہے۔

بہر حال مرزا ایک مدت کے بعد اپنی بیراہ روی سے خبردار ہوئے۔ اور استقامتِ طبع اور سلامتیِ ذہن نے انکو راہِ راست پر ڈالے بغیر نہ چھوڑا گو انکا ابتدائی کلام جسکو وہ حد سے زیادہ جگر کاوی اور دماغ سوزی سے سرانجام کرتے تھے مقبول نہ ہوا، مگر چونکہ قوتِ متخیلہ سے بہت زیادہ کام لیا گیا تھا اور اسلیے اُس میں ایک غیر معمولی بلند پروازی پیدا ہوگئی تھی۔ جب قوتِ ممیزہ نے اُسکی باگ اپنے قبضے میں لی تو اس نے وہ جوہر نکالے جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھے۔

یہاں یہ امر جتا دینا ضرور ہے کہ مرزا نے ریختہ گوئی کو اپنا فن قرار نہیں دیا تھا۔ بلکہ محض تفننِ طبع کے طور پر کبھی اپنے دل کی امنگ سے کبھی دوستوں کی فرمائش سے اور کبھی بادشاہ یا ولیعہد کے حکم کی تعمیل کے لئے

ایک آدھ غزل لکھ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انکے اُردو دیوان میں غزل کے سوا کوئی صنف بقدرِ معتد بہ نہیں پائی جاتی۔ وہ منشی نبی بخش مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں "بھائی صاحب تم غزل کی تعریف کرتے ہو، اور شرماتا ہوں، یہ غزلیں کاہیکو ہیں، پیٹ پالنے کی باتیں ہیں۔ میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجھکو ناز ہے کوئی انکا لطف نہیں اٹھاتا۔ اب قدردانی اس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرت ظلِ سبحانی فرما بیٹھتے ہیں کہ بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہیں لائے یعنی نیا ریختہ۔ ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہہ کر لیجاتا ہوں۔"

قطع نظر اسکے وہ اُس زمانے کے خیالات کے موافق اُردو شاعری کو داخلِ کمالات نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس میں اپنی کسرِ شان جانتے تھے چنانچہ ایک فارسی قطعے میں جسکی نسبت مشہور ہے کہ اس میں شیخ ابراہیم ذوق کی طرف خطاب ہے۔ کہتے ہیں:-

فارسی بین تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ	بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من ست
راست میگویم من و از راست سر نتواں کشید	ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من ست

مگر چونکہ مرزا کے معاصرین اکثر نکتہ سنج اور نکتہ شناس تھے اسلیے وہ ریختہ کے سرانجام کرنے میں بھی اپنی پوری توجہ اور ہمت صرف کرتے تھے اور دونوں زبانوں میں اپنی فوقیت اور برتری قائم رکھنے کی برابر فکر رکھتے تھے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شاعر اور اس کلام کے رتبے کا اندازہ اسکے کلام کی قلت اور کثرت سے نہیں ہوتا بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اسکے منتخب اور برگزیدہ اشعار کس درجے کے ہیں۔ میر کی قدر لوگ اسلیے نہیں کرتے کہ اُس نے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے ہیں، بلکہ صرف اُسکے منتخب اشعار نے جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں

اسکو تمام ریختہ گو شاعروں کا سرتاج بنا دیا ہے - لطف علیخاں آذر آتشکدہ میں نوری صفاہانی کی نسبت لکھتا ہے کہ اُسکے دیوان کا مختصر ہونا یہی اسکے کلام کی خوبی اور حسن طبع کی کافی دلیل ہے - یہ بھی معلوم رہے کہ تمام شعرا کا کلام ایک ہی معیار سے نہیں جانچا جاتا ورنہ فردوسی و نظامی دونوں مثنوی میں، اور انوری و خاقانی دونوں قصیدے میں مسلم الثبوت نہیں ٹھہر سکتے کیونکہ انوری کا قصیدہ اور فردوسی کی مثنوی باعتبار سادگی اور صفائی و عام فہم ہونے کے خاقانی کے قصیدے اور نظامی کی مثنوی سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے، حالانکہ چاروں شخص فارسی شاعری کے رکن رکین مانے جاتے ہیں پس ضرور ہے کہ جدا جدا کلام جدا جدا معیاروں سے جانچے جائیں - مرزا کے اُردو کلام میں جیساکہ اوپر مذکور ہوا غزل کے سوا کوئی صنف شمار کے قابل نہیں ہے مرزا کی موجودہ غزلیات - گو بمقابلہ بعض شعرا کے تعداد میں کیسی ہی قلیل ہوں لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں، اور جسقدر بلند اور عالی خیالات مرزا کے ریختہ میں نکلیں گے اُس قدر کسی ریختہ گو کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے - البتہ ہمکو مرزا کے عمدہ اشعار کے جانچنے کے لیے ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا پڑیگا - جسکو اُمید ہے کہ اہل انصاف تسلیم کریں گے۔

میر و سودا اور اُنکے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرنوں سے اولاً فارسی اور اس کے بعد اُردو غزل میں بندھتے چلے آتے ہیں وہی مضامین بہ تبدیل الفاظ اور بتغیر اسالیب بیان عامۂ اہل زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ میں ادا

کیے جائیں۔ چنانچہ میر سے لیکر ذوق تک جتنے مشہور غزل گو مرزا کے سوا اہل زبان میں گزرے ہیں انکی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے جو اس محدود دائرے سے خارج ہوں انکی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضمون پہلے متعدد طور پر بندھ چکا ہے وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جائے کہ تمام اگلی بندشوں سے سبقت لیجائے۔ برخلاف اسکے مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے۔ انکی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جنکو اور شعرا کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کیے گئے ہیں جو سب سے زالا ہے، اور ان میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں جنسے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اور لوگوں نے اول سے آخر تک قوم کی شاہراہ سے سرِ مو انحراف نہیں کیا۔ اور جس چال سے اگلوں نے راہ طے کی تھی اُسی چال سے تمام رستہ طے کیا ہے۔ مرزا نے اول شاہراہ کا رُخ چھوڑ کر دوسرے رُخ چلنا اختیار کیا، اور جب راہ کی مشکلات نے مجبور کیا تو انکو بھی آخر اُسی رُخ پر چلنا پڑا۔ مگر جس لیک پر قافلہ جا رہا تھا اسکے سوا ایک اور لیک اُسی کے متوازی اپنے لیے نکالی اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے اُس چال کو چھوڑ کر دوسری چال اختیار کی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر و سودا اور انکے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ہے اور اسکے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہمکو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے، اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں، یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جاکر، ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے، اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔ یہاں اول ہم چند شعر مرزا کے دیوان سے ایسے نقل کرتے ہیں جنسے انکے

خیالات کا اچھوتا پن ثابت ہوتا ہے۔

بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا (اخلاق) آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں آسان کام بھی دشوار ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو کہ عین انسان ہے اُسکا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے۔ بلکہ شاعرانہ استدلال ہے جس سے بہتر ایک شاعر استدال نہیں کر سکتا۔

فطرت انسانی

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

نشاط کے معنی اُمنگ کے ہیں۔ نشاطِ کار یعنی کام کرنے کی اُمنگ۔ یہ بھی جہاں تک کہ معلوم ہے ایک نیا خیال ہے، اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے کیونکہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبیعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے اُسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام کرتا ہے اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے اسی قدر کام میں تاخیر اور سہل انگاری زیادہ کرتا ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا (ترجیح) ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے، اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے پہلے مصرعے کے معنی ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرعے سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو کیا بُرائی ہوتی، مگر قائل کا مقصود یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہئے کہ میں کیا چیز ہوتا، مطلب یہ کہ خدا ہوتا کیونکہ پہلے مصرعے میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے (اخلاق) آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے - اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اُسکو ادا کیا گیا ہے اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اُسکی فہم کا قصور ہے - دعویٰ یہ ہے کہ جسقدر ہمت عالی ہوتی ہے اُسی کے موافق اُسکی تائید غیب سے ہوتی ہے - اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک - جسکو آنکھوں میں جگہ ملی ہے - اگر اس کی ہمت جبکہ وہ دریا میں تھا - موتی بننے پر قانع ہو جاتی تو اُسکو جیسا کہ ظاہر ہے یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا -

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ ❊ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

لاگ دشمنی اور لگاؤ محبت - یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندھا ہو! مگر ہم نے آجتک نہیں دیکھا - اگر کسی نے باندھا بھی ہوگا تو اس خوبی و لطافت سے ہرگز نہ باندھا ہوگا - مطلب یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے نہ دوستی، اگر دشمنی بھی ہوتی تو اسلیئے کہ اُس میں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے ہم اُسکو دوستی سمجھتے - لیکن جب نہ دوستی ہو اور نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکا کھائیں قطع نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے لاگ اور لگاؤ ایسے دو لفظ بہم پہنچائے ہیں جنکا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو چہار چند کر دیا ہے -

فضیلت انواع انسانی	گرنی تھی ہمپہ برق تجلی نہ طور پر دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

اس شعر میں اُس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا، مگر وہ اسکے متحمل نہ ہوسے اور ڈر گئے اور انسان نے اُسکو اُٹھا لیا، شاعر کہتا ہے کہ برق تجلی کے گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کوہِ طور، کیونکہ شراب خوار کا ظرف دیکھکر اس کے

موافق اُسکو شراب دیجاتی ہے، پس کوہِ طور - جو منجملہ جمادات کے ہے - وہ کیونکر تجلی الٰہی کا متحمل ہو سکتا ہے یہ خیال بھی مع اس تمثیل کے جو اُس میں بیان ہوئی ہے بالکل اچھوتا خیال معلوم ہوتا ہے -

حریفِ مطلب مشکل نہیں فسون نیاز (شوخی) دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

چونکہ خیال وسیع تھا، اور مضمون مطلع میں بندھنے کا مقتضی تھا، اس لیے پہلا مصرع اُردو روزمرہ سے کسی قدر بعید ہو گیا ہے - مگر بالکل ایک نئی شوخی ہے جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی - کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا، لاچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو یعنی ایسی چیز طلب کرینگے جو پہلے ہی دیجا چکی ہو -

آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد (شوخی) مجھ سے مرے گنہ کا حساب اےخدا نہ مانگ

اس میں بھی نئی طرح کی شوخی ہے جو بالکل اچھوتی ہے - بظاہر درخواست کرتا ہے کہ اے خدا مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ، اور درپردہ الزام دیتا ہے، گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں - وہ شمار میں اسقدر زیادہ ہیں کہ جب انکو شمار کرتا ہوں تو وہ داغ جو تو نے دنیا میں دیے ہیں، اور جو شمار میں اُسی کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں، اُنکی گنتی یاد آتی ہے - گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بسبب عدم استطاعت کے اُسکو خاطر خواہ نہ کر سکا، کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی - مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہ ہوا، اور وصل میسر آیا تو شراب نہ ملی - پس جتنے گناہ کیے ہیں اُتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں -

شکایت اہل وطن	مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

پردیس میں مرنا۔ جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے۔ اس پر خدا کا اسلیئے شکر کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور کس رتبے کا آدمی تھا؟ لیکن وطن میں مرنا جہاں ایک زمانہ واقفِ حال ہو، مگر خریدار و غمخوار ایک بھی نہ ہو، وہاں مردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی۔ پس خدا کا شکر ہے کہ اُس نے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے مگر فی الحقیقت سراسر اہل وطن کی شکایت ہے۔ جسکو ایک عجیب پیرائے میں ظاہر کیا ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود (التصوف) ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں سالک کو تمام موجوداتِ عالم میں حق ہی حق نظر آئے اُسکو شہود کہتے ہیں۔ اور غیب الغیب سے مراد مرتبۂ احدیت ذات ہے جو عقل و ادراک و بصر و بصیرت سے وراالوار ہے۔ کہتا ہے کہ جسکو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہے اور اسکو غلطی سے شہود سمجھنے میں ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں۔ پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے اور اس سے بہتر اس مضمون کے لیے مثال نہیں ہو سکتی۔

نظر لگے نہ کہیں اسکے دست و بازو کو (عاشقانہ) یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

عشق حقیقی ہو یا مجازی اُسکے زخم کی گہرائی اس سے بہتر کسی اسلوب میں بیان نہیں ہو سکتی۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ خیال بالکل اچھوتا ہے اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے، اور ایسی خوبی سے بیان ہوا ہے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا۔ مشکلات کی کثرت کا اندازہ ضد حقیقی یعنی اُسکے آسان ہو جانے سے کرنا۔ درحقیقت حسنِ مبالغے کی معراج ہے

جسکی نظیر آج تک نہیں دیکھی گئی۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے (عاشقانہ) دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ایک فیکٹ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہوجانا عجیب اتفاق ہے۔ اس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لیجاؤ، اور چاہو مجاز پر محمول کرو، دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا۔ یعنی دشوار ہوتا۔ تو کچھ دقت نہ تھی، کیونکہ ہم مایوس ہوکر بیٹھ رہتے۔ اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے، مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں، اور اسلئے شوق آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے (وفاداری) مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر بتخانے میں کاٹ دے اور وہیں مر رہے، تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اسکو کعبے میں دفن کیا جائے۔ کیونکہ اس نے وفاداری کا حق پورا پورا ادا کردیا، اور یہی ایمان کی اصل ہے۔

طاعت میں تار ہے نہ مے انگبیں کی لاگ (تصوف) دوزخ میں ڈالدو کوئی لیکر بہشت کو

یعنی جب تک بہشت قائم ہے لوگ عبادت اس امید پر کرتے ہیں کہ وہاں شہد اور شراب طہور وغیرہ ملیگی۔ پس بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہیے تاکہ یہ لالچ باقی نہ رہے اور لوگ خالصاً لوجہ اللہ عبادت کریں۔

حسن بیان کی تعریف

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی کے حسنِ بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہوسکتی کہ جو بات قائل کے منہ سے نکلے وہ سامع کے دل میں اس طرح اُتر جائے کہ اسکو یہ شبہہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا (اخلاق) جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے
جامِ جم پر جامِ سفال کو کس خوبی سے ترجیح دی ہے کہ اسکی کچھ تعریف نہیں ہو سکتی
اور بالکل نیا خیال ہے جو کہیں نظر سے نہیں گزرا۔

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے (تصوف) بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے
یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گزرا ہو مگر تمثیل نے اسکو بالکل ایک اچھوتا
مضمون بنا دیا ہے اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر اہل
ہمت کا وجود ہوتا جو دنیا کو محض ناچیز سمجھ کر اسکی طرف التفات نہ کرتے تو دنیا
ویران ہو جاتی، پس یہ جاننا چاہیے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہل
ہمت مفقود ہیں۔ یعنی جس طرح میخانہ میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس
بات کی دلیل ہے کہ میخانے میں کوئی میخوار نہیں ہے اسی طرح عالم کا آباد ہونا
دلالت کرتا ہے کہ اسمیں اہلِ ہمت معدوم ہیں۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید (ناامیدی) ناامیدی اُس کی دیکھا چاہیے
ناامیدی کی غایت اِس سے بڑھکر اور ایسی خوبی سے شاید ہی کسی نے بیان
کی ہو۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
یعنی جو گناہ ہم نے کیے ہیں اگر انکی سزا ملنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت
کے ہم نہیں کر سکے اور انکی حسرت دل میں رہ گئی انکی داد بھی ملنی چاہیے۔

علاوہ جدتِ مضامین اور طرفگیِ خیالات کے اور بھی چند خصوصیتیں مرزا
صاحب کے کلام میں ایسی ہیں جو اور ریختہ گویوں کے کلام میں شاذ و نادر پائی
جاتی ہیں۔ اولاً عام اور مبتذل تشبیہیں جو عموماً ریختہ گویوں کے کلام میں متداول
ہیں، مرزا جہاں تک ہو سکتا ہے اُن تشبیہوں کو استعمال نہیں کرتے، بلکہ

تقریباً ہمیشہ نئی نئی تشبیہیں ابداع کرتے ہیں۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے، بلکہ خیالات کی جدت انکو جدید تشبیہیں پیدا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ انکی ابتدائی ریختہ میں جو تشبیہیں دیکھی جاتی ہیں وہ اکثر غرابت سے خالی نہیں ہیں۔ مثلاً سانس کو موج سے بیخودی کو دریا سے، گرداب کو شعلۂ جوالہ سے مغزِ سر کو پنبۂ بالش سے، دانۂ انگور کو عقد وصال سے، استخواں کو خشت اور بدن کو قالب خشت سے، اور اسی قسم کی اور بہت سی عجیب و غریب تشبیہیں اُن کے ابتدائی ریختے میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن جسقدر خیالات کی اصلاح ہوتی گئی اُسی قدر تشبیہوں میں۔ باوجود ندرت اور طرفگی اور لطافت بڑھتی گئی۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام (مثال ۱) مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یاں

یہاں سورج کو۔ اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزاے عالم میں سے ہے اور تمام اجزاے عالم آمادہ زوال و فنا ہیں۔ چراغ رہگذار باد سے تشبیہ دی ہے، جو بالکل نئی تشبیہ ہے۔

۔ دوسری جگہ سورج کو۔ اس لحاظ سے کہ حُسن معشوق کے مقابلہ میں اُسکو ناقص الخلقت قرار دیا ہے۔ ماہ نخشب کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے (مثال ۲) خورشید ہنوز اسکے برابر نہ ہوا تھا

۔ ایک جگہ انسان کی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی اُسکو غم سے نجات نہیں ہوتی شمع سے تشبیہ دی ہے، کہ جب تک صبح نہیں ہوتی وہ برابر جلتی رہتی ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں۔

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج (مثال ۳) شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اس قسم کی نادر و بدیع تشبیہات سے مرزا کے دونوں دیوان اُردو اور فارسی

بھرے ہوئے ہیں قطع نظر تشبیہات کے مرزا ہر ایک بات میں جیسا کہ پہلے حصے میں بیان ہو چکا ہے ابتذال سے بہت بچتے تھے مبتذل مضامین، مبتذل تشبیہیں مبتذل ترکیبیں، حسبقدر اُنکے کلام میں کم ملیں گی ظاہرا کسی ریختہ گو شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتیں۔ مثلاً صل علےٰ کا لفظ جو بجاے سبحان اللہ وغیرہ کے استعمال ہوتا ہے۔ اُسکو کبھی جائز نہیں رکھتے تھے، یہاں تک کہ شاگردوں کی غزل میں بھی ہمیشہ اس لفظ کو کاٹ کر نامِ خدا یا کوئی اور لفظ بنا دیتے تھے۔

اسی طرح جو محاورے یا الفاظ صرف عوام الناس کی زبان پر جاری ہیں اور خواص اُنکو کبھی نہیں بولتے۔ تا بمقدور وہ اُنکو استعمال نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک ایسا التزام کرنے سے زبان کا دائرہ نہایت تنگ ہو جاتا ہے اور لٹریچر کو وسعت دینا جو شاعری کا اصل مقصد ہونا چاہئیے وہ فوت ہو جاتا ہے مگر مرزا کے کلام میں جو خصوصیتیں ہمکو معلوم ہوئی ہیں اُن کا بیان کرنا ضرور ہے۔

دوسری خصوصیت دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مرزا نے استعارہ وکنایہ وتمثیل کو جو کہ لٹریچر کی جان اور شاعری کا ایمان ہے، اور جسکی طرف ریختہ گو شعرا نے بہت کم توجہ کی ہے۔ ریختہ میں بھی نسبتہً اپنے فارسی کلام سے کم استعمال نہیں کیا۔ اور شعرا نے استعارے کو صرف محاورات اُردو میں بلا شبہہ استعمال کیا ہے لیکن استعارے کے قصد سے نہیں، بلکہ محاورہ بندی کے شوق میں استعارے بلا قصد اُنکے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ یہاں چند مثالیں مرزا کے کلام سے نقل کیجاتی ہیں

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا (مثال) بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یہاں اس مطلب کو۔ کہ معشوق نے آن کی آن اپنی صورت دکھادی تو اس سے کیا تسلی ہو سکتی ہے اس طرح ادا کیا ہے "بجلی کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا"

۱؎ مرزا کہتے تھے کہ حرف جار بغیر مجرور کے بولنا ایک عامیانہ اور سوقیانہ بول چال ہے۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز (مثال) پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا"
دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی اور جو اُسکے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے اُس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہے اُسکو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا۔ ایسے بلیغ شعر اُردو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گزرتی ہے۔ ان مصرعوں میں اُسکی تصویر کھینچدی ہے۔ جس سے بہتر کسی اسلوب بیان میں یہ مضموں ادا نہیں ہو سکتا۔

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ (مثال ۲) دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اسقدر ہے کہ انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے (مثال ۳) اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
جو مطلب اس طریقے سے ادا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہمکو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر لیا تھا۔

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں (مثال ۴) جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا
دوسرے مصرع میں یہ مضمون ادا کیا گیا ہے کہ جب مشکلات نے نہیں گھیرا تھا اُس وقت اُنکے دفع کرنیکی طاقت تھی

ان اشعار میں جیسا کہ ظاہر ہے اصل خیالات سیدھے سادے ہیں، مگر استعارے اور تمثیل نے ان میں ندرت اور طرفگی پیدا کردی ہے۔

تیسری خصوصیت | تیسری خصوصیت کیا ریختہ میں اور کیا فارسی میں، کیا نثر میں کیا نظم میں؛ باوجود سنجیدگی و متانت کے شوخی و ظرافت ہے، جیسا کہ مرزا کے انتخابی اشعار سے ظاہر ہوگا۔ مرزا سے پہلے ریختہ گو شعرا میں دو شخص شوخی و ظرافت میں بہت مشہور گزرے ہیں، ایک سودا دوسرے انشا، مگر دونوں

کی تمام شوخی وخوش طبعی ہجوگوئی یا فحش وہزل میں صرف ہوئی - بخلاف مرزا غالب کے کہ انھوں نے ہجو یا فحش وہزل سے کبھی زبان قلم کو آلودہ نہیں کیا-

چوتھی خصوصیت چوتھی خصوصیت مرزا کی طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی گئی ہے، اور جسکو مرزا اور دیگر ریختہ گویوں کے کلام میں مابہ الامتیاز کہا جاسکتا ہے - انکے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلودار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں اُس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنے کے بعد اُس میں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں - جن سے وہ لوگ - جو ظاہری معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں لطف نہیں اُٹھا سکتے یہاں ایسے اشعار کی چند مثالیں لکھی جاتی ہیں-

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے (مثال) دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اسقدر ویران ہے کہ اُسکو دیکھکر گھر یاد آتا ہے! یعنی خوف معلوم ہوتا ہے- مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی، مگر دشت بھی اسقدر ویران ہے کہ اسکو دیکھکر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے-

کون ہوتا ہے حریف مَیِ مردافگنِ عشق (مثال ۲) ہے مکرر لب ساقی میں صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں مردافگن عشق کا ساقی - یعنی معشوق - بار بار صلا دیتا ہے، یعنی لوگوں کو شراب عشق کی طرف بلاتا ہے - مطلب یہ کہ میرے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا، اسلیے اُسکو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوتی ہے - مگر زیادہ غور کرنے کے بعد جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے - اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں-

اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرع ہی ساقی کے صلا کے الفاظ ہیں، اور اس مصرع کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں پڑھتا ہے "کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق یعنی کوئی ہے جو مے مرد افگن عشق کا حریف ہو؟ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرع کو مایوسی کے لہجے میں مکرر پڑھتا ہے کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق یعنی کوئی نہیں ہوتا۔

اس میں لہجہ اور طرز ادا کو بہت دخل ہے۔ کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے، اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرع مذکور کی تکرار کروگے تو یہ معنی ذہن نشین ہو جائیں گے۔

کیونکہ اس بت سے رکھوں جان عزیز (مثال ۲) کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اسکے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لیگا۔ اسلئے جان کو عزیز نہیں رکھتا۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہے، پھر اس سے جان کیونکر عزیز رکھی جاسکتی ہے

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند (مثال ۳) گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

اسکے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اسکو گوارا نہ ہوتی، اور یا اب ہمکو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے۔ اور دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدم اور فرشتوں کے اس قصے کی طرف اشارہ ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہے، کہ جب خدا تعالیٰ نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا کیا تو دنیا میں اس شخص یعنی اس نوع۔ کو پیدا کرنا چاہتا ہے "جو اس میں فساد اور خونریزی کرے؟" وہاں سے ارشاد ہوا کہ "تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں" اور پھر آدم سے انکو زک دلوائی، اور حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ کہتا ہے کہ آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں کل تک تو ہماری ایسی عزت تھی۔

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم (مشاق) قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
اسکے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سروِ قامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے۔ اور دوسرے یہ معنی بھی ہیں کہ تیرا قد اُسی میں سے بنایا گیا ہے اسلیے وہ ایک قدِ آدم کم ہوگیا ہے۔

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا (مشاق) ہنسکے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہمکو
اس شعر میں "ترے سر کی قسم ہے ہمکو" اس جملہ کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ ترے سر کی قسم ہے ہم ضرور سر اُڑائینگے۔ اور دوسرے یہ کہ ہمکو ترے سر کی قسم ہے۔ یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اُڑائیں گے۔ جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے ہاں کھانے کی قسم ہے۔ یعنی کبھی ہمارے ہاں کھانا نہیں کھاتے۔

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ (مشاق) جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو
اسکا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تمکو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں، تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو۔

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا (مشاق) بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
"ہمارے بھی منہ میں زبان ہے" اس میں دو معنی رکھے ہیں، ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اگر بولنے پر آئے تو تم کو قائل کر دینگے، اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھ کر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا یا نہیں۔

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے (مشاق) دیکھوں اب مرگئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے
"کون اٹھاتا ہے مجھے" اسکے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی میں تو مجھے محفل سے اُٹھا دیتے تھے اب مرنے کے بعد دیکھوں مجھے وہاں سے کون اٹھاتا ہے؟ اور

دوسرے معنی یہ ہیں کہ محفل سے تو اُٹھا دیتے تھے دیکھوں اب میرا جنازہ کون اُٹھاتا ہے۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر (مثال) بادہ نوشی ہے بادپیمائی

یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے۔ اس میں بادپیمائی کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دیے ہیں، بادپیمائی عبث کام کرنے کو کہتے ہیں، پس ایک معنی تو اُسکے یہ ہیں کہ فصل بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اُسمیں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ اور جبکہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض بادپیمائی یعنی فضول کام ہے۔ اس صورت میں بادہ نوشی مبتدا ہوگا، اور بادپیمائی خبر۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ بادپیمائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے، اور جس طرح بادپیمائی کے معنی بادہ خواری کے ہیں اسی طرح بادپیمائی کے معنی ہوا کھانے کے لیے جائیں۔ اس صورت میں یہ مطلب نکلیگا کہ آجکل ہوا کھانا بھی شراب پینا ہے۔

مذکورۂ بالا خصوصیتوں کے علاوہ ایک اور بات قابل ذکر ہے جو مرزا اور اُنکے بعض معاصرین و متبعین کی غزل میں عموماً پائی جاتی ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ ریختہ کی بنیاد فارسی غزل پر رکھی گئی ہے جو جذبات اور خیالات اہل ایران نے غزل کے پیرائے میں ظاہر کیے ہیں ریختہ گویوں نے زیادہ تر بلکہ بالکل اُنھیں کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ پس جو انقلاب ایک مدت کے بعد فارسی غزل میں پیدا ہوا۔ ضرور تھا کہ وہی انقلاب اُردو غزل میں ایک عرصے کے بعد پیدا ہو۔ قدمائے اہل ایران جنکا دور مولانا جامی پر ختم ہوتا ہے اُنکی غزل میں جو جذبات و خیالات بیان ہوئے ہیں وہ اپنی نیچرل حالت سے متجاوز نہیں ہوئے، اور گو اسالیب بیان میں تلاحق افکار کے سبب رفتہ رفتہ بہت وسعت اور لطافت پیدا ہو گئی لیکن بیان کا طریقہ نیچرل سادگی کی حد سے آگے نہیں بڑھا مگر چونکہ خیالات نہایت محدود تھے ایک مدت کے

بعد جتنے سیدھے سادے عمدہ اور لطیف اسلوب تھے وہ سب نبڑ گئے اور متاخرین کے لیے ایک چھوڑی ہوئی ہڈی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ اگر متاخرین غزل کو ہر قسم کے خیالات ظاہر کرنے کا آلہ بناتے تو اُنکے لیے میدان غیر متناہی موجود تھا مگر اُنھوں نے محدود دائرے سے باہر نکلنا نہ چاہا، اب جو لوگ تقلید کی زنجیروں میں جکڑے ہوے تھے اُنھوں نے تو اسی چھوڑی ہوئی ہڈی پر قناعت کی، مگر جن کی فطرت میں اُرجنٹیلی اور اُپج کا مادہ تھا وہ اُنھیں قدیم خیالات وجذبات میں اپنے اپنے مبلغ فکر کے موافق نزاکتیں اور لطافتیں پیدا کرنے لگے چنانچہ نظیری، ظہوری، عرفی، طالب، اسیر، اور اُنکے اقران وامثال کی غزل میں بمقابلہ سعدی، حافظ، خسرو وغیرہم کی غزل کے ہم اسی قسم کا تفاوت پاتے ہیں مثلاً خواجہ حافظ کہتے ہیں :-

گناہ اگرچہ نہ بود اختیارِ ما حافظ تو در طریقِ ادب باش وگو گناہِ من است

نظیری نے اسی مضمون کو حقیقت سے مجاز میں لاکر اُس میں ایک نئی طرح کی نزاکت پیدا کی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

تا منفعل ز رنجش بیجا نہ بینمش می آرم اعترافِ گناہِ نبودہ را

یا مثلاً دوسری جگہ خواجہ حافظ کہتے ہیں۔

از عدالت نہ بود دُور گرش پرسد حال پادشاہے کہ بہ ہمسایہ گدائے دارد

ظہوری کے ہاں یہ سیدھا سادہ خیال ابراہیم عادل شاہ کے حق میں جو کہ اُسکا ممدوح بھی ہے اور محبوب بھی۔ ایک نئے انداز سے بندھا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

مروت کردہ شبہا بر تو سیر بام و در لازم نمی باشد چراغے۔ خانۂ بے دستگاہاں را

یعنی چونکہ بمقدور لوگوں کے گھر میں چراغ نہیں ہوتا۔ اسلیے مروت اور کرم نے تجھ پر لازم کر دیا ہے راتوں کو کوٹھے پر چڑھکر ٹہلا کرے تاکہ تیرے چہرے کی

روشنی سے اُنکے گھر میں چاندنا ہو جائے مطلب یہ کہ انکے حال سے واقف ہو کر انکی مدد کرے۔

مگر یہ انقلاب فارسی غزل میں کم و بیش چار سو برس بعد ظہور میں آیا تھا کیونکہ نئی طرز اُس وقت تک ایجاد نہیں ہوئی جب تک ضرورتیں اہل فن کو سخت مجبور نہیں کرتیں۔ لیکن ریختہ میں یہ انقلاب ڈیڑھ سو برس کے اندر اندر پیدا ہو گیا ہے، کیونکہ متاخرین اہل ایران کا نمونہ موجود تھا اسلیئے نئی نئی طرز کے ایجاد کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ جو طرز فارسی میں متاخرین نکال چکے تھے اسی کو ریختہ میں ڈھالنا تھا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا غالب نے سب سے پہلے یہ طرز اختیار کی تھی، کیونکہ جس طرح کیمسٹری کے مدوّن ہونے اور علم کے درجے پر پہنچنے سے پہلے اُسکے متفرق اصول مشرقی ملکوں میں بھی پائے جاتے تھے اسی طرح مرزا سے پہلے بھی بعض شعرا کے کلام میں اس نئی طرز کی کہیں کہیں جھلک سی نظر آجاتی ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اوّل مرزا نے اور انھیں کی تقلید سے مومن، شیفتہ، تسکین، سالک، عارف، داغ، وغیرہم نے اس طرز کو بہت زیادہ رواج دیا خصوصاً مومن خاں مرحوم اس خصوصیت میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے ہیں۔ یہاں ایسی ایک دو مثال لکھنی مناسب معلوم ہوتی ہے جس سے ناظرین بخوبی سمجھ جائیں کہ متاخرین کے اس خاص گروہ نے قدما کے سیدھے سادے خیالات اور معمولی اسلوبوں میں کس قسم کی نزاکتیں اور لفظی و معنوی تصرفات کر کے اُن میں ندرت اور طرفگی پیدا کی ہے۔ مثلاً میرتقی کا شعر ہے۔

میری تغیر رنگ پر مت جا ‌‌ ‌ اتفاقات ہیں زمانے کے

اسی تغیر رنگ کو مومن خاں نے اس طرح باندھا ہے۔

میری تغییر رنگ کو مت دیکھ	تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

یا مثلاً خواجہ میر درد نے معشوق کے رُخ روشن کو شمع پر اس طرح ترجیح دی ہے

رات مجلس میں ترے حُسن کے شعلے کے حضور	شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

نواب مرزا خاں داغ نے اسی مضمون میں نئی طرح کی نزاکت پیدا کی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

رُخ روشن کے آگے شمع رکھکر وہ یہ کہتے ہیں	اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

الغرض اس قسم کی معنی آفرینیاں، غالب مومن، اور انکے متبعین کے کلام میں بہت پائی جاتی ہیں۔ چونکہ اس موقع پر صرف مرزا کے کلام پر بحث کرنی مقصود ہے اسلیے چند شعر مرزا کی غزلیات میں سے اسی قبیل کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں	رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ۔ دیکھو جرم کسکا ہے	نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

کرنے لگا ہے باغ میں تو بے حجابیاں	آنے لگی ہے نکہتِ گُل سے حیا مجھے

ضد کی ہے اور بات مگر خو بُری نہیں	بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے	میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

اُسکی بزم آرائیاں سنکر دل رنجور یاں	مثل نقش مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

نقش کو اُسکے۔ مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں	کھینچتا ہے جسقدر اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے	یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوے

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم	لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی	موت آتی ہے پر نہیں آتی

پہلے شعر میں خون کا رنگ ہو کر اُڑ جانا، دوسرے میں عاشق کے جذبے اور

معشوق کی کشیدگی سے کشاکش کا لازم آنا، تیسرے میں نکہت گل سے حیا آنی، چوتھے میں بھولے سے سیکڑوں وعدے وفا کرنے، پانچویں میں آپ اپنے پر رشک آنا، چھٹے میں دل رنجور کا نقش مدعائے غیر کی طرح بیٹھا جانا، ساتویں میں کھینچنے سے نقش کا مصور سے کھنچنا، آٹھویں میں مٹتے مٹتے آپ اپنی قسم ہو جانا، نویں میں آپ اپنی ہمتِ عالی کے ہاتھ بک جانا، دسویں میں باوجود موت کے موت نہ آنی۔ یہ سب متاخرانہ نزاکتیں ہیں، جو ولی سے لیکر میر، سودا اور درد تک کے کلام میں نہ تھیں، اور اگر تھیں تو صرف اسقدر جیسے آٹے میں نمک۔

اگرچہ ایران میں زمانۂ حال کے شعرا ظہوری و عرفی، و طالب و اسیر وغیرہ کی طرز کو ناپسند کرتے ہیں اور ہندوستان میں روز بروز طبیعتیں نیچرل شاعری کی طرف مائل ہوتی جاتی ہیں۔ جسکا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ رفتہ رفتہ اس قسم کے تکلفات اور نزاکتیں نظروں سے گر جائیں۔ لیکن یہ سب زمانے کے مقتضیات ہیں جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ ایسی باتوں سے اُن لوگوں کی اُستادی اور گرانمائگی میں کچھ فرق نہیں آتا جنکو نئی طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل تھا۔

بہرحال جو نسبت ظہوری، نظیری، عرفی، طالب، اسیر، وغیرہم کے کلام کو سعدی، خسرو، حافظ اور جامی کے کلام سے ہے تقریباً وہی نسبت مرزا کے ریختہ کو میر، سودا اور درد کے ریختہ سے سمجھنی چاہئے۔ قدما اردو روزمرہ او صفائی بیان کو سب باتوں سے زیادہ اہم اور مقصود بالذات جانتے تھے، برخلاف متاخرین کے کہ وہ ہر شعر میں ایک نئی بات پیدا کرنے اور اسالیب بیان میں نئے نئے تعجب انگیز اور لطیف و پاکیزہ اختراعات کرنے ہی کو کمالِ شاعری سمجھتے تھے اور زبان کی صفائی اور روزمرہ کی نشست کو محض خیالات کے ظاہر کرنے کا ایک آلہ (نہ کہ مقصودِ شاعری) تصور کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا ایک دوست کو خط میں لکھتے

ہیں کہ بھائی! شاعری، معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں ہے۔"

اگرچہ مرزا کی اُردو شاعری پر بحث کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے۔ لیکن چونکہ لوگوں کو ایسی باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے اسلیے ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں اور صرف اس بات پر اکتفا کرتے ہیں کہ مرزا کے دیوانِ ریختہ میں جسقدر اشعار سرسری نظر میں ممتاز معلوم ہوں وہ بطور انتخاب کے یہاں نقل کر دے جائیں۔ جو اشعار اس سے پہلے مثالوں میں لکھے جا چکے ہیں ان کو اب مکرر نہ لکھیں گے اور جہاں ضرورت ہوگی شعر کے معنی بھی بتائیں گے اور کہیں کہیں محاسن شاعری کی طرف بھی اشارہ کیا جائیگا۔

ستائشگر ہے زاہد اسقدر جس باغِ رضواں کا (رندانہ) وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

طاقِ نسیاں وہ طاق جسمیں کچھ رکھکر بھول جائیں۔ طاقِ نسیاں کا گلدستہ وہ گلدستہ جسکو طاق میں رکھکر بھول جائیں۔ بیخودوں کے بہشت کو گلدستۂ طاقِ نسیاں سے تشبیہ دینا بالکل ایک نرالی تشبیہ ہے جو کہیں نہیں دیکھی گئی۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہاے راز کا (تصوف) یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یعنی راز کے نغموں سے تو خود ہی ناآشنا ہے، ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں وہ بھی پردہ ساز کی طرح بول رہے اور بج رہے ہیں اور اسرارِ الٰہی ظاہر کر رہے ہیں

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب (عاشقانہ) خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

یعنی آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے کہ گویا جگر میں جتنا خون تھا وہ مژگانِ یار کی امانت تھی، اور اسلیے اُسکے ایک ایک قطرے کا حساب اسی طرح دینا پڑیگا جس طرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح (عاشقانہ) کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا (تصوف) جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب (ظرافت) تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا
سُنا ہے کہ جسوقت یہ غزل مرزا نے بادشاہ کو سُنائی تو بادشاہ نے مقطع سنکر کہا بھئی
ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے،، مرزا نے کہا حضور تواب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر
یہ اسلیے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں "

نہ مارا جان کر بیجرم قاتل تیری گردن پر (عاشقانہ) رہا مانند خونِ بے گنہ حق آشنائی کا
کہتا ہے کہ تو نے ایک مشتاقِ قتل کو بے جرم سمجھکر اسلیے قتل نہیں کیا کہ خون بیگناہ
اپنی گردن پر نہ لے مگر اب تیری گردن پر بجائے خون بیگناہ کے حق آشنائی کا رہیگا
سب کے دلمیں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا (عاشقانہ) مجھپہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ (شوخی) بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
کہتا ہے کہ میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اُس سے مجھکو سوا نقصان کے کچھ
فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں ہے بلکہ عبودیت ہے۔ بندگی پر
نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔

جان دی۔ دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
غم فراق میں تکلیف سیر گل مت دو مجھے دماغ نہیں خندہا ے بیجا کا
خندۂ گل کو خندۂ بیجا اسلیے کہا ہے کہ وہ کچھ سمجھکر یا ازراہ تعجب نہیں ہنستا۔
پس گویا اُسکا خندہ بے محل ہے۔

میں۔اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں (توبہ) گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا
یعنی اُس نے زبردستی کیوں نہ پلادی؟

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا (عاشقانہ) بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
تنگیِ دل کا گلا کیا یہ وہ کافر دل ہے (حقیقت دل) کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق (شوخی) آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

یعنی ہمارے جرم کے ثبوت کے لیے کسی کی شہادت ہونی ضرور ہے، صرف فرشتوں کا لکھنا کافی نہیں ہے۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم (عاشقانہ) مَیں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک (دو صلہ آزمانہ) میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کہتا ہے کہ گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اسقدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی خشک ہو گیا مگر ابھی ہمارے دامن کا پلہ تک نہیں بھیگا۔ تذکرہ آب حیات میں لکھا ہے کہ ذوق اس شعر کو نہایت پسند کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ مرزا کو اپنے اچھے شعروں کی خود خبر نہیں ہوتی۔ یہ بعینہ ویسی ہی بات ہے جیسے مولانا آزردہ نے مرزا کا ایک عمدہ شعر سنکر اسکی تعریف کرتے وقت کہا تھا کہ "اس میں مرزا کا کمال ہے یہ تو ہمارے انداز کا شعر ہے" غرضکہ ایک ہمعصر دوسرے ہمعصر کی تعریف بھی کرتا ہے تو اس میں ایک نہ ایک بات ضرور ایسی شامل کر دیتا ہے جس سے یا اسکی تنقیص لازم آئے یا اپنی تعریف اس سے بھی زیادہ نکلے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے (عاشقانہ) صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

مرنے کی اے دل اور تدبیر کر کہ میں (عاشقانہ) شایانِ دست و بازوِ قاتل نہیں رہا

رشک کہتا ہے کہ اُسکا غیر سے اخلاص حیف (عاشقانہ) عقل کہتی ہے کہ وہ بیمہر کس کا آشنا

ذکر اُس پریوش کا اور پھر بیاں اپنا (رقابت) بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

کہتا ہے کہ مَیں نے جو معشوق کے حسن کی تعریف کی تو جو شخص میرا محرم راز اور ہمنشیں تھا وہی سُنکر میرا رقیب بن گیا، کیونکہ اول تو ایسی پریوش کی تعریف تھی اور وہ بھی مجھ جیسے جادو بیان کی زبان سے۔ پہلے مصرع کا دوسرا رکن یعنی "اور پھر بیان اپنا" سارے شعر کی جان ہے جسکی خوبی بغیر ذوقِ سلیم کے معلوم نہیں ہو سکتی۔

دے وہ جسقدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے (ظرافت) بارے آشنا نکلا انکا پاسباں اپنا

یعنی خوب ہی ہوا کہ معشوق کے در کا پاسباں ہمارا جان پہچان نکلا، اب ہمارے لیئے اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ جسقدر چاہے ہم کو ذلت دے ہم اُس کو ہنسی میں ٹالتے رہیں گے، اور یہ ظاہر کرینگے کہ ہمارا قدیم آشنا ہے! ہمارا اُسکا قدیم سے یہی برتاؤ ہے۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے (شکوۂ چرخ) بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسمان اپنا

آسمان کی دشمنی کے کیا خوب اسباب بتائے ہیں اور اپنی دانائی و ہنرمندی کس خوبصورتی سے ثابت کی ہے۔

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم (عاشقانہ) تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

یعنی اگر نالے کی، اجازت نہ ہوگی تو ہم اُسکو ضبط کرینگے اور اُسکا اثر تجھ تک پہنچیگا۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں (لاجبر) ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ (شوخی) مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

دکھلائیں کا مرجع خدا کو ٹھہرایا ہے۔ کہتا ہے عمر بھر موت کا منتظر رہا کہ وہ حالت زندگی سے ضرور بہتر ہوگی اب دیکھیے مرنے کے بعد کیا حالت دکھاتے ہیں جسکا تمام عمر منتظر رکھا ہے۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے (توحید) شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل (توحید) جہاں ساقی ہو تو دعویٰ ہے باطل ہوشیاری کا

یعنی ساحل لاکھ اپنے تئیں بچائے مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعویٰ چل نہیں سکتا۔ یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا (تصوف) درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یعنی جب درد حد سے گزر جائیگا تو مر جائینگے یعنی فنا ہو جائینگے۔ گویا قطرہ دریا

میں کھپ جائیگا۔ اور یہی اُسکا مقصود ہے۔ پس درد کا حد سے گزر جانا یہی اس کا دوا ہو جانا ہے۔

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد (عاشقانہ) تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا (عاشقانہ) باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال (عاشقانہ) ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا (عاشقانہ) روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

یعنی غمِ فرقت میں روتے روتے تمام ہو جانا میرے نزدیک ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا۔ یہ بالکل نرالی تشبیہ ہے۔

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب (عاشقانہ) یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن (شوخی) جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات (شوخی) سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ (عاشقانہ) ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھکر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ (قدرِ سخن گمی) لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھکر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں (رضا) جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھکر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا (عاشقانہ) یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھکر

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات (شکوہ ابنائے زمان) دے اور دل اُنکو جو نہ دے مجھکو زباں اور

یہ شعر بظاہر معشوق کے حق میں معلوم ہوتا ہے مگر اس میں درپردہ ان لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو مرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہتے تھے۔

ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں (تصوف) ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

اس شعر میں سارا زور ہم کے لفظ پر ہے یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے اُسوقت تک راہِ معرفتِ الٰہی میں ایک اور سنگِ گراں سدِّ راہ ہے۔ پس اگر ہم نے بت

توڑنے میں سبکدستی حاصل کی ہے تو کیا فائدہ؟ یہ بڑا بھاری بت یعنی ہستی تو ابھی موجود ہے۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھجاتے ہیں نالے ۔ رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

نالے یعنی ندی نالے۔ نہ آہ و نالے۔ مثال کسقدر مثل لہ کے مطابق ہے اور مضمون کتنا مطابق واقع کے ہے۔ فی الحقیقت مصیبت اور رنج و تکلیف کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت رکتی ہے اسی قدر زیادہ راہ دیتی ہے خصوصاً جو مضمون وہ اسوقت اپنے حسب حال لکھتا ہے وہ نہایت موثر اور دردانگیز ہوتا ہے۔

فلک سے ہمکو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے (غلط فہمی) ۔ متاع بردہ کو سمجھے ہوے ہیں قرض رہزن پر

متاع بردہ یعنی لوٹی ہوئی متاع۔ یہ مضمون بھی بالکل وقوعیات میں سے ہے جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہوجاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم و ستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں اور اخیر دم تک اسباب کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا اور ہمارا اقبال پھر عود کریگا۔

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے ۔ انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

یعنی تمام دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ عشق و محبت کی بدولت ہے خواہ زن و فرزند کی محبت ہو خواہ مال و دولت کی، خواہ ملک و ملت کی خواہ اور کسی چیز کی۔ پس اگر خرمن میں برق یعنی دلوں میں محبت نہیں تو اس کی مثال اس انجمن کی ہے جس میں شمع کی روشنی نہیں۔

زخم سلوانے سے مجھپر چارہ جوئی کا ہے طعن ۔ (عاشقانہ) غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشت خس کہ گلخن میں نہیں

شکوہ اہل وطن

اپنے تئیں خس یعنی پھونس وغیرہ سے اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہے یعنی جس طرح پھونس گلخن میں ہوتا ہے تو جلتا ہے اور گلخن میں نہیں ہوتا تو اسکی کچھ قدر نہیں ہوتی یہی حال میرا ہے کہ وطن میں تھا تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بےقدر ہوں۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جسوقت (عاشقانہ) میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

زہر ملتا ہے نہیں مجھکو ستمگر۔ ورنہ (عاشقانہ) کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

جب کہتے ہیں کہ اسکو فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو اسکے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اسکو اُس کام کے کرنے سے انکار ہے۔ پس عاشق معشوق کے ملنے کی قسم کیونکر کھا سکتا ہے۔ کہتا ہے کہ زہر کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ اسکو کھا نہ سکوں مگر چونکہ وہ ملتا نہیں اسلیے نہیں کھا سکتا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں (رندانہ) رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا (معاملہ) پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی (شوخی) آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی (فخریہ) روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

یہاں ہمزبان کے لفظ میں ایہام ہے۔ ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ انسان اور فرشتے کی زبان ایک نہیں ہو سکتی اور در پردہ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح میری زبان ہے ویسی روح القدس کی نہیں

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں (عاشقانہ) ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

چکر پھرنے کی وحشت۔ کہتے ہیں، اُسکے پاؤں میں چکر ہے۔ یعنی اُسکو پھرنے کی وحشت ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی تدبیر مجھے دشت نوردی سے روک نہیں سکتی۔ بس زنجیر جو اس غرض سے میرے پاؤں میں ڈالی گئی ہے اُسے زنجیر نہ سمجھو

بلکہ چیلا سمجھو۔

(عاشقانہ)
حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے　　جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

جادہ یعنی پیٹا کو دمِ شمشیر سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار و تکلیف میں جو لذت ہے جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس لذت سے خوب دل کھول کر متمتع ہوں، مگر چونکہ وفا کی راہ سراسر تلوار کی دھار پر ہے اسلیے پہلے ہی قدم پر موت نظر آتی ہے۔ پس افسوس ہے کہ لذتِ آزار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے۔

(عاشقانہ)
الفتِ گل سے غلط ہے دعوی وارستگی　　سرو ہے با وصف آزادی گرفتارِ چمن

مطلب یہ ہے کہ کوئی کیسا ہی آزاد وارستہ مزاج ہو دنیا میں عشق و محبت کے پھندے سے نہیں چھوٹ سکتا۔

(تعریف)
ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود　　قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں۔

قبلے پر قبلہ نما کا اطلاق ظاہرا مرزا کے سوا کسی نے نہیں کیا۔

(عاشقانہ)
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے　　ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں

بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں، خواہ پوشیدہ مصلحت ہو، اور خواہ پوشیدہ قباحت ہو۔ یہاں پوشیدہ قباحت مراد ہے۔ اگر مرجانے کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہوتا تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت کے ہو جاتے۔

(عاشقانہ)
کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ　　ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

یہ شعر سہل و ممتنع ہے۔ اس زمین میں اس سے بہتر شعر نکالنا مشکل ہے۔

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں　　یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

یعنی آج اس خوف سے شراب نہ دینی کہ کل نہ ملیگی ساقی کوثر کی فیاضی پر سوءِ ظن کرنا ہے۔

(عاشقانہ)
آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں ۔ تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیںگے جواب میں ۔ قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں

دوسرے مصرع میں بطور طنز کے کہتا ہے کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے مجھے معلوم ہے یعنی وہ کچھ نہیں لکھنے کے۔ اسلئے قاصد کے واپس آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ رکھوں۔

مجھ تک کب اُنکی بزم میں آتا تھا دور جام ۔ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے "پھر آج جو خلاف عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے" اس حذف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے ایسا حذف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو اور جو الفاظ حذف کیے گئے ہیں وہ بغیر ذکر کیے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہوں محسنات شعر میں شمار کیا جاتا ہے۔

لاکھوں لگاؤ ایک چُرانا نگاہ کا ۔ لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

یہاں لگاؤ سے مراد لگاوٹ ہے، یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اس کا التفات اور میلان طبع پایا جائے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ لاکھوں لگاؤٹیں ایک طرف اور ایک نگاہ کا چرانا ایک طرف اور اسکے لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف، اور ایک عتاب میں بگڑنا ایک طرف۔ یہ شعر بھی سہل و ممتنع ہے۔ اگر الفاظ کی طرف دیکھیے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر ایسے دو ہم پلہ مصرعے بہم پہنچ گئے جن میں حسن ترصیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے اور اگر معنی پر نظر کیجئے تو ہر ایک مصرع میں ایک ایسا معاملہ باندھا گیا ہے جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ گزرتا رہتا ہے معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لئے بہت بڑی چیز ہے، مگر اُسکا آنکھ چرانا جو لگاوٹ کی ضد ہے۔ وہ عاشق کی نظر میں لگاوٹ سے بہت زیادہ دلفریب

ودلآویز ہوتا ہے۔ اسی طرح بناؤ سنگار سے معشوق کا حُسن بیشک دوبالا ہو جاتا ہے مگر اُسکا غصے میں بگڑنا اسکے بناؤ سے بہت زیادہ خوشنما اور دلربا معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر کے متعلق یہ سب ظاہر اور اوپری باتیں ہیں جو ہم لکھ رہے ہیں، اسکی اصل خوبی وجدانی ہے جسکو صاحب ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

ایک روز مولانا آزردہ مرحوم کے روبرو کسی نے یہ شعر پڑھا چونکہ مولانا نہایت صاف اور سریع الفہم اشعار کو پسند کرتے تھے، اسلیے مرزا کا کلام سنکر اکثر اُلجھتے تھے اور انکی طرز کو ہمیشہ نام رکھتے تھے۔ مگر اس روز اس شعر کو سنکر وجد کرنے لگے اور متعجب ہوکر پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے؟ کہا گیا مرزا غالب کا۔ چونکہ وہ مرزا کے شعر کی کبھی تعریف نہیں کرتے تھے، اور اُس روز لاعلمی میں بیساختہ اُنکے منہ سے تعریف نکل گئی تھی، غالب کا نام سنکر بطور مزاح کے جیسی کہ اُن کی عادت تھی فرمایا "اس میں مرزا کی کیا تعریف ہے یہ تو خاص ہماری طرز کا شعر ہے"۔ مگر فی الحقیقۃ یہ شعر بھی معناً و لفظاً ویسا ہی اچھوتا اور نرالا ہے جیسا کہ مرزا کا تمام کلام کسی کے کلام سے میل نہیں کھاتا جہاں تک ہمکو معلوم ہے یہ اسلوب بیان آج تک اس عمدگی کے ساتھ کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا

انسان کی مجبوری

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اُسکے قابو سے باہر ہو جانا چابک سواروں کی زبان میں اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا اور عمر کو ایسے بیقابو گھوڑے سے تشبیہ دینا حُسن تشبیہ کا حق ادا کر دینا ہے۔

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجود بحر (تصوف) یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

وحدتِ وجود اور اکثر موہوم کی تمثیل ہے۔ قطرہ و موج و حباب سے ہیچ و ناچیز

ہونے کو ایک عام محاورے میں اس طرح ادا کرنا کہ "یہاں کیا دھرا ہے" منتہائے بلاغت ہے۔

(منقبت)
غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست — مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

(عاشقانہ)
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

(سلوک)
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

طالبِ راہِ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے اسکو اس تمثیل میں بیان کیا ہے۔ طالب اول اول جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد و سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے اسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے، اور اسکے ساتھ ساتھ پھرتا ہے۔ پھر جب کوئی اس سے بڑھکر نظر آتا ہے تو اسکا تعاقب کرتا ہے، وَلُم جرًّا۔ اور وجہ اس تذبذب اور تزلزل کی یہی تو ہے کہ وہ کاملین کو پہچان نہیں سکتا۔

(تصوف)
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
(شکوہ اہل وطن)
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

(عالی ظرفی)
دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا — یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اپنی فراخ حوصلگی اور اُسکے ساتھ شرافتِ نفس کا اظہار ہے، یعنی میں جو دونوں جہاں لیکر خاموش ہو رہا اسکا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ان پر قانع ہوگیا بلکہ مجھکو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے سے شرم آئی اسلیے خاموشی اختیار کی۔

(تصوف)
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

(شوخی)
میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی — سنکے ستم ظریف نے مجھکو اُٹھا دیا کہ یوں

ستم ظریف۔ وہ ظریف جسکی ظرافت کے ساتھ ظلم بھی ملا ہوا ہو۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میں نے تو رقیب کو غیر سمجھکر کہا تھا کہ آپ کی محفل غیر سے خالی ہونی چاہیے

اُس لئے یہ سنکر مجھے بزم سے اُٹھوا دیا، یعنی یہاں ایک تو ہی غیر نظر آتا ہے۔

ہوگئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر (عاشقانہ) عشق کا اُسکو گماں ہم بیزبانوں پر نہیں
قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا (عاشقانہ تعجب) تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے (عاشقانہ) کبھی ہم انکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اپنے گھر میں معشوق کے آنے سے جو تعجب اور حیرت ہوئی ہے دوسرے مصرع میں اُسکی کیا عمدہ تصویر کھینچی ہے یعنی کبھی معشوق کو دیکھتا ہے اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے کہ اس گھر میں اور ایسا شخص وارد ہوا!!

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں (شوخی) کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہمیں کیا کام (شکایت) دیا ہے ہمکو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لیے (شکایت) لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے (شکایت) آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں (تناسخ) خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں
قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر (انتظار) لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

یعقوب کی آنکھوں کو روزنِ دیوار زنداں قرار دیا ہے کیونکہ جس طرح روزنِ زنداں ہر وقت یوسف پر کشادہ رہتا تھا اسی طرح یعقوب کی آنکھیں شب و روز یوسف کی طرف نگراں رہتی ہیں۔

نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے راتیں اُسکی ہیں (عاشقانہ) جسکے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار (عاشقانہ) جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

نگاہوں کے مژگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم و حیا کے سبب اوپر نہیں اٹھتیں بلکہ پلکوں کی طرح ہر وقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں۔

واں گیا بھی میں تو انکی گالیوں کا کیا جواب (شوخی) یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

یعنی اب نئی دعا کوئی ذہن میں باقی نہیں رہی اور وہی مستعمل دعائیں جو دربان کو دے چکا ہوں دوست کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس شعر میں جو اصل خوبی اور لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ہونا ظاہر کرتا ہے کہ گویا اسکو ہر شخص ضروری جانتا ہے، کیونکہ سب سے حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ بتاؤ اُنکی گالیوں کا کیا جواب دونگا جب کہ دعائیں سب نبڑ چکیں۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم (تصوف) ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے جنکا ترک کرنا اور مٹانا موحد کا اصل مذہب ہے، اور کہتا ہے کہ یہی ملتیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجزائے ایمان بنجاتی ہیں

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا (تصوف) دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز (تصوف) آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

حقیقت و مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں (ناگزیری غم) موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو (اخلاق) کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

یہ محض خیالی مضمون نہیں ہے، بلکہ حقیقتِ واقعی کو ایک نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ فی الواقع جب انسان گھر کی چار دیواری میں محصور اور دنیا کے حالات سے ناواقف، اور لوگوں کی ترقی و تنزل کے اسباب سے بیخبر ہوتا ہے، تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا، لیکن جسقدر اُسکا دائرہ تعارف زیادہ وسیع ہو جاتا ہے اُسی قدر اُس پر یہ بات کھلتی جاتی ہے کہ لوگوں کی خوشحالی محض اتفاقی نہیں ہے جسپر حسد و رشک کیا جاوے۔ بلکہ اُنکی

محنت و تدبیر کا نتیجہ ہے، اور اسلیے الطاف و فیاضی اُسکے دل میں پیدا ہوتی ہے
اور خود بھی کوشش و تدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے اور بجائے حسد و رشک کے اور دل
کی ریس و پیروی کرنے میں متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس معقول بات کو ایک محسوس تمثیل
میں بیان کرتا ہے کہ "چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو" جس طرح شعرانے بخیل
کے دل کو تنگ باندھا ہے اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ موصوف کیا ہے

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں (وفاداری) بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسم صواب سے (نکو نامی) ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو
آئی اگر بلا تو جگر سے ٹلے نہیں (متحمل الصعاب) ایرا ہی دیکے ہم نے بچایا ہے کشت کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں (عاشقانہ) کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو
نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا (شکر و صبر وسلامتی) رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید (رندانہ) مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

اس شعر میں ازراہ تہذیب اُس کام کا ذکر نہیں کیا جسکے کرنے کے لیے مسجد و مدرسہ
و خانقاہ کو مساوی قرار دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میکدہ۔ جہاں حریفوں کے
ساتھ شراب پینے کا لطف تھا، جب وہی چھٹ گیا اب مسجد میں ملجائے تو، اور
مدرسہ و خانقاہ میں ہاتھ آجائے تو سب جگہ پی لینی برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص
ازراہ شوخی کے کیگئی ہے، یعنی یہ مقامات جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں
وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے۔ اور شراب پینے کی
تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست (تصوف) لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو
اس شعر کو حقیقت و مجاز دونوں پر محمول کر سکتے ہیں۔
جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا (شکایت) وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

اس دن کی سیاہی کیسی ہوگی جسکے آگے رات بھی دن معلوم ہوتا ہے ۔

یہ کہہ سکتے ہو؟ ہم دل میں نہیں ہیں، پر یہ بتلاؤ (تصوف) کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

اس شعر میں مخاطب معشوق حقیقی ہے ۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو (رندانہ) اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے (عاشقانہ) تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں (عاشقانہ) خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

یعنی جب غم دنیا سے سر اٹھانے کی فرصت ملتی ہے تو سر اٹھاتے ہی آسمان پر نظر جا پڑتی ہے، اور چونکہ وہ جفا پیشہ ہے اسکے دیکھتے ہی تو یاد آجاتا ہے ۔ اب دوسرا غم شروع ہو جاتا ہے غرضکہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں ۔

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا (شوخی) ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

غلط بردار اس کاغذ کو کہتے ہیں جسپر سے حرف باسانی گزلک وغیرہ سے اڑ سکے، اور کاغذ پر اسکا نشان باقی نہ رہے ۔ مگر یہاں از راہ ظرافت غلط بردار کے یہ معنی لیے ہیں جسپر سے حرف غلط خود بخود اڑ جائے ۔ کہتا ہے کہ تو نے اپنے خط میں صرف ایک جگہ حرف وفا لکھا تھا سو وہ بھی مٹ گیا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خط کا کاغذ غلط بردار ہے، کہ جو بات سچے دل سے اس پر نہیں لکھی جاتی وہ خود بخود مٹ جاتی ہے ۔

ہے وہی بد مستیِ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ (تصوف) جسکے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

ہر ذرہ یعنی ہر مخلوق ۔ عذر خواہ معافی چاہنے والا، یا معذور رکھنے والا ۔ اس شعر میں دعویٰ ایسے طریقے سے کیا گیا ہے کہ خود دعویٰ متضمن دلیل واقع ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ ذراتِ عالم یعنی ممکنات جو فی الحقیقت معدوم محض ہیں ۔

انکی بدمستی و غفلت کا عذر خواہ وہی ہے جسکے پرتوِ وجود سے یہ تمام معدومات وجود کا دم بھرتے ہیں۔

پینس میں گزرتے ہیں جو وہ کوچہ سے میرے (عاشقانہ) کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے (عاشقانہ) کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف (شکایت) آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے (عاشقانہ) بے نیازی تری عادت ہی سہی
زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب (شوخی) ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

یہ مضمون تھوڑے سے فرق کے ساتھ فارسی غزل میں بھی مرزا صاحب نے باندھا ہے اور وہ یہ ہے۔

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت
اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے (معاملہ) بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو (معاملہ) دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
غیر کو یارب وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے (معاملہ) گر حیا بھی اُسکو آتی ہے تو شرما جائے ہے

یہ شعر معاملہ کا ہے۔ جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گزرتا ہے، اور شاعرانہ نزاکت دوسرے مصرع میں پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ حیا آنی اور شرما جانا درحقیقت ایک ہی چیز ہے، پھر اسکے کیا معنی کہ حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے، اور شرما جانے کا متعلق اور۔ گر حیا بھی اُسکو آتی ہے "یعنی غیر کی گستاخی اور خواہش بیجا سے۔ اور شرما جاے ہے "یعنی غیر سے یا اُسکے ساتھ تکرار کرنے سے۔

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بنگیا (عاشقانہ) رنگ کھلتا جاے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے
گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے باایں ہمہ (عاشقانہ) ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

بس ہجومِ نااُمیدی خاک میں مل جائیگی (نا امیدی) یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

فردا و دی کا تفرقہ ایک بار مٹ گیا (عاشقانہ) تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

کہتا ہے کہ تمھارے جاتے ہی، بسبب خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہو گئی کہ آج اور کل کی مطلق تمیز نہیں رہی، اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونوں مبدل بزمانۂ حال ہو جائیں گے پس تم کیا گئے گویا ہم پر قیامت گزر جانے کے دونوں معنی ہیں، نہایت سختی کا زمانہ گزرنا، اور خود قیامت کا آجانا۔

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھکو بعد قتل (رشک) میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

لازم نہیں ہے خضر کی ہم پیروی کریں (شوخی) جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

دیکے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر (عاشقانہ) کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام (شکایت) ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی اُمید بر نہیں آتی (شکایت) کوئی صورت نظر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی (حسرت) اب کسی بات پر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں (ضبطِ راز) ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد (شوخی) پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی (بیخودی) کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار (عاشقانہ) یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

گویا ابھی عشق کے کوچے میں قدم رکھا ہے، اور معشوق و عاشق میں جو ناز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں اُن سے ناواقف ہے، اسلیے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے بیزار ہونے پر تعجب کرتا ہے۔

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں (عاشقانہ) کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین (شوخی) ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

بادۂ دوشینہ یعنی رات کی پی ہوئی شراب جو مرنے سے پہلے پی تھی۔ محض ازراہ شوخی کے کہتا ہے کہ نکیرین کے سوال وجواب سے بچنے کی تدبیر اسکے سوا نہیں کہ شراب پی کر مریں۔ تاکہ نکیرین اسکی بو کی کراہت سے بغیر سوال وجواب کیے چلے جائیں

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے (التصوف) ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

گویا خدا کے سوا کسی کو نہیں جانتے۔

نتیجۂ بے اعتدالی	بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے جتنے زیادہ ہوگئے اُتنے ہی کم ہوئے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے (گرفتاری) اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی (شوخی) سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر (عاشقانہ) تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آئے

دے مجھکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر (عاشقانہ) کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آئے

حُسن مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے (عاشقانہ) اُس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے

دوسرے مصرع میں دعویٰ متضمن دلیل ہے معشوق کو مہ خورشید جمال اسلیے کہا ہے تاکہ اسکو ماہ کامل پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے۔

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ (شوخی) جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے (افلاس) وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

اُنکے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق (عاشقانہ) وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اسی کے قریب قریب سعدیؒ کا بھی ایک شعر ہے وہ کہتے ہیں

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم — چہ بگویم کہ غم از دل برود چو تو بیائی

دونوں کا ماحصل یہ ہے کہ کسی طرح اپنی تکلیف یا رنج معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتے مگر سعدی کے بیان میں یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ شاید معشوق عاشق کی ظاہری بدحالی دیکھکر سمجھ جائے کہ اُسکا دل مغموم ہے کیونکہ سعدی کے بیان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ معشوق کے آنے سے غم جاتا رہتا ہے نہ یہ کہ ظاہری حالت بھی بدل جاتی ہے مگر مرزا کے بیان میں یہ احتمال باقی نہیں رہتا باینہمہ سعدی کے شعر کو بہر حال مرزا کے شعر پر ترجیح دینی چاہیئے کیونکہ الفضل للمتقدم

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض (عاشقانہ) اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

گویا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں یہانتک کہ پنڈت نے جو سال کو اچھا بتایا ہے تو اُسکے اچھا ہونے کے یہی معنی سمجھتا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان ہو جائیں نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑنے کا یا وبا نہیں آنے کی یا لڑائیاں نہیں ہونگی وغیرہ وغیرہ -

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن (شوخی) دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

پُرہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا (شکایت) اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم (عاشقانہ) آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف (عاشقانہ) آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل (عاشقانہ) جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جسکے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز (شوخی) سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا (رازنالی) دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو (عاشقانہ) ہم تو ہیں عاشق تمھارے نام کے

عشق نے غالب نکما کر دیا (عاشقانہ) ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

غزل بہاریہ وشکر صحت بادشاہ

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنان خطۂ خاک
اسکو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہوگئی ہے سر تا سر
روکش سطح چرخ مینائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

سبزۂ و گل کو دیکھنے کے لیے
چشم نرگس کو دی ہے بینائی

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادپیمائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہ دیندار نے شفا پائی

کب وہ سنتا ہے کہانی میری (عاشقانہ)
اور پھر وہ بھی زبانی میری

قدر سنگ سر رہ رکھتا ہوں (شکایت)
سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرانی کے معنی بھاری پن کے بھی ہیں اور بیش قیمت ہونے کے بھی۔ کہتا ہے کہ میری قدر اُس پتھر کی سی ہے جو راہ کے سرے پر پڑا ہوا اور ہر شخص آتے جاتے اُس پر پانوں رکھکر گزرے یعنی ہوں تو گراں قدر مگر اُس پتھر کی طرح بیقدر ہوں پس میری گرانی کسقدر ارزانی ہے۔

دہن اُسکا جو نہ معلوم ہوا (عاشقانہ)
کھل گئی ہیچمدانی میری

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی (عاشقانہ)
لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور (عاشقانہ)
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

لفظ تو نے جو دوسرے مصرع میں ہے یہ معنی پیدا کر دیے ہیں کہ آنکھ سے لہو روتے روتے دل میں خون کا ایک قطرہ باقی نہیں رہا۔ اسلیے دوست کے سر انگشت حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اُسکی وجہ سے دل میں لہو کی ایک بوند تو نظر آتی ہے۔

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بیحوصلگی سے (عاشقانہ) یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی
بیحوصلگی یعنی کم ظرفی۔ یہاں سے مراد دنیا۔ معشوق سے کہتا ہے تو اس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق لوگ تیرے جور و ظلم سے تنگ آکر حاکم سے یا خدا سے تیری فریاد کرینگے کیونکہ اگر ہم ایسا کریں بھی تو کوئی کسی کی فریاد ہی نہیں سنتا

چاک مت کر جیب بے ایام گل (فلاسفہ نیچرکی ہدایت) کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے
پھول کے کھلنے کو چاک گریباں سے عموماً تشبیہ دیجاتی ہے کہ ہر ایک کام نیچر کی ہدایت سے کرنا چاہیے پس جب تک پھول اپنا گریبان چاک نہ کرے تو بھی گریبان چاک مت کر اس میں لطف یہ ہے کہ مجنون کو ہمیشہ بہار میں جوش جنون زیادہ ہوتا ہے۔

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے (رندانہ) پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے
ہاں کھائیو مت فریب ہستی (تصوف) ہر چند کہیں کہ ہے۔ نہیں ہے
کیوں ردّ قدح کرے ہے زاہد (رندانہ) مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے
مگس کی قے یعنی شہد۔ زاہد جو شہد کے پینے کو موجب ثواب جانتا ہے اور شراب سے نفرت کرتا ہے اسکو شراب کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتاتا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جو مگس کے قے کرنے سے حاصل ہوتی ہے

ہائے واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا لیگیا تھا گور میں ذوق تن آسانی مجھے
وعدہ آنیکا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے (انتظار) تمنے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے
بجائے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جانے کو اس طرح بیان کرنا کہ تمنے میرے گھر کی دربانی مجھے سونپ دی ہے بالکل نیا پیرایۂ بیان ہے۔

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہوگئے (عاشقانہ) عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے
کبھی نیکی بھی اُسکے جی میں گر آجائے ہے مجھسے (شوخی) جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

یعنی اس خیال سے کہ تمام عمر اس پر ظلم کیے ہیں اب تھوڑی سی نیکی کرنے سے اسکی کیا تلافی ہو سکتی ہے نیکی نہیں کر سکتا۔

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے — کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے (عاشقانہ)
ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی — نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے (عاشقانہ)

اس میں وجدانی کیفیات کی تمثیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے مطلب یہ ہے کہ وہ قوی جنسے عشق کے ترک کرنے یا اسکے شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی ابتدائے عشق میں انھیں کو صدمہ پہنچا ہے پس اب نہ عشق ترک ہو سکتا ہے نہ اس پر صبر و تحمل کیا جا سکتا ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے (تصوف)
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک — اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے (تصوف)
وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے — نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے (عاشقانہ)
سفینہ جبکہ کنارے پہ آلگا غالبؔ — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے (اخلاق)
رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے — دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے (عاشقانہ)

دھویا جانا۔ بیشرم و بیباک ہونا پاک آزاد یا شہدا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک آنکھ سے آنسو نہیں نکلے تھے تو اس بات کا پاس و لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو باری رہنے لگی تو اخفائے رازِ عشق کا خیال جاتا رہا اور ایسے بیشرم و بیحجاب ہو گئے کہ آزادوں اور شہدوں کی طرح کھل کھیلے۔ اس مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے" بلاغت اور حسنِ بیان کی انتہا ہے۔

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ — کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے (تصوف)

شاہد حقیقی کا جو معاملہ غیر عشاق کے ساتھ ہے اسکو تغافل کے ساتھ اور عشاق کے معاملے کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے - جیساکہ سحابی بھی کہتا ہے -

رباعی

اے زاہد و عاشق از تو در نالہ و آہ — دُور تو و نزدیک ترا حالِ تباہ
کس نیست کہ جاں از تو سلامت ببرد — آں را بہ تغافل کشی ایں را بہ نگاہ

پس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اُسکے تغافل سے تنگ آکر شکایت کی تھی اور اسکی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے جب اُس نے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہم کو فنا کر دیا۔

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی — (التصوف) مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

صوفیہ کی اصلاح میں محادثت اور مسامرت (یعنی عبد و معبود کے درمیان گفتگو ہونا) کے دو مرتبے ہیں جو کاملین اور عرفا کو حاصل ہوتے ہیں - کہتا ہے کہ شاہد حقیقی کے ساتھ اس معمولی لب و دہن سے بات چیت نہیں ہو سکتی بلکہ اسکے لیے دہانِ زخم پیدا کرنا چاہیے - یعنی جب تک دل تیغ عشق سے مجروح نہ ہو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر — (عاشقانہ) فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

یعنی ساری عمر تو وعدۂ صبر آزما کے پورے ہونے کے انتظار میں گزر گئی پھر تیرے ملنے کی تمنا کس وقت کیجاتی۔

بات پر واں زبان کٹتی ہے — (التعریض) وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے — (شکایتاً) اب کسے رہنما کرے کوئی
جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب — (مایوسی کا) کیوں کسی کا گلا کرے کوئی
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — (ازلرنالی) بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

خواہش پر دم نکلنا اسکے پورے ہونے کے لئے جلدی کرنا۔ چنانچہ کہتے ہیں کیوں دم نکلا جاتا ہے۔ یا کیوں مرے جاتے ہو یعنی کیوں جلدی کرتے ہو پہلے مصرع میں بمقتضائے مقام یہ الفاظ کہ "دل میں باقی ہیں" مقدر ماننے چاہییں باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

(شکایت) نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
دوسرے مصرع میں بہت کے لفظ پر زور دینا چاہیئے تاکہ آدم کی نسبت زیادہ بے آبروئی کے ساتھ نکلنا ثابت ہو۔

(شوخی) بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے
(عاشقانہ) محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا اسی کو دیکھکر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
(شوخی) کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے
(انتظار) پیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے
(تصوف) اے پرتوِ خورشید جہانتاب ادھر بھی سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
یہ خطاب ہے آفتابِ حقیقت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جیسا سایہ متہم بوجود ہے اور فی الواقع اسکی کچھ ہستی نہیں ہے اسی طرح ہم بھی اس دھوکے میں پڑے ہیں اگر آفتاب حقیقت کی کوئی تجلی ہم پر لمعہ فگن ہو جائے تو یہ دھوکا جاتا رہے اور ہم فنا فی الشمس ہو جاویں کیونکہ جہاں آفتاب چمکا اور سایہ کافور ہوا۔

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی
یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پہلو رکھتا ہے، مگر بہ نسبت مجاز کے حقیقت پر زیادہ چسپاں ہے۔

(شوخی) واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی
(شوخی) کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر (عاشقانہ) کی جس سے بات اُسنے شکایت ضرور کی
غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں (شوخی) حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

اس شعر سے مرزا کی کمال شوخی طبع ظاہر ہوتی ہے۔ یہ غزل اس زمانے میں لکھی تھی جبکہ بہادر شاہ مرحوم کا ارادہ حج کو جانے کا تھا۔ مرزا اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ جانے کا کمال اشتیاق ظاہر کرتے ہیں، یہاں تک کہ اسکے لیے منت یہ مانتے ہیں کہ حج کا ثواب حضور کی نذر کرونگا۔ اُدھر سفر حج کا وہ اشتیاق اور اِدھر حج کے ثواب کی یہ بیقدری۔

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے (رندانہ) یہ رنج کہ کم ہے مےِ گلفام بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے مجھکو (قناعت و جبر) ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

یعنی قناعت کا تو یہ حال ہے کہ شراب کی تلچھٹ بھی میرے لیے کافی ہے مگر اس خیال سے کہ ساقی مجھے ذلیل اور کم ہمت اور قانع بہ ہیچ نہ سمجھے اُس پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دیتا۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں (قناعت) گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یعنی جو شخص گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں ہوتا ہے اُسکا کوئی دشمن اور بدخواہ نہیں ہوتا ساری خرابیاں شہرت اور اقتدار اور نام و نمود کے ساتھ وابستہ ہیں۔

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے (عاشقانہ) رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کیلیے
وہ زندہ ہم ہیں کہ روشناس خلق اے خضر (شوخی) نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر (کوشش) کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

اس سے زیادہ کوشش کی سعی کسی پیرائے میں بیان نہیں ہو سکتی۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے (شوخی) اٹھا اور اٹھکے قدم میں نے پاسباں کے لیے

اُردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو ہی چار اور نکلیں گے۔ مولانا آزردہ جو مرزا کی طرز کو نام رکھتے تھے وہ بھی اس شعر کے انداز پر پروانہ تھے۔ ہم نے مقدمہ میں بھی اس شعر پر کچھ ریمارک کیا ہے یہاں اسکی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ مرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔ اُس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضرور تھی ایک یہ کہ پاسبان نے قائل کے ساتھ کیا سلوک کیا دوسرے یہ کہ قائل پاسبان سے چاہتا کیا تھا، سو یہ دونوں باتیں بصراحت بیان نہیں کی گئیں صرف کنایۃً بیں ادا کی گئی ہیں مگر صراحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہیں۔ پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قدم لینا صاف دلالت کرتا ہے اسکے سوا دروبست کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔

اس غزل کے اخیر میں چند شعر نواب فرخ آباد کی مدح میں لکھے ہیں جنھوں نے مرزا کو نہایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد میں بلایا تھا مگر غالباً مرزا کا وہاں جانا نہیں ہوا اُن مدحیہ اشعار میں سے صرف دو شعر اس مقام پر لکھے جاتے ہیں۔

بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے | دیا ہے اور کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے | زمانہ عہد میں ہے اُسکے محوِ آرایش

قطعات

قطعہ ا

یہ وہ قطعہ ہے جو مرزا نے پادشاہ کی حضور میں اس درخواست سے گزرانا تھا کہ

انکی تنخواہ جو ششماہی گزرنے پر اکٹھی چھ مہینے کی ملا کرتی تھی وہ ماہ بماہ ملا کرے
چنانچہ اس درخواست کے موافق تنخواہ ماہ بماہ ملنے لگی تھی۔

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ — اے جہاندارِ آفتاب آثار
تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں — تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھکو جو آبرو بخشی — ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز — روشناسِ ثوابت و سیار
گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری — ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی — جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں — بادشہ کا غلام کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح — تھا ہمیشہ[1] سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر — نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں — مدعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد! اگرچہ مجھکو نہیں — ذوقِ آرایشِ سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر — جسم رکھتا ہوں۔ ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کی سال — کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انساں — دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وقنا ربنا عذاب النار
میری تنخواہ جو مقرر ہے — اسکے ملنے کا ہے عجب ہنجار۔

---

[1] بادشاہ کی ملازمت سے پہلے بھی مرزا کی آمد و رفت قلعہ میں جاری تھی اور مدحیہ قصیدے برابر بادشاہ کے ہاں گذرانتے تھے اور خلعت پاتے تھے۔ ۱۲

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوے خوش گفتار

رزم کی داستان گر سنیئے
ہے زباں میری تیغ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میری ابر گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ
تا نہ ہو مجھکو زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سرکار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعہ

گو ایک پادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں (شوخی)
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں

کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں کرتے ہوے سلام
ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

بادشاہ کے دربار کا یہ داب تھا کہ آپس میں جو وہاں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو ماتھے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھ لیتے تھے۔ چونکہ اُردو محاورے میں کانوں پر ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم آشنا نہیں اسلیے مرزا نے اسکو اس پیرایے میں بیان کیا ہے۔

لہ شاعری سے مراد یہاں صنعت شاعرانہ ہے چونکہ یہ قطعہ مرزا نے اپنے خاص طرز کے خلاف بہت سیدھا سادہ لکھا ہے تو دعا بھی ایسی ہی سیدھی سادی ہے جس میں کسی طرح کی صنعت شاعرانہ نہیں ہے

قطعہ

نہ پوچھ اسکی حقیقت - حضور والا نے (شکریہ) مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے تو اکثر مصاحبین اور اہل دربار کے لیے بطور اولوش کے بھیجا کرتے تھے اسکے شکریے میں کبھی کبھی مرزا کوئی قطعہ یا رباعی بادشاہ کے حضور میں گزرانتے تھے یہ قطعہ بھی اُسی قبیل کا ہے۔

لطیفہ جسوقت چوبدار - بادشاہی یہ اولوش لیکر آیا ایک باہر کا رہنے والا طالبعلم جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا - موجود تھا - چوبدار کے چلے جانے کے بعد اُس نے مرزا سے متعجب ہوکر پوچھا کہ بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بطور اولوش کے تقسیم ہوتی ہے؟ مرزا نے کہا ارے احمق! چنا وہ چیز ہے کہ اُس نے ایک دفعہ جناب آلہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھپر بڑے ظلم ہوتے ہیں مجھے دلتے ہیں، پیستے ہیں، بھونتے ہیں، پکاتے ہیں، اور مجھ سے سیکڑوں کھانے کی چیزیں بناکر کھاتے ہیں - جیسا مجھپر ظلم ہوتا ہے اور کسی پر نہیں ہوتا - وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جائے، ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھکو کھا جائیں۔

قطعہ ۳

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو (شوخی) اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھولکے کھانے کو کچھ نہیں روزہ اگر نہ کھاوے تو ناچار کیا کرے

مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ بھی رمضان کے مہینے میں بادشاہ کی حضور میں پڑھا گیا تھا، جس کو سنکر بادشاہ اور تمام مصاحبین جو دربار میں موجود تھے بے اختیار ہنس پڑے۔

قطعہ ۵

(معذرت)
مجھ پہ کیا گزریگی اتنے روز حاضر بن ہوئے
سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی
تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد

ایک شعر میں مسہل کے ان تمام دنوں کی تفصیل جن میں حکیم چلنے پھرنے کو منع کرتے ہیں کس عمدگی سے بیاں کی ہے۔ یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا ہے

قطعہ ۶

(شوخی)
جہاں میں جو کوئی فتح وظفر کا طالب ہے
سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
کہ جو شریک[۵] ہو میرا شریک غالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے

رباعیات

رباعی ۱

(شوخی)
مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگر نگویم مشکل

اس اخیر کے مصرع میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں ایک یہ کہ اگر انکی فرمائش پوری کروں اور آسان شعر کہوں تو یہ مشکل ہے کہ اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف ہے اور آسان نہ کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ برا مانتے ہیں اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس باب میں صاف صاف بات کہتا ہوں تو سخنوران کامل کی نافہمی اور کند ذہنی ظاہر کرنی پڑتی ہے اور اگر صاف صاف نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھہرتا ہوں پس ہر طرح مشکل ہے۔

سنہ ۵ شریک غالب اُس شریک کو کہتے ہیں جسکا حصہ دوسرے شریکوں سے غالب ہو۔ شریک غالب کے لفظ میں جو لطف ہے وہ ظاہر ہے۔ ۱۲

رباعی

بھیجی ہے مجھے جو شاہِ جمجاہ نے دال (شکریہ) ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

پادشاہ کے ہاں مونگ کی دال پکا کرتی تھی جو پادشاہ پسند کہلاتی تھی۔ یہ رباعی اسکے شکریے میں لکھی گئی ہے۔

رباعی ۳

(مبارک باد سالگرہ)

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ ہے صفر کہ افزایشِ اعداد کرے

رباعی ۴

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے (شوخی) کرتے ہیں درنگ، کام کرنے والے
کہتے ہیں۔ کہیں خدا سے۔ اللہ اللہ! وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

اس رباعی میں مرزا نے غایت درجے کی شوخی کی ہے جو بالکل اچھوتی اور نئی طرح کی ہے۔ کہتا ہے کہ ہم ہر چند دربار کے با اختیار لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں مگر وہ ہماری کام روائی میں درنگ اور لیت و لعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ خدا ہی سے کہیں پھر یہ خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو وہ تو آپ ہی صبح و شام کرنے والے ہیں۔ صبح و شام کرنا لیت و لعل کرنے کو کہتے ہیں چونکہ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا خدا کا کام ہے تو خدا کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ صبح شام کرنے والے ہیں۔ مگر شاعر کا اصل مقصود یہی ہے کہ کامروائی خلق میں جیسی لیت و لعل وہاں ہوتی ہے ایسی کہیں نہیں ہوتی کہ اکثر ساری عمر امید ہی میں گزر جاتی ہے اور مطلب حاصل نہیں ہوتا۔

رباعی ۵

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں (شوخی) آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن خسخانۂ و برفاب کہاں سے لاؤں

یہ رباعی بھی اسی قطعہ کے ساتھ جس میں روزے کا مضمون باندھا ہے دربار میں پیش کی گئی تھی۔

رباعی ۶

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں (عاشقانہ) عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

یہ رباعی عاشقانہ ہے اور بالکل نیا مضمون ہے۔ ظلم سے ہاتھ اٹھانا اُس سے دست بردار ہونا اور اسکو ترک کرنا۔ باقی الفاظ کے معنی ظاہر ہیں۔

رباعی ۷

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے (شکریہ) بھیجے ہیں جو ارمغاں شہِ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سَو بار فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

بادشاہ نے سیم کے بیجوں کا سالن بھیجا ہے اسکے شکریے میں یہ رباعی لکھی ہے۔ بڑا فیروزہ جو بیضوی شکل کا ہوتا ہے وہ سیم کے بیج سے بہت مشابہ ہے۔

نثر اُردو

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے، مگر سنہ مذکور میں جبکہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے، اور ہمہ تن مہرنیمروز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے، اس وقت بضرورت انکو اُردو میں خط کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوت متخیلہ کا عمل

اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے نہایت کاوش سے لکھتے تھے - پس جب انکی ہمت مہر نیمروز کی ترتیب و انشا میں مصروف تھی ضرور ہے کہ اُسوقت انکو فارسی زبان میں خط کتابت کرنی - اور وہ بھی اپنی طرز خاص میں - شاق معلوم ہوئی ہوگی - اسلیے قیاس چاہتا ہے کہ اُنھوں نے غالباً سنہ کے بعد سے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی - حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے -

مضمحل ہوگئے قویٰ غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں "؟

غالباً اردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو مرزا نے اوّل اوّل اپنی شان کے خلاف سمجھا ہوگا مگر بعض اوقات انسان اپنے جس کام کو حقیر اور کم وزن خیال کرتا ہے وہی اُسکی شہرت اور قبولیت کا باعث ہو جاتا ہے - جہاں تک دیکھا جاتا ہے مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جسقدر انکی اُردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم اُردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی - اگرچہ لوگ عموماً مرزا کو فارسی کا بہت بڑا شاعر جانتے تھے، اور انکے اُردو دیوان کو بھی ایک عالی رتبہ کلام عام افہام سے بالاتر سمجھتے تھے، مگر لوگوں کا ایسا خیال کرنا محض تقلیداً تھا نہ تحقیقاً - وہ خود اپنے ایک مرتبہ دال اور پایہ شناس دوست کو خط میں لکھتے ہیں "میرے فارسی قصیدے کہ جن پر مجھکو ناز ہے کوئی انکا لطف نہیں اُٹھاتا مگر بطریق اذعان کہ یہ شخص فارسی خوب کہتا ہے دادِ سخن کہاں اور ادراک پایۂ معنی کہاں ؟ تاریخ نثر (یعنی مہر نیمروز) کے پانچ سات جزو جو آپ کے پاس بھیجے ہیں میری خاطر نہ کیجیے،

انصاف سے کہیے کہ یہ نثر کہیں اور ہے؟ اور پھر اس نثر کا کوئی مشتاق نہ ہو۔

اگرچہ مرزا کی اُردو نثر کی قدر بھی جیسی کہ چاہیے ویسی نہیں ہوئی۔ چنانچہ بعض اوقات تحریروں میں دیکھا گیا ہے کہ اُردوے معلیٰ اور بوستان خیال کی عبارت کو ایک مرتبے میں رکھا گیا ہے، لیکن پھر بھی مرزا کی اردو نثر کے قدردان بہ نسبت ناقدر دانوں کے ملک میں بہت زیادہ نکلیں گے۔

مرزا کی اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں، چند تقریظیں اور دیباچے ہیں، اور تین مختصر رسالے ہیں جو برہان قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے ہیں، لطائف غیبی، تیغ تیز اور نامہ غالب۔ اسکے سوا چند اجزا ایک ناتمام قصے کے بھی ہیں جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اور لطف انگیز انکے خطوط ہیں جن میں سے زیادہ تر اُردوے معلیٰ میں اور اس سے کم عود ہندی میں جمع کرکے چھپوائے گئے ہیں۔ اور بہت سے خطوط ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوئے ہیں جو اب تک شایع نہیں ہوے مگر عنقریب بعض احباب کا ارادہ انکے چھپوانے کا ہے۔[1]

مرزا کی اُردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ انکے بعد کسی سے اسکی پوری پوری تقلید ہو سکی۔ اُنھوں نے القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جنکو مترسلین نے لوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا مگر درحقیقت فضول اور دوراز کار تھیں سب اڑا دیں، وہ خط کو کبھی میاں، کبھی برخوردار، کبھی بھائی صاحب، کبھی مہاراج، کبھی کسی اور

[1] یادگار کا پہلا ایڈیشن چھپنے کے بعد انوار المطابع لکھنؤ میں کل رقعات اور تقریظیں چھپ گئی ہیں۔ ۱۲

مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں اسکے بعد مطلب لکھتے ہیں۔ اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

ادائے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہہ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں۔ مثلاً انکو یہ لکھنا تھا کہ "محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گزرا۔ میں نے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟ اس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کیا آج نہ جائینگی؟ اس نے کہا آج ضرور جائینگی۔ تیاری ہو رہی ہے" اس مطلب کو اُنھوں نے اس طرح ادا کیا ہے "محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ بھئی محمد علی بیگ۔ لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟ حضرت ابھی نہیں کیا آج نہ جائینگی؟ آج ضرور جائینگی۔ تیاری ہو رہی ہے"

میر مہدی مجروح کو خط لکھا ہے، اس میں لکھنا یہ ہے کہ میرن صاحب آئے اور ان سے یہ باتیں ہوئیں، مگر وہ اس طرح نہیں لکھتے بلکہ اسکو اُس طرح شروع کرتے ہیں" اے میرن صاحب السلام علیکم حضرت آداب۔ کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور میں کیا منع کرتا ہوں؟ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف دعا لکھ دیتا ہوں، پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میرن صاحب! اُسکے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہوا ہوگا، جواب لکھنا ضرور ہے حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے خفا کیا ہونگے۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟ سبحان اللہ! اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اُٹھاتا اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب

پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں، میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیگا میاں میٹھو ہوش کی خبر لو تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ ؟ میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی تمھاری باتوں میں آگیا اور آج اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولاقوۃ" اسکے بعد میر مہدی سے مخاطب ہوکر اصل مطلب لکھتے ہیں۔

بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اُسکو غائب فرض کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے انداز بیان سے واقف نہیں وہ اسکو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں "میر مہدی! جیتے رہو۔ آفریں صد ہزار آفریں اُردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھکو رشک آنے لگا ہے۔ سنو۔ دلّی کی تمام مال و متاع وزر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطے میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی، سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلّے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اسکو بحل کیا، اللہ برکت دے"

ظاہر ہے کہ اس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میر مہدی مجروح ہیں کیونکہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے محلۂ مذکور میں کئی سال مقیم رہے تھے۔ مگر جو لوگ مرزا کی اٹکھیلی چالوں سے ناواقف ہیں وہ غلطی سے اسکے دوسرے معنی سمجھ جاتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو اس خیال سے کہ راقم بھی پانی پت انصاری محلّے کا رہنے والا ہے۔ ان الفاظ سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ میں نے جسقدر اُنکو سمجھایا کہ یہ خود میر مہدی ہی کی نسبت لکھا ہے، میری نسبت نہیں لکھا، اسی قدر انکو اس بات کا زیادہ خیال ہوا کہ میں ازراہ کسر نفسی کے ایسا کہتا ہوں۔

مغربی طریقے پر جو قصے لکھے جاتے ہیں ان میں اکثر اس قسم کے سوال و جواب ہوتے ہیں جیسے کہ مرزا کی تحریروں میں ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔ مگر

وہاں ہر سوال وجواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا ان کے ناموں کی کوئی علامت لکھدیجاتی ہے، ورنہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ سوال کہاں ختم ہوا؟ اور جواب کہاں سے شروع ہوا؟ مرزا ایسے موقع پر سائل ومجیب کا نام نہیں لیتے، اور نہ ان کے نام کی علامت لکھتے ہیں۔ مگر سوال جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سوال کیا ہے؟ شاید قصے یا ناول میں یہ بات نہ چل سکے مگر خطوط میں تو مرزا نے یہ راہ بالکل صاف کردی ہے۔

مرزا کی طرز تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اسکی پیروی نہ کر سکیں مگر وہ چیز جس نے انکے مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخی تحریر ہے جو اکتساب یا مشق ومہارت یا پیروی وتقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں بعض لوگوں نے خط کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی وظرافت پر رکھنی چاہی ہے۔ مگر انکی اور مرزا کی تحریریں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سر بھرے ہوئے ہوتے ہیں، اور قوت متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اسکو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوت پرواز کو طائر کے ساتھ۔ اگرچہ مرزا کے بعد نثر اُردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے۔ علمی، اخلاقی، پولٹیکل، سوشل اور مذہبی مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دیے ہیں، بائیوگرفی اور ناول میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں، باوجود اسکے مرزا کی تحریر خط وکتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ دلچسپی اور لطف بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اسکو پڑھکر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا اُسکی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے، اس میں اُنکی لڑکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہوگئی ہے۔ بعد دعا کے لکھتے ہیں "کیوں بھئی اب ہم اگر کول آئے تو تم کو کیونکر دیکھیں گے؟ کیا تمھارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟" یا مثلاً نواب امیرالدین احمد خاں کو جواب رئیس لوہارو ہیں انکے بچپن کے زمانے میں انکے رقعے کا جواب۔ جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا۔ اس طرح لکھتے ہیں "اے مردم چشم جہاں بین غالب پہلے القاب کے معنی سمجھ لو، یعنی چشم جہاں بین غالب کی پتلی چشم جہاں بیں تمھارا باپ مرزا علاءالدین احمد خاں بہادر۔ اور پتلی تم۔ میاں تمھارے دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں، میں تو صرف تمھارا دلدادہ ہوں۔

لطیفہ ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے اُنھوں نے اسکا جواب جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا اُسکے جواب میں انکو اس طرح لکھتے ہیں "دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں، ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو! اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائیگا تو یہ کہوگے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے"

شوخی ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا ہے، اُس میں لکھتے ہیں "دھوپ بہت تیز ہے روزہ رکھتا ہوں، مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں، میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو

روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔"

لطیفہ جس زمانے میں برہان قاطع پر اعتراض لکھے ہیں اور لوگوں نے مرزا کی سخت مخالفت اور مولف برہان کی حمایت کی ہے ایک خط میں صاحب برہان کا ذکر کرنے کے بعد اُسکی اور اُسکے طرفداروں کی نسبت لکھتے ہیں" ان فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھدیا نظامی وسعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرہنگ ہو تو ہم اُسکو مانیں، ہندیوں کو کیونکر مسلم الثبوت جانیں ایک گائے[1] کا بچہ بزور سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا، بنی اسرائیل اُسکو خدا سمجھے"

ایک خط کے آخر میں جو نواب علاء الدین خاں کو لکھا ہے لکھتے ہیں" اُستاد میرجان کو اس راہ سے کہ میری پھوپھی اُنکی چچی تھیں اور مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں۔ دعا۔ اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی بیشی سن وسال کی رعایت نہیں کرتے۔ سلام۔ اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں بندگی اور اس نظر سے کہ سید ہیں درود۔ اور موافق مضمون اس مصرع کے "سوی اللہ واللہ مافی الوجود" سجود۔

ایک خط میں برسات کی شدت کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں دیوانخانے کا حال محلسرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں چھت چھلنی ہوگئی ہے، ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔"

نواب علاء الدین خاں اور اُنکے والد نواب امین الدین خاں میں کچھ شکر رنجی ہے۔ باپ دلی آئے ہیں اور بیٹے کو لوہارو چھوڑ آئے ہیں۔ مرزا نواب علاء الدین خاں کو خط میں لکھتے ہیں" سنا گیا کہ نواب امین الدین خاں صاحب

[1] یہ اشارہ صاحب برہان قاطع کی طرف ہے۔ ۱۲

نے اپنی کوٹھی میں نزولِ اجلال کیا۔ پھر دن رہے ازراہ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف لائے۔ میں نے تعظیم پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے؟ بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے۔ اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں میں نے کہا اتنا ہی؟ جتنا تم اسکو چاہتے ہو؟ ہنسنے لگے غرضکہ میں نے بظاہر انکو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے (یعنی احمد بخش خانیوں کے) دلوں کا اللہ مالک ہے"۔

ایک دفعہ کثرت اخراجات سے تنگ آکر بعض ضروری خرچ بند کر دیے ہیں یہاں تک کہ شراب پینا بھی چھوڑ دیا ہے نواب علاء الدین خاں نے اپنے والد کے اشارے سے اسکا سبب دریافت کیا ہے اور مولوی حمزہ خاں صاحب کی طرف سے بطور نصیحت کے مرزا صاحب کو یہ شعر لکھا ہے:"چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو۔ الخ اسکا جواب اس طرح لکھتے ہیں" بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں ہے کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا، ادھر درباری مل کو جا مارا، ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی، ہر ایک پاس تمسک مُہری موجود، شہد لگاؤ اور چاٹو نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھکر یہ بات روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر، باایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دیدیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیجدیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے سو روپے رامپور کے قرض دینے والا ایک میرا مختار کار، وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اسکو دینی پڑے، انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ، تنگ آگیا، گذارا مشکل ہو گیا روزمرہ کا کام بند رہنے لگا، سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجایش نکالوں؟ قہر درویش بجان درویش۔ صبح کی تبرید متروک

چاشت کا گوشت آدھا، رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپے مہینا بچا، روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے؟ جواب دیا جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینا پورا نہیں گذرا تھا کہ رامپور سے علاوہ وجہ مقرری کے اور روپیہ آگیا قرض متفرق ادا ہوگیا۔ متفرق رہا، خیر رہو۔ صبح کی تبرید رات کی شراب جاری ہوگئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ چونکہ بھائی نے وجہ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی انکو یہ عبارت پڑھا دینا۔ اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا؟

اے بیخبر زلذت شراب مدام ما" دیکھا ہمکو یوں پلاتے ہیں۔ دریبے کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھاکر مولوی مشہور ہونا اور رسائل ابوحنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے، اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دلنشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں مشرک وہ ہیں جو نومسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ اِلّا اللہ کہتا ہوں، اور دل میں لا موجود الا اللہ سمجھا ہوا ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعۃ تھے۔ محمد علیہ السّلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ منقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السّلام ہے ثم حسن ثم حسین اسی طرح تامہدی موعود علیہ السّلام بریں زیستم ہم بریں بگذرم۔ ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھکو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا

بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ تیز کروں گا تاکہ مشرکین نبوت مصطفوی
و امامت مرتضوی اُس میں جلیں + + + سنو مولوی صاحب! تم نے کئی فاقوں میں
ایک شعر حافظ کا حفظ کیا "چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو" الخ اور پھر پڑھتے
ہو اسکے سامنے کہ اسکی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند سہ چند ہے مجموعہ نثر جداگانہ
یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اسکے مخالف ہیں"

ایک خط میں تعلقات خانہ داری کی اس طرح شکایت کرتے ہیں سنو! عالم دو ہیں
ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے۔
جو خود فرماتا ہے "لمن الملک الیوم" اور پھر آپ ہی جواب دیتا ہے "للہ الواحد القہار"
ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن
یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیجکر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ
میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا (یعنی پیدا ہوا)
تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس
(یعنی نکاح) صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈالدی اور دلی شہر کو زندان
مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا، فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھیرایا۔ برسوں
کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے
کلکتے سے پکڑ لائے، اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریزپا
ہے دو[۵] ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخمدار
مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی، طاقت یکقلم زائل ہوگئی۔ بےحیا ہوں، سال گذشتہ
بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ، مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ مراد آباد
ہوتا ہوا رامپور پہنچا، کچھ دن کم چھ مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا
کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے

---

۵ بیڑی سے مراد اہلیہ اور دو ہتھکڑیوں سے مراد حسین علیخاں اور باقر علیخاں جنکو مرزا نے انکے والد زین العابدین
خاں کی وفات کے بعد خود فرزندوں کی طرح پرورش کیا تھا ۱۲

کب صادر ہو؟ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤنگا۔

فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بروم — سوی شہر خود ازیں وادی ویراں بروم

ایک خط مرزا حاتم علی بیگ مہر کو انکی محبوبہ چُنا جان کی تعزیت میں لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں آپ کا غم فزا نامہ پہنچا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ انھوں نے جو میرے سامنے اُس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا یعنی اُسکی اطاعت اور تمھاری اس سے محبت، سخت ملال ہوا۔ سنو صاحب! شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصریؒ اور عشاق میں مجنوں، یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصریؓ سے ٹکر کھائے عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہمطرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اسکے سامنے مری تھی تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری بلکہ تم اس سے بڑھکر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اسکو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک + + + کو ہیں نے بھی مار رکھا ہے خدا اُن دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے، با آنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا، اس فن سے میں بیگانہ محض ہو گیا ہوں، لیکن کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اُسکا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گذرتی ہوگی صبر کرو اور

ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑو۔ سعدی اگر عاشقی کنی وجوانی ✦ عشق محمدؐ بس است وآلِ محمدؐ ✦ اللہ بس ماسوائے ہوس۔

ایک اور خط مرزا صاحب موصوف کو اسی چنّا جان کی تعزیت میں اس طرح لکھا ہے۔ مرزا صاحب! ہمکو یہ باتیں پسند نہیں پینسٹھ برس کی عمر ہے پچاس برس عالمِ رنگ وبو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی تھی کہ ہمکو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق وفجور نہیں پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو، سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے کیسی اشک افشانی؟ کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجالاؤ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چُنّا جان نہ سہی مُنّا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیکبخت کے ساتھ زندگانی ہے اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائیگی طبیعت کیوں نہ گھبرائیگی وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بددور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔

زنِ نو کن اے دوست در ہر بہار ✦ کہ تقویم پارینہ ناید بہ کار

مرزا حاتم علی بیگ مہر نے اپنی تصویر مرزا کو بھیجی ہے اسکی رسید اس طرح لکھتے ہیں "حلیۂ مبارک نظر افروز ہوا + + تمھارا حلیہ دیکھکر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھکو رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اسکی ستایش کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھکو وہ اپنا

رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھکو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی گھنی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آگئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری! بقول شیخ علی حزیں

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں   شرمندگی از خرقۂ پشمینہ نہ دارم[1]

جب داڑھی موچھ میں بال سفید آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے، اس سے بڑھکر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے، ناچار مستی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام، ملا حافظ۔ بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا بھٹیارہ، منہ پر داڑھی سر پر بال فقیر نے جسدن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا۔"

الغرض مرزا کے خطوط و رقعات میں ایسے خطوط بہت کم نکلیں گے جن میں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں مندرج نہ ہوں یہاں تک کہ رنج وافسردگی کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ سے خالی نہیں ہوتا۔

منشی نبی بخش مرحوم کو لکھتے ہیں " بھائی صاحب! میں بھی تمھارا ہمدرد ہوگیا یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت میری وہ پھوپھی۔ کہ میں نے بچپن سے آج تک اُسکو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھکو بیٹا سمجھتی تھی۔ مرگئی آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے تین پھوپھیاں اور تین چچا، اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اسکے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مرگئے "۔

---

[1] یہاں اس شعر کے لکھنے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب تک مجھے موقع ملا برابر داڑھی کا حق ادا کرتا رہا یعنی منڈاتا رہا۔ پس اس سے میں کسی طرح شرمندہ نہیں ہوں ۱۲

ایک ایسی ہی افسردہ تحریر میں نواب امین الدین خاں کو لکھتے ہیں آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو، میں لم یلد ولم یولد ہوں
مرزا قربان علی بیگ سالک کو خط لکھتے ہیں یہاں خدا سے بھی توقع نہیں مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی، اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے ازراہ تعظیم (جیسا بادشاہوں کو بعد انکے جنت آرامگاہ عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں) چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ اے نجم الدولہ بہادر!!! ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اکسو کچھ تو بولو، بولے کیا بیحیا بے عزت؟ کوٹھی سے شراب گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام، قرض لیے جاتا ہے یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دونگا۔"

فتح دہلی کے بعد جو شہر میں سناٹا ہو گیا ہے اسکی کیفیت ایک خط میں منشی ہر گوپال تفتہ کو اس طرح لکھتے ہیں "صاحب تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے، شعر کہے دیوان جمع کیے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست تھے اور منشی

نبی بخش اُنکا نام اور حقیر تخلص تھا- ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہمکو ملا- اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے، یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا اسکا جواب مجھکو آیا- اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو آج آیا- اور میں جس شہر میں ہوں اُسکا نام بھی دلّی اور اس محلّے کا نام بھی بلّی ماروں کا محلّہ ہے لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا- واللہ ڈھونڈھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا- کیا امیر کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں- ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں"۔

ایک خط میں نواب علاء الدین خاں کو لکھتے ہیں" کل تمھارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلّی بڑا شہر ہے، ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہونگے- اے میری جان یہ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوے ہو، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے- وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کیمپ ہے جس میں مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود، بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینا پاتے ہیں + + + + امراے اہل اسلام میں اموات گنو تو حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنشندار- مہینے کا روزینہ دار بنکر نامرادانہ مرگیا- میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا- آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے بیمار پڑا، نہ دوا نہ غذا، انجام کار مرگیا- تمھارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی احبا کو پوچھو تو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا

بھائی مقتولوں میں آیا اُسکے پاس ایک پیسا نہیں ٹکے کی آمد نہیں، مکان اگرچہ رہنے کو ملگیا ہے مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے بڑے صاحب ساری املاک بیچ کر اور نو شجان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانسو روپے کرایہ کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی، تباہ و خراب لاہور گیا، وہاں پڑا ہوا ہے، دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڈھ اور بلبھ گڈھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنر مند آدمی یہاں کیوں پایا جائے جو حکما کا حال کل لکھا ہے وہ بیان واقع ہے۔ صلحا و زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے اُسکو بھی سچ جانو۔"

بعض خطوں میں یاس و حسرت و افسردگی اور دنیا کی بے ثباتی و بے اعتباری کا بیان نہایت موثر طریقے میں کیا ہے جس سے اُنکے خیالات معلوم ہوتے ہیں ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی رکاب میں پانو ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دُور دراز درپیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخشدیا تو خیر، اور اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ایک اور خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں "تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں بو علی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔

ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا، دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گمنام جیے تو کیا۔ کچھ معاش ہو کچھ صحتِ جسمانی، باقی سب وہم ہے اے یارِ جانی ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پائے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھکر یہ پردہ بھی اٹھ جائے، اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں۔ عالم بیرنگی میں گزر پاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے سراب ہے، ہستی نہیں ہے پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہوئے انکو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو تمکو ہوگا

مرزا نے بعض اردو خطوں میں اور خاصکر اردو تقریظوں میں مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے اگرچہ اس زمانے میں ایسا التزام تکلفات باردہ میں شمار کیا جاتا ہے خصوصاً اردو جو بمقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے ایک نہایت محدود زبان ہے وہ اس قسم کے تصنع اور ساختگی کی متحمل نہیں معلوم ہوتی مگر مرزا نے جس قسم کی عبارت اردو خطوں یا تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے اس پر یہ گرفت مشکل سے ہو سکتی ہے۔ عربی اور سنسکرت زبان کے سوا اور زبانوں کے مسجع نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ نخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے تو اس میں تصنع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور اسلیے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا فقرہ بسبب لزوم مالایلزم کے کم وزن ہو جاتا ہے مگر مرزا کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی پہلے فقرے میں اور یہ بات اسی شخص سے بن پڑتی ہے جو باوجود خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجے

کا کمال رکھتا ہو اور وزن وقافیہ کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اسکی مثالیں لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ مرزا کے اردو رقعات میں اسکی مثالیں بکثرت موجود ہیں مگر یہ معلوم رہے کہ مقفی عبارت مرزا صاحب اُن خطوں میں لکھتے تھے جنسے ہنسی، ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا ورنہ واقعات کا بیان مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادی نثر عاری میں کرتے تھے مثلاً سید یوسف مرزا کو ان کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں۔

یوسف مرزا کیونکر تجھکو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو بگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودۂ ابنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں صبر کرو۔ ہائے! ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپیگا صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کسکو کہتے ہیں تو میں کہونگا یوسف مرزا کو۔ تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا، نہ قید حیات رہی نہ قید فرنگ"

انھیں کو بیٹے کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں" اے میری جان! اے میری آنکھو!

زہجران طفلے کہ در خاک رفت | چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لیکر آیا تھا۔ یہاں رہ کر کیا کرتا؟ ہرگز غم نہ کرو۔ اور اگر ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو خدا تم کو جیتا رکھے، اولاد بہت نانا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو

وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے۔ ہاں مظفر الدولہ کا غم منجملۂ واقعات کربلائے معلیٰ ہے۔ یہ داغ جیتے جی نہ مٹے گا۔

مرزا نے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اُردو زبان میں لکھے ہیں اور ان سب میں مسجع ومقفےٰ عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ جو بے تکلفی اور صفائی مرزا کے خطوں میں پائی جاتی ہے وہ اُن تقریظوں اور دیباچوں میں نہیں ہے خصوصاً مسجع کی رعایت نے ان میں آورد اور تصنع کا رنگ زیادہ پیدا کر دیا ہے لیکن مرزا کو اس میں معذور سمجھنا چاہیئے، جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرتے تھے وہ بغیر ان تکلفات باردہ کے ہرگز خوش ہونیوالے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانے میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے اُسکو اب بھی بہت کم لوگ ناپسند کرتے ہیں اور مرزا کے وقت میں تو اسکا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا۔ بایںہمہ ان میں سے بعض نثریں مرزا کی روش خاص میں نہایت ممتاز ہیں خصوصاً وہ دیباچہ جو انھوں نے منشی ہیرلال صاحب کی کتاب سراج المعرفتہ پر لکھا ہے اُس میں جس خوبی اور متانت سے تصوف کے اعلیٰ خیالات ظاہر کیے ہیں اسکے لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ اُردو زبان میں تصوف کے اعلیٰ خیالات نہ اس سے پہلے اور نہ اسکے بعد ایسی عمدہ نثر میں کسی نے نہیں لکھے۔

کتاب سراج المعرفتہ جس پر مرزا نے یہ دیباچہ لکھا ہے اُس میں منشی ہیرلال نے مرحوم بہادر شاہ کے ایما سے تمام اشغال و افکار۔ جو آنحضرت کے زمانے سے اس وقت تک سینہ بسینہ یا سفینہ بسفینہ چلے آتے تھے۔ ایک جگہ جمع کیے تھے۔ مرزا نے اپنے دیباچے میں دکھایا ہے کہ ان اشغال و افکار کو معرفت آلٰہی میں کیا دخل ہے اور کیونکر انکے ذریعے سے توحید وجودی تک سالک کی رسائی ہو سکتی ہے؛

دیباچہ مذکور کا اوّل و آخر کا حصہ چھوڑ کر صرف وہ مقام جس میں مرزا نے مذکورہ بالا مقصد کو بیان کیا ہے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

مرزا لکھتے ہیں کہ حق یوں ہے کہ حقیقت از روے مثال ایک نامہ درہم پیچیدہ سربستہ ہے کہ جسکے عنوان پر لکھا ہے "لاموثر فی الوجود الا اللہ" اور خط میں مندرج ہے "لا موجود الا اللہ" اور اس خط کا لانیوالا اور اسکا رازبتانیوالا وہ نامہ آور اور نام آور ہے کہ جس پر رسالت ختم ہوئی۔ ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی غامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں، آثاری، افعالی، صفاتی، ذاتی۔ انبیاے پیشیں صلوات اللہ علی نبینا وعلیہم اعلان مدارج سہ گانہ پہ مامور تھے۔ خاتم الانبیا کو یہ حکم ہوا کہ حجاب تعینات اعتباری اُٹھادیں، اور حقیقت بیرنگی ذات کو صورت الآن کما کان میں دکھادیں۔ اب گنجینۂ معرفت خواص امتِ محمدی کا سینہ ہے، اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ مفتاح باب گنجینہ ہے۔ زہے عامۂ مومنین کہ وہ اس کلام سے صرف نفی شرک فی العبادۃ مراد لیتے ہیں اور نفی شرک فی الوجود جو اصل مقصود ہے انکی نظر میں نہیں مگر جب لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہیں گے اسی توحید ذاتی کے اعتقاد کی قدمگاہ پر آرہیں گے۔ یعنی ہماری اس کلمے سے وہ مراد ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا۔ یہی حقیقت ہے شفاعت محمدی کی، اور یہی معنی ہیں رحمۃ للعالمین ہونے کے، اور اسی مقام سے ناشی ہے ندائے روح افزائے من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ"

قلم اگرچہ دیکھنے میں دوزبان ہے لیکن وحدتِ حقیقی کا راز داں ہے۔ گفتگوے توحید میں وہ لذت ہے کہ جی چاہتا ہے کہ کوئی سو بار کہے اور سو بار سُنے۔ نبی کی حقیقت ذوجہتین ہے۔ ایک جہت خالق کہ جس سے

اخذ فیض کرتا ہے اور ایک جہتِ خلق کہ جس سے فیض پہنچاتا ہے۔

نبی را دو وجہ است دلجوے خلق — یکے سوے خالق یکے سوے خلق
بداں وجہ از حق شود مستفیض — بدیں وجہ بر خلق باشد مفیض

یہ جو صوفیہ کا قول ہے کہ "الولایۃ افضل من النبوۃ" معنی اسکے صاف اور ازروے انصاف یہ ہیں کہ ولایت نبی کی وہ وجہ الی الحق ہے افضل ہے نبوت سے کہ وہ وجہ الی الخلق ہے۔ نہ یہ کہ ولایت عام افضل ہے نبوت خاص سے جس طرح نبی مستفیض ہے حضرت الوہیت سے اُسی طرح ولی مستنیر ہے انوار نبوت سے۔ مستنیر کی تفضیل منیر پر اور مستفیض کو ترجیح مفیض پر ہرگز معقول اور عقلا کے نزدیک مقبول نہیں اب وہ ولایت کہ خاصہ نبی تھی نبوت کے ساتھ منقطع ہوگئی مگر وہ فروغ کہ اخذ کیا گیا ہے مشکوٰۃ نبوت سے ہنوز باقی ہے۔ نقل و تحویل ہوتی چلی آتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے اور یہ سراجِ ایزدی تا صبح ظہور قیامت روشن رہیگا۔ اور اب اسی کا نام ولایت اور یہی مشعلِ طریق ہدایت ہے وہی حقیقت توحید ذاتی ہے کہ جو ازروے کلمۂ لا الہ الا اللہ مشہور عیونِ اعیان امت اور منظور نظر اکابر ملت ہوئی ہے۔ مگر وہ بات اب کہاں کہ ایکبار لا الہ الا اللہ کہے اور دل نورِ معرفت سے منور ہو جائے۔ اور وہ ضامنِ زبردست کہاں کہ قائل لا الہ الا اللہ کو اگرچہ اسکے معنی اچھی طرح نہ سمجھا ہو قدمگاہِ توحید پر قائم کردے یعنی رسولِ مقبول واجب التعظیم قائل انا احمد بلا میم علیہ التحیۃ والتسلیم اب سعادت بقدر ارادت ہے اور راحت بعد جراحت۔ سچ بھی تو ہے آدمی کیونکر سمجھ سکے اور بطلان بدیہیات کے جواز پر اُسکو کیونکر تسلی ہو، یعنی اس مجموع موجودات کو کہ افلاک و انجم و بحار و جبال اسی میں ہیں نیست و نابود محض جان لے اور تمام عالم کو ایک وجود مان لے۔

اے کردہ بہ آرائش گفتار بسیچ | ورزلف سخن کشودہ راہ خم و پیچ
عالم کہ تو چیز دیگرش می دانی | ذاتیست بسیط منبسط دیگر ہیچ

جب اولیاء اللہ نے کہ وہ اطبائے روحانی ہیں۔ دیکھا کہ نفوس بشری پر وہم غالب ہے اور بسبب استیلائے وہم کے مشاہدۂ وحدتِ ذات سے محروم رہے جاتے ہیں، ہر چند انکو سمجھائینگے راہ پر نہ آئینگے ناچار اشغال واذکار وضع کیے تا قوتِ متخیلہ اس میں الجھی رہے اور رفتہ رفتہ بیخودی طاری ہوجائے وحدتِ وجود اس طرح کی بات تو نہیں کہ نہ ہو اور ہم اسکو بجبر یا بہ تکلیف ثابت کیا چاہتے ہوں "دانی ہمہ اوست ور نہ دانی ہمہ اوست +

وہم صورت گری اور پیکر تراشی کررہا ہے اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے پس جب وہم شغل وذکر کی طرف مشغول ہوگیا بے شبہہ اپنے کام سے یعنی صورت گری اور پیکر تراشی سے معزول ہوگیا۔ بیخبری اور بیخودی چھاگئی اور وہ کیفیت جو موحدین کو بجز وفہم حاصل ہوتی ہے اس شاغل کے نفس کو بیخودی میں آگئی۔ ایک دریا میں جا نکر کودا، ایک کو کسی نے غافل کرکے ڈھکیل دیا انجام دونوں کا ایک ہے وہ لوگ جو وحدتِ وجود کو سمجھ لیں یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں مگر ہاں کم ہیں، اور مخفی ہیں، اور کہیں کہیں ہیں۔ اور ایسے نفوس کہ جو کسب حالت بیخودی کے واسطے محتاج اشغال واذکار ہیں، بہت ہیں بلکہ بیشمار ہیں"

نظم و نثر فارسی

فارسی لٹریچر میں ایشائی مذاق کے موافق جو دستگاہ مرزا نے بہم پہنچائی تھی

اور فارسی نظم اور فارسی نثر دونوں میں جو بلند پایہ اُنھوں نے حاصل کیا تھا۔ اُسکو اس زمانے میں کما حقہٗ، لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے۔ جبکہ اُس زمانے میں جب بہت سخن سنج اور نکتہ پرور موجود تھے۔ مرزا ہمیشہ زمانے کی ناقدردانی کی شکایت کرتے تھے، تو اب کیا اُمید ہو سکتی ہے کہ لوگوں کو اُنکی قدر جتائی جا سکے۔ ہم سے اگر کچھ ہو سکتا ہے تو صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ انکے ہر قسم کے کلام میں سے کچھ کچھ لطور نمونے کے پبلک کے سامنے پیش کر دیں، اور چونکہ فارسی زبان سے ملک میں عموماً اجنبیت ہو گئی ہے اس لیے جہاں جہاں ضرورت دیکھیں مرزا کے کلام کی شرح بھی کرتے جائیں اس سے شاید یہ فائدہ ہو کہ مرزا کی قوتِ متخیلہ میں جو غیر معمولی اُپج اور پرواز قدرت نے ودیعت کی تھی۔ سمجھدار آدمی اُسکا کسی قدر اندازہ کر سکیں، لیکن زبان اور بیان کی خوبی جو ایک وجدانی چیز ہے اور جسکے نقاد اور جوہری ملک میں کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔ اُسکی نسبت صرف مرزا کا یہ فصیح و بلیغ شعر لکھدینا کافی معلوم ہوتا ہے۔

بیا ور یدگر اینجا بود زباں دانے غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

البتہ ایک مختصر گر مرزا کے متعلق یہاں بتا دینا ضرور ہے جو اُن کا کلام دیکھتے وقت یاد رکھنا چاہیے۔ اگرچہ مرزا کو فارسی زبان میں (خواہ نظم ہو خواہ نثر) ہر قسم کے مضامین بیان کرنے پر ایسی ہی قدرت حاصل تھی جیسی کہ ایران کے ایک بڑے سے بڑے مشاق و ماہر و مسلم الثبوت اُستاد کو ہونی چاہیے لیکن جس طرح تمام ممتاز اور نامور شعرا میں خاص خاص مضامین کے ساتھ زیادہ مناسبت دیکھی گئی ہے۔ اسی طرح مرزا بھی اس کلیے سے مستثنےٰ نہ تھے۔ تصوّف حُبّ اہلبیت، فخر، شوخی و ظرافت، رندی و بیباکی، بیانِ رنج و مصیبت

وشکایت وزار نالی، اظہار محبت وہمدردی، حسن طلب، یہ چند میدان ایسے تھے جنکا بیان مرزا کے تمام اصناف سخن میں اکثر نہایت لطیف وملیح ومرقص واقع ہوا ہے۔ بیشک یہ بات اُنکے عشقیہ مضامین واخلاق وموعظت کے بیان میں عام طور پر نہیں پائی جاتی، کیونکہ عشق ومحبت اور تمام تعلقات ومعاملات عاشق ومعشوق کا بیان۔ جیسا کہ ظاہر ہے محض نیچرل سادگی اور بے تکلفی چاہتا ہے اور شاعرانہ صنعت سے جسکو مرزا نے جابجا شاعری کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ابا کرتا ہے۔ برخلاف اسکے مرزا اصناف کلام میں اپنی مصطلح شاعری کا سررشتہ ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے (الاماشاءاللہ) اسی لیے انکے عاشقانہ اشعار میں باوجود کمال جزالت اور متانت کے وہ گرمی اور تاثیر جو شعر کی جان اور غزل کا ایمان ہے عام طور پر نہیں پائی جاتی۔ اخلاق وموعظت کا بیان بھی اسی لیے موثر اور دلآویز نہیں ہے کہ وہ جب تک نہایت سادہ اور صاف اور شاعرانہ تکلفات سے پاک نہ ہو دلوں میں گھر نہیں کرسکتا۔ مگر اس سے مرزا کی اُستادی میں کچھ فرق نہیں آتا۔ جب سعدی کی رزم کی نسبت کہا جاتا تھا کہ "ایں شیوہ ختم است بر دیگراں" اور اُسکا قصیدہ بھی بہت پست سمجھا جاتا تھا۔ اور باایںہمہ سعدی کی استادی کو سب نے تسلیم کیا۔ تو مرزا کے خاص قسم کے بیانات کی نسبت ایسا کہنے سے اُستادی میں کیونکر فرق آسکتا ہے۔ یہ میزان جو ہم نے مرزا کے کلام کی نسبت بتائی ہے اسکو اُنکے کلیات نظم ونثر میں جانچنا چاہیے، نہ انتخابی اشعار میں جو اس کتاب میں درج کیے گئے ہیں۔

مرزا کی فارسی شاعری اور فارسی انشاپردازی کے متعلق یہ بات قابل غور ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے پچاس برس تک مرزا کو ایک ایسے فن کی تکمیل اور اس میں ترقی کرنے پر مستعد وسرگرم رکھا جسکا زمانے میں کوئی قدردان

نہ تھا۔ اُنکے ممدوح زیادہ تر انگلش گورنمنٹ کے ارکان واعیان تھے جو فارسی
زبان اور خاصکر فارسی شاعری سے محض اجنبی تھے، یا بادشاہ اور سلاطین
وامرا و روسا تھے جنکو مرزا کے فارسی قصیدے پڑھنے اور سمجھنے کی نہ فرصت تھی
نہ ضرورت۔ وہ شخص جسکا قصیدہ انوری وخاقانی کے قصیدوں سے ٹکر کھائے
جسکی غزل عرفی وطالب کی غزل سے سبقت لیجائے، جو رباعی میں عمر خیام کی
آواز میں آواز ملائے اور جسکی نثر کے آگے ابو الفضل اور ظہوری کی نثریں پھیکی
اور بے مزہ معلوم ہوں۔ اسکو بہادر شاہ کی سرکار سے صرف پچاس روپیہ ماہوار
ملتا تھا، اور وہ بھی چھ سات برس سے زیادہ نہیں ملا گورنمنٹ کے ارکان
واعیان کی مدح کے صلہ میں مرزا کو اُس خلعت کے سوا کبھی کچھ نہیں مرحمت
ہوا جو فوراً فروخت ہوکر سرکاری چپراسیوں کے انعام میں صرف ہو جاتا تھا۔
مرزا کے ماننے والے اور انکے فارسی کلام پر ایمان بالغیب رکھنے والے
بلاشبہہ ملک میں بیشمار تھے مگر ایسے خوش اعتقادوں کی کثرت اور اُنکی تحسین
وآفرین سے شاعر کا دل ہرگز نہیں بڑھ سکتا پس جبکہ ممدوحوں کی قدردانی کا
وہ حال ہو، اور مداحین کی مدح سرائی کا یہ رنگ، تو پھر وہ کیا چیز تھی جسکو
مرزا کی اصلی اور حقیقی ترقی کا باعث قرار دیا جائے۔ بات یہ ہے کہ شاعر کے
دل میں اصلی ترقی کا ولولہ نہ سلاطین وامرا کی داد ودہش سے پیدا ہوسکتا
ہے اور نہ خوش اعتقاد شاگردوں اور ماننے والوں کی کثرت سے بلکہ اسکا دل
بڑھانیوالی صرف دو چیزیں ہیں جو خواہی نخواہی اُسکو ترقی کرنے پر مجبور کرتی
ہیں، اولاً سچی استعداد اور فطری قابلیت جسکا اقتضا یہ ہے کہ اگر تمام
عالم میں ایک قدردان یا مخاطب صحیح نہ ہو تو بھی وہ اپنے جوہر ظاہر کیے بغیر
نہیں رہتی۔ جس طرح مور خواہ ویرانے میں ہو اور خواہ آبادی میں اُسکو مستی

اور نشاط کے عالم میں ناچنے سے گریز نہیں اسی طرح وہ شاعر جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہی پیدا ہوا ہے بغیر اسکے کہ ملک میں کوئی اسکی قدر کرے یا اسکے کمال کی داد دے اپنے ہنر کی تکمیل میں ہاتھ پاؤں مارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دوسرے اس فطری ملکہ کا تحریک دینے والا اور اس آگ کا پتھر سے نکالنے والا اس بات کا یقین ہے کہ سوسائٹی میں کچھ لوگ فی الحقیقۃ سخن فہم و سخن سنج موجود ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں فارسی زبان کا چراغ مدت سے ٹمٹما رہا تھا اور فارسی شاعری کی عمر طبیعی اختتام کے قریب پہنچ گئی تھی مگر حسن اتفاق سے اس اخیر دور میں چند صاحبان فضل و کمال خاص دار الخلافۃ دہلی میں ایسے پیدا ہو گئے تھے جو علم و فضل کے علاوہ شعر و سخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجہ کا رکھتے تھے ان چند صاحبوں سے میری مراد مولانا فضل حق خیرآبادی ثم الدہلوی، مولانا مفتی محمد صدر الدین خاں متخلص بہ آزردہ، مولوی عبد اللہ خاں علوی، مولوی امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن، نواب مصطفےٰ خاں حسرتی، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر، سید غلام علی خاں وحشت وغیرہم ہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کا مرزا کے عصر میں موجود ہونا انکی شاعری کے حق میں بعینہ ایسا تھا جیسا عرفی و نظیری کے حق میں خانخاناں، ابوالفتح، فیضی، اور ابوالفضل کا انکے زمانے میں ہونا۔

اگرچہ ان بزرگواروں میں بعض اصحاب ایسے بھی تھے جو ظاہرا مرزا کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے، لیکن چونکہ یہ سب لوگ سخن فہم اور سخن سنج تھے اسلیے جس طرح قدر دانوں کی تحسین و آفرین سے مرزا کا دل بڑھتا تھا اسی طرح نکتہ چینیوں کے خیال سے انکو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا، اور انکے دل پر اپنا نقش بٹھانے کے لیے اظہار کمال میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی، اور اس طرح قدر داں اور نکتہ چین دونوں انکی ترقی کا باعث تھے۔

لطیفہ مولانا فضل حق باایں ہمہ علم و فضل مرزا کو جس رتبے کا شاعر مانتے تھے اسکا اندازہ حکایت ذیل سے ہو سکتا ہے۔ مولانا کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ناصر علی سرہندی کے کسی شعر کے معنی مرزا صاحب سے جاکر پوچھے۔ انھوں نے کچھ معنی بیان کیے۔ اُسنے وہاں سے آکر مولانا سے کہا آپ مرزا صاحب کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی اس قدر تعریف کیا کرتے ہیں آج انھوں نے ایک شعر کے معنی بالکل غلط بیان کیے، اور پھر وہ شعر پڑھا، اور جو کچھ مرزا نے اسکے معنی کہے تھے بیان کیے۔ مولانا نے فرمایا کہ پھر ان معنوں میں کیا بُرائی ہے اُس نے کہا بُرائی تو کچھ ہو یا نہ ہو مگر ناصر علی کا یہ مقصود نہیں ہے۔ مولانا نے کہا اگر ناصر علی نے وہ معنی مراد نہیں لیے جو مرزا نے سمجھے ہیں تو اُس نے سخت غلطی کی۔

مرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں کم از کم شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے اور وہ مقطع یہ ہے

تو بدیں شیوۂ گفتار کہ داری غالب — گر ترقی نہ کنم شیخ علی را مانی

مومن خاں مرحوم نے جس وقت یہ مقطع سُنا اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے۔ مرزا کو ہم کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے۔

لطیفہ ایک صاحب نے جو مومن خاں مرحوم کی تعلیوں سے خوب واقف تھے یہ حکایت سنکر کہا کہ مومن خاں نے یہ اسلیے کہا کہ وہ اپنا رتبہ یقیناً شیخ علی حزیں سے برتر و بلند تر سمجھتے تھے ورنہ وہ ہرگز مرزا کو شیخ کے برابر تسلیم نہ کرتے۔

نواب مصطفےٰ خاں مرحوم ہمیشہ مرزا کو ظہوری و عرفی کا ہم پایہ کہا کرتے تھے اور صائب و کلیم وغیرہ سے انکو بمراتب برتر و بالاتر سمجھتے تھے نواب ضیاءالدین خاں کا مرزا کی نسبت یہ قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاچین (یعنی امیر خسروؒ) سے ہوئی اور ایک ترک ایبک (یعنی مرزا غالب)

پر اُسکا خاتمہ ہوگیا۔ سید غلام علی خاں وحشت مرزا کی نسبت کہتے تھے کہ اگر یہ شخص عربی کی طرف متوجہ ہو جاتا تو عربی شعر میں دوسرا متنبی یا ابو تمام ہوتا اور اگر انگریزی زبان کی تکمیل کرتا تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا۔

مولانا آزردہ ہمیشہ، مرزا کی طرزِ خاص کو جو اُنھوں نے ابتدا میں اختیار کی تھی ناپسند کرتے تھے، اور جو خیال کہ ابتدا میں مرزا کی نسبت مولانا کے خاطر نشین ہوگیا تھا وہ اخیر تک اُنکے دل میں کسی نہ کسی قدر باقی رہا۔ چنانچہ مرزا نے جو ایک فارسی قصیدہ مولانا ممدوح کی شان میں لکھا ہے اس میں اس مضمون کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا ہے کہ مولانا اُنکی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے قصیدے کی تمہید میں اپنے مصائب و آلام و شکایتِ روزگار وغیرہ کا بیان ہے، اسکے بعد مدح کی طرف اس طرح گریز کرتے ہیں۔

باچنیں اندہ کہ پر گفتیم و دل خالی نشد — خواجہ گر اندہ گسارِ من نبودے۔ وائے من
آنکہ در یکتائی وے در فنِ فرزانگی — متفق گردیدہ رائے بوعلی با رائے من
آنکہ چوں خواہد نبامش نامہ نامی ساختن — بر نگارد عقل فعالش کرم فرمائے من
دل بدیں وصفم نیا ساید سخن کوتہ کنید — آنکہ ننگ اوست بودن در سخن ہمتائے من

یعنی بوعلی سینا کا ممدوح کی یکتائی پر میرے ساتھ اتفاق رائے کرنا اور عقل فعال کا اسکو "کرم فرمائے من" لکھنا یہ سب باتیں اسکی مدح کے لیے کافی نہیں ہیں، بس مختصر یہ کہ وہ ایسا شخص ہے کہ شعر میں مجھ جیسے شخص کا ہمسر و ہمتا ہونا بھی اسکے واسطے موجب ننگ و عار ہے۔ اس میں قطع نظر اسکے کہ ممدوح کی اور اُس سے بھی زیادہ اپنی تعریف ایک نہایت لطیف پیرائے میں بیان کی ہے اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ ممدوح میری شاعری کو پسند نہیں کرتا۔

مرزا کی وفات سے چھ سات برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک روز نواب حسرتی

کے مکان پر۔ جبکہ راقم بھی وہاں موجود تھا آزردہ اور غالب اور بعض اور مہمان جمع تھے، کھانے میں دیر تھی، فارسی دیوان غالب کے کچھ اوراق پڑے ہوئے مرزا کی نظر پڑ گئے۔ ان میں ایک غزل تھی جسکے مقطع میں اپنے منکروں کی طرف خطاب کیا تھا۔ اور جسکا مطلع یہ ہے۔

نشاطِ معنویاں از شراب خانۂ تست　　　فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

مرزا نے وہ اوراق اُٹھا لیے اور مولانا آزردہ سے مزاح کے طور پر کہا "دیکھیے کسی ایرانی شاعر نے کیا زبردست غزل لکھی ہے" یہ کہکر پڑھنی شروع کی۔ اول کے دو تین شعروں کی مولانا نے تعریف کی، مگر پھر بعض قرائن سے سمجھ گئے کہ مرزا ہی کا کلام ہے۔ مسکرا کر جیسی انکی عادت تھی کہنے لگے "کلام مربوط ہے مگر نوآموز کا کلام معلوم ہوتا ہے" (سب حاضرین) ہنس پڑے۔ جب مقطع کی نوبت آئی۔ مرزا نے مولانا کی طرف خطاب کرکے دردناک آواز سے یہ مقطع پڑھا۔

توایکہ محو سخن گستران پیشینی　　　مباش منکر غالبؔ کہ در زمانۂ تست

اسوقت سب لوگ بہت متاثر ہوئے اور مولانا آزردہ شرما کر خاموش ہو رہے۔ صہبائی اور علوی بھی چونکہ مرزا بیدل کا تتبع کرتے تھے اور مرزا غالب نے اس طریقے کو بالکل چھوڑ دیا تھا اسلیے وہ مرزا کو اور مرزا انکو کم مانتے تھے لیکن چونکہ یہ تمام گروہ سخن فہموں اور سخن سنجوں کا تھا اور مشاعروں میں اکثر ایک دوسرے سے مٹ بھیڑ رہتی تھی۔ مرزا کو اپنے خیالات کی اصلاح اور اپنے اشعار کی تہذیب تنقیح میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی اور یہی اصلی ترقی کی بنیاد ہے۔

غزل | معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے فارسی غزل بھی اول مرزا بیدل وغیرہ کی طرز میں کہنی شروع کی تھی۔ چنانچہ اس قسم کی بہت سی غزلیں انکے دیوان میں اب تک موجود ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ طرز بدلتی گئی اور آخرکار عرفی، ظہوری،

نظیری اور طالب آملی وغیرہ کی غزل کا رنگ مرزا کی غزل میں پیدا ہو گیا - وہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں لکھتے ہیں جسکا ترجمہ یہ ہے اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تر ان لوگوں کی پیروی کرتا رہا جو راہِ صواب سے نابلد تھے - آخر جب ان لوگوں نے جو اس راہ میں پیشرو تھے - دیکھا کہ میں باوجودیکہ اُنکے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بے راہ بھٹکتا پھرتا ہوں، اُنکو میرے حال پر رحم آیا اور اُنھوں نے مجھ پر مربیانہ نگاہ ڈالی - شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بیراہ روی مجھکو جتائی طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا اسکو فنا کر دیا - ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زادِ راہ باندھا اور نظیری نے اس خاص روش پر چلنا مجھکو سکھایا - اب اس گروہ والا شکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلکِ رقاص چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار، جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا"

مرزا کے اس بیان سے پایا جاتا ہے کہ وہ غزل میں خاص نظیری کی روش پر چلتے تھے، مگر اُنکی غزلیات کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنکی غزل میں نہ صرف نظیری بلکہ عرفی، ظہوری، طالب آملی، جلال اسیر اور اُنکے دیگر متبعین کی غزل کا رنگ علی العموم پایا جاتا ہے - البتہ اس لحاظ سے کہ تصوف کا عنصر مرزا کے کلام میں نظیری سے کچھ کم نہیں ہے - اُنکی غزل بلاشبہہ نظیری کی غزل سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے - لیکن طرزِ بیان کے لحاظ سے نظیری کی کچھ خصوصیت نہیں معلوم ہوتی -

ناظم ہروی کی چند بیتیں مشہور ہیں جن میں عنصری سے لیکر جامیؔ تک ہر زمانے میں جو شاعر سر برآوردہ ہوا ہے اسکا نام لیا ہے - انکے آخر میں مرزا نے ایک بیت اپنی طرف سے اضافہ کی ہے - چونکہ اصل مثنوی اور اس پر مرزا کا اضافہ

فائدے اور لطف سے خالی نہیں ہے اسلیے ہم اسکو یہاں نقل کرتے ہیں ناظم کہتا ہے

شنیدم کہ در دور گاہِ کہن | شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی | بہ فردوسی آمد کلاہ مہی
چو فردوسی آورد سر در کفن | بہ خاقانی آمد بساطِ سخن
چو خاقانی از دارِ فانی گذشت | نظامی بہ ملکِ سخن شاہ گشت
نظامی چو جامِ اجل در کشید | سر چترِ دانش بہ سعدی رسید
چو اورنگِ سعدی فرو شد ز کار | سخن گشت بر فرقِ خسرو نثار
ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید | ز جامی سخن را تمامی رسید

اسکے بعد جو کمی ناظم کے بیان میں رہ گئی تھی اُسکو مرزا نے یوں پورا کیا ہے

"ز جامی بہ عرفی و طالب رسید | ز عرفی و طالب بہ غالب رسید"

اگرچہ مرزا نے بیدل اور اُنکے متبعین کی زبان اور اُنکے اندازِ بیان میں شعر کہنا بالکل ترک کردیا تھا اور اس خصوص میں وہ اہلِ زبان کے طریقے سے سرِ مو تجاوز نہیں کرتے تھے۔ مگر خیالات میں بیدلیت مدت تک باقی رہی۔ لیکن آخرکار تغزل میں بے انتہا گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہوگئی تھی۔ ہم اس مقام پر اُنکی غزلیات میں سے زیادہ تر صاف صاف اور کسی قدر وہ اشعار بھی نقل کرینگے جن کے بغیر مرزا کی طرزِ تخیل اور اُنکے شعر کی خصوصیت ظاہر نہیں ہوسکتی۔

انتخاب غزلیات فارسی

(توحید)

شاہدِ حسن ترا در روشِ دلبری | طرۂ پرخم صفات سوی میاں ماسوا

یعنی اگر تیرے حسن کو مثل شاہدانِ مجازی کے ایک شاہد قرار دیا جائے تو اُسکا طرۂ پرخم

گیا ہوگا؟ صفاتِ الٰہی - اور اسکا مدے میاں کیا قرار پائیگا؟ ماسوی اللہ شعرائے متصوفین صفاتِ الٰہی کو اکثر زلف وگیسو اور طرہ وکاکل کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور چونکہ ماسوی اللہ کو صوفیہ معدومِ محض جانتے ہیں اور معشوق کی کمر کو عشاق معدوم قرار دیتے ہیں - اسلیے شاہدِ حسنِ حقیقی کی کمر ماسوائے کو قرار دیا ہے -

آب نہ بخشی بزورِ خوں سکندر ہدر (توحید) جاں نہ پذیری بہ ہیچ نقدِ خضر ناروا

ہدر یعنی جلال - مشہور ہے کہ سکندر آبِ حیوان کی تلاش میں گیا تھا مگر ناکام رہا کہتا ہے کہ تو زور حکومت سے کسی کو پانی نہیں دیتا - پس اگر سکندر آبِ حیواں کے نہ ملنے کے سبب ہلاک ہوجائے تو ہو دوسرے مصرع میں خدا کی بے نیازی کا بیان ہے، یعنی خضر جان جیسی عزیز چیز مفت نذر کرتا ہے مگر تو اسکو قبول نہیں کرتا، اور اسلیے اسکو کسی طرح موت نہیں آتی -

بزم ترا شمع وگل خستگیٔ بوتراب (توحید) ساز ترا زیر وبم واقعۂ کربلا

یعنی تیرے ہاں وہی سب سے زیادہ مقرب اور برگزیدہ ہیں جو سب سے زیادہ نشانۂ حوادث ومصائب وآلام ہیں -

سادہ ز علم وعمل مہر تو ورزیدہ ام (توحید) مستیٔ ما پایدار بادۂ ما ناشتا

ناشتا نہار منہ رہنا اور کچھ نہ کھانا نہ پینا - دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ گویا میں نے شراب کا ایک قطرہ نہیں پیا مگر نشے میں ہر وقت چور رہتا ہوں، یعنی گو علم وعمل کچھ نہیں رکھتا مگر تیری محبت میں سرشار ہوں -

قطعہ

اے خاکِ درت قبلۂ جان ودل غالبؔ کز فیض تو پیرایۂ ہستی ست جہاں را

تا نام تو شیرینیٔ جاں دادہ بہ گفتن درخویش فرو بردہ دل از مہر زباں را

یعنی آنحضرت کا نامِ مبارک لینے سے زبان میں ایسی شیرینی اور حلاوت پیدا ہوئی

کہ دل نے پیار سے اسکو اپنے اندر اتار لیا۔

ما ہمائے گرم پروازیم فیض از ما مجوے (فخریہ) سایۂ ہمچوں دود بالا می رود از بالِ ما

یعنی ہمارے پرواز میں اسی قدر گرمی ہے کہ جس طرح دھواں آگ سے اوپر ہی اوپر جاتا ہے اسی طرح ہمارے پروں کا سایہ نیچے نہیں پڑتا بلکہ دھوئیں کی طرح پروں کے اوپر ہی اوپر جاتا ہے۔

حالِ ما از غیر می پرسی و منت می بریم (شوخی) آگہی بارے کہ آگہ نیستی از حالِ ما

یعنی تو جو ہمارا حال غیر سے پوچھتا ہے اسی بات کے شکر گزار ہیں، غنیمت ہے کہ تو اس بات سے تو آگاہ ہے کہ تجھکو ہمارے حال کی خبر نہیں۔

دل مایوس را تسکین بمردن میتواں دادن (امید) چہ امید ست آخر خضر دادریس و مسیحا را

خطے بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن (تصوف) زخود رفتیم و ہم با خویشتن بردیم دنیا را

وقفِ تاراجِ غم تست چہ پیدا چہ نہاں (عاشقانہ) ہمچو رنگ از رخ ما رفت دل از سینۂ ما

جوئے از بادہ و جوئے ز عسل دارد خلد (عاشقانہ) لبِ لعلِ تو ہم این ست و ہم آں ست مرا

خارہا از اثرِ گرمی رفتارم سوخت (فخریہ) منتے بر قدمِ راہ رواں است مرا

یعنی راہ کے تمام خار و خس میری گرم رفتاری سے جل گئے ہیں، پس رہگیروں کے قدم پر میرا احسان ہے کہ میں نے انکے لیے رستہ بالکل صاف کر دیا ہے۔ یہ تمام مضمون استعارے میں بیان ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ نازک خیالی کے طریقے میں جو الجھاؤ تھے وہ سب میں نے اس طریقے پر چلکر دور کر دیے ہیں اور آیندہ آنے والوں کے لیئے راہ صاف کر دی ہے۔

رہرو تفتہ در رفتہ بہ آبم غالب (تمثیل حالات خود) توشۂ برلب جو ماندہ نشانست مرا

یعنی میری مثال اس مسافر کی سی ہے جو گرمی اور لو سے جلا بھنا پانی کو دیکھکر بے اختیار اس میں کود پڑے اور ڈوب جائے، اور ندی کے کنارے

پر اسکا زاد راہ پڑا رہ جائے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہاں کوئی مسافر ڈوبا ہے۔ اس شعر میں مرزا نے اپنی خاص حالت کو تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ گویا یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں لوگوں نے مجھکو محض اٹکل اور قرائن سے پہچانا ہے، ورنہ میں جیسا کہ میں ہوں سب کی نظروں سے مخفی رہا ہوں۔

سایۂ وچشمہ بصحرا دمِ عیسیٰ دارد (دنیا) اگر اندیشۂ منزل نبود رہزنِ ما

یہ دنیا کی مثال ہے، یعنی اگر آخرت کا کھٹکا نہ لگا ہوا تو دنیا خاصی آرام کی جگہ ہے مگر چونکہ یہ کھٹکا لگا ہوا ہے اسلیے یہاں آرام کے ساتھ دم نہیں لیا جا سکتا۔

می پرد مور مگر جاں بسلامت ببرد (زار نالی کشا) تا چہ برق ست کہ شد نامزدِ خرمنِ ما

یعنی معلوم نہیں کہ ہمارے خرمن پر کونسی بجلی گرنے والی ہے کہ چیونٹے جان بچانے کے لیے پہلے ہی سے اُڑے جاتے ہیں تمثیل کے پیرائے میں یہ ظاہر کرتا ہے کہ دوست اور رفیق کوئی ہمارے رنج میں شریک نہیں ہوتا۔

سخنِ ما ز لطافت نہ پذیرد تحریر (فخریہ) نہ شود گرد نمایاں زرمِ توسنِ ما

یعنی ہمارے خیالات اسقدر لطیف ہیں کہ تحریر میں نہیں آسکتے گویا ہمارے گھوڑے کی دوڑ میں گرد و غبار بالکل نہیں اُٹھتا۔

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب (فخریہ) شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

یہ ملکۂ فطری کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ہم نے شاعری خود نہیں اختیار کی بلکہ ملکۂ شاعری نے خود ہمکو مجبور کیا کہ ہم اسکو اپنا فن قرار دیں۔

بابندۂ خود این ہمہ سختی نمی کنند (شکایت) خود را بزور بر تو مگر بستہ ایم ما

یہ خطاب خداوند حقیقی کی طرف ہے، یعنی کیا ہم زبردستی سے تیرے سر ہو گئے ہیں کہ ہم پر ایسی سختی کیجاتی ہے؟

بر روے حاسداں در دوزخ کشودہ رشک (فخریہ) از بہر خویش جنتِ در بستہ ایم ما

یعنی ہم اپنا کمال دیکھکر آپ ہی خوش ہوتے ہیں گویا ہم اپنے لیے جنت در بستہ ہیں پس
چونکہ ہماری جنت کی کیفیت سے اور جو اُس میں لذت و راحت ہے اُس سے حاسد لوگ
بیخبر ہیں اسلیے رشک سے انکی یہ حالت ہے کہ گویا اُنپر دوزخ کا دروازہ کھلا ہوا ہے

سوز ترا رواں ہمہ در خویشتن گرفت (القنوت) از داغ تہمتے بہ جگر بستہ ایم ما

یعنی تیرے سوز اور تیری آگ کو جان نے بالکل اپنے اندر لے لیا ہے، اور ذرہ برابر
کسی کے لیے اس میں سے حصہ نہیں چھوڑا۔ پس ہم جو اپنے جگر کو داغدار قرار دیتے ہیں
درحقیقت اس پر تہمت رکھتے ہیں۔

باچوں توئے معاملہ بر خویش منت است (عاشقانہ) از شکوۂ تو شکر گزارِ خودیم ما

روے سیاہِ خویش ز خود ہم نہفتہ ایم (زارنالی) شمعِ خموشِ کلبۂ تارِ خودیم ما

کدوے چوں نے یابم چناں بر خویشتن بالم (رندانہ) کہ پندارم سر آمد روزگارِ بے نوائیہا

یعنی ایک شراب کا بھرا ہوا تو نبا مجھکو ملجاتا ہے تو میں پھولا نہیں سماتا اور یہ سمجھتا ہوں
کہ بس اب بے سرو سامانی کا زمانہ ختم ہوا۔

سخن کوتہ۔ مرا ہم دل بتقوی مائل ست۔ اما (رندانہ) ز ننگِ زاہد افتادم بہ کافر ماجرائیہا

یعنی زاہد کے ساتھ ہم پیشہ ہونے سے عار آتا ہے اسلیے میری کفار کی سی حالت ہے ورنہ
تقوی کی طرف مجھے بالطبع میلان تھا۔

در مشرب حریفاں منست خود نمائی (اخلاق) بنگر کہ چوں سکندر آئینہ نیست جم را

حریفاں کا لفظ فارسی میں ایسا ہے جیسا اُردو میں یار لوگوں کا لفظ
لفظی معنی اسکے ہم پیشہ ہیں جب شراب خوار کسی کو حریف یا حریفاں کہتا ہے تو اس سے مراد
شراب خوار ہوتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہم شراب خواروں کے مشرب میں خود نمائی ممنوع ہے
دیکھو جمشید جو بادہ نوشی میں ضرب المثل ہے اسکے ہاں آلہ خود نمائی یعنے آئینہ
جیسا کہ سکندر کے ہاں تھا نہ تھا۔

زنا گسستی و با دگیراں گرو بستی (شوخی) بیا کہ عہد وفا نیست استوار بیا
یعنی اگر تو نے ہم سے توڑ کر غیروں کے ساتھ پیمان باندھا ہے تو اسکا خیال نہ کر اور بے تکلف ہمارے پاس چلا آ کیونکہ عہدِ وفا ٹوٹنے ہی کے لیے باندھا جاتا ہے وہ کبھی استوار نہیں ہوتا، جیسا کہ ہمارے ساتھ بندھ کر ٹوٹ گیا۔

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد (عاشقانہ) ہزار بار برو صد ہزار بار بیا
یعنی وداع میں اور لطف ہے اور وصل میں اور لذت ہے پس ہزار بار جا اور لاکھ بار آ۔ صد ہزار نے شعر کو زیادہ بلیغ کر دیا ہے۔ کیونکہ شاعر باوجودیکہ لذت میں وداع اور وصل دونوں کو یکساں قرار دیتا ہے مگر پھر بھی اپنے مطلب کی بات کو نہیں بھولا، اور جانے کے لیے ہزار بار اور آنے کے لیے صد ہزار بار کا لفظ استعمال کیا ہے

رواج صومعہ ہستی ست زینہار مرو (متصوفانہ) متاع میکدہ مستی ست ہوشیار بیا
یعنی صومعہ میں ہستی و پندار وغرور کا رواج ہے وہاں ہرگز نہ جا، اور میکدے کی جو کچھ پونجی ہے وہ مستی ہے، یہاں ذرا ہوشیار ہو کر یعنی ظرف عالی لیکر آنا چاہیے مستی حاصل کرنے کے لیے ہوشیار ہو کر آنا، اسمیں جو لطف ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را (رشک) رشک نگذارد کہ گویم نام را
گشتہ در تاریکی رہ زم نہاں (زارنالی) کو چراغے تا بجویم شام را
یعنی میرا دن اس قدر تاریک تھا کہ شام کی تاریکی اور اسکی تاریکی دونوں مل گئیں، اور یہ نہ معلوم ہوا کہ شام کب ہوئی اور دن کب چھپا۔

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود (خلوص) خوش بود گر دانہ نبود دام را
وہی مضمون ہے جو مرزا نے اردو میں اس طرح باندھا ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈالدو کوئی لیکر بہشت کو

دلستاں در خشم و غالب بوسہ جو (رندانہ) شوق نشناسد ہمے ہنگام را

مہتاب کفِ مار سیاہ ست شبم را (عاشقانہ) در ہجر طرب بیش کند تاب و تبم را

یعنی جدائی کے زمانے میں جو سامان عیش وطرب مہیا ہوتا ہے اس سے میری بیقراری اور تپش زیادہ بڑھتی ہے۔ پس چاندنی جو کہ عیش وطرب کی محرک ہے وہ میری رات کے حق میں مار سیاہ کے پھن کا حکم رکھتی ہے۔

گر بموج افتد گمانِ چین پیشانی مرا تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم (غیرت)

کہتا ہے کہ میں کیسا ہی پیاسا ہوں لیکن اگر دریا کی موج پر مجھکو یہ شبہہ بھی گزرے کہ دریا نے مجھے دیکھکر پیشانی پر بل ڈالا ہے تو میں غیرت کے مارے ساحل دریا پر جان دیدونگا مگر حلق تر نہ کرونگا۔

کہ دل عہدِ وفا نابستہ دادم دلستانے را (عاشقانہ) بپایانِ محبت یاد می آرم زمانے را

اس شعر میں اپنی نادانی اور حماقت ظاہر کرتا ہے، کہ اب انتہائے محبت میں جبکہ معشوق کی طرف سے ظلم وستم و بیوفائی کی کچھ حد نہیں رہی۔ مجھے یہ خیال آتا ہے کہ افسوس ہے جب میں نے دل اُسکو دیا تھا اسوقت وفاداری کا عہد نہ لے لیا۔ حالانکہ دل کا دینا اختیاری بات نہیں ہے، کہ جس طرح بیع وشرا اور لین دین کے وقت شرطیں کر لیتے ہیں اسی طرح دل دیتے وقت بھی کوئی شرط کر لیجاتی۔

از شب روی ماست شکوہِ عسس ما (رندانہ) آوازۂ شرع از سرِ منصور بلند است

شب روی۔ چوری کے لیے راتوں کو پھرنا۔ کہتا ہے کہ اگر مجرموں کو تعزیر نہ دیجائے تو شریعت کی شان وشوکت اور حکومت کی شکوہ ظاہر نہیں ہوتی۔ پس ہم جو مرتکب جرائم ہوتے ہیں گویا شریعت اور حکومت کی شان بڑھاتے ہیں۔

چندانکہ چکد از مژہ دادرس ما (زارنالی) وقت ست کہ خونِ جگر از درد بجوشد

کہتا ہے کہ میری مظلومی اب اس درجے کو پہنچگئی ہے کہ وہ وقت آن پہنچا ہے کہ خون جگر درد سے اسقدر اُبلے کہ حاکم دادرس کی پلکوں سے جا ٹپکے۔

در دہر فرو رفتہٴ لذت نتواں بود (آزادی) بر قند۔ نہ بر شہد نشیند مگسِ ما

یعنی ہم دنیا کی لذتوں سے متمتع ہوتے ہیں مگر اُن میں پھنستے نہیں، جیسے وہ مکھی جو قند پر بیٹھتی ہے کہ جب چاہا اُڑ گئی نہ وہ مکھی جو شہد پر بیٹھتی ہے کہ پھر اُبھر نہیں سکتی۔

بادہٴ مشکبوی ما، بید و کنارِ کشتِ ما (رندانہ) کوثر و سلسبیل ما، طوبیٰ ما، بہشتِ ما

حسرتِ وصل از چہ رو، چوں بخیال سرخوشیم (عاشقانہ) ابر اگر بایستد، بر لبِ جوست کشتِ ما

یعنی جبکہ ہم خیال دوست ہی میں مست و سرشار ہیں تو وصل کی حسرت کیوں کریں۔ اگر ابر نہیں برستا تو نہ برسے، ہماری کھیتی خود ندی کے کنارے پر ہے۔

بردہ صدر العین بسر بر سرِ صد ہزار خم (رندانہ) گر بنہی در آفتاب بادہ چکد ز خشتِ ما

بادہ اگر بود حرام۔ بذلہ خلافِ شرع نیست (رندانہ) دل نہ نہی بہ خوب ما طعنہ مزن بزشتِ ما

زہاد کی طرف خطاب ہے جو شرابخواری اور رندانہ بذلہ سنجی دونوں کو بُرا سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اگر شراب حرام ہے تو بذلہ سنجی تو خلافِ شرع نہیں ہے، اگر تو شراب کو جو ہماری نفیس چیز ہے پسند نہیں کرتا تو بذلہ سنجی جو ہماری ادنیٰ درجے کی چیز ہے اُس پر تو طعن مت کر۔

تضمین مصرعِ طرح

گفت بحکم حسرتی غالبِ خستہ ایں غزل شاد بہیچ می شود طبع وفا سرشتِ ما

یہ غزل غالباً اُس زمانے کی لکھی ہوئی ہے جبکہ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم متخلص بہ حسرتی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا اور علوی و صہبائی و آزردہ، اور مومن اور نیّر وغیرہم سب اس میں شریک ہوتے تھے اس مقطع میں مرزا نے مصرعِ طرح کو تضمین کیا ہے اب اسکے یہ معنی ہو گئے کہ ہم سے جو اس طرح پر غزل لکھنے کی فرمایش کی گئی ہماری طبع وفا سرشت دوست کے اتنے ہی التفات سے شاد شاد ہو جاتی ہے۔

مردم ز فرطِ ذوق و تسلّی نمی شوم (عاشقانہ) یارب کجا برم لبِ خنجر ستائے را

کہتا ہے کہ دوست کے خنجر نے وہ مزا دیا کہ اسکی تعریف کرتا کرتا مر گیا، اور پھر بھی

تسلی نہ ہوئی۔ آلہی اس لب خنجر ستا کو کہاں لیجاؤں کہ جہاں جاکر تسلی ہو۔

شبم تاریک و منزل دُور و نقش جادہ ناپیدا (رندانہ) بلاکم جلوۂ برقِ شراب گاہ گاہے را

پہلے مصرع میں اپنی مشکلات کو شب تاریک وغیرہ کی تمثیل میں بیان کیا ہے دوسرے مصرع میں کہتا ہے کہ میں بلاک یعنی قربان ہوں برق شراب کی چمک پر جو کبھی کبھی چمک جاتی ہے اور اس اندھیرے میں کچھ روشنی نظر آجاتی ہے۔ مطلب یہ کہ شراب جو کبھی کبھی ملجاتی ہے صرف اُسکی بدولت میرا غم غلط ہوتا ہے۔

بے باندازہ حرام آمدہ ساقی برخیز (رندانہ) شیشۂ خود بشکن برسر پیمانۂ ما

برخلاف عقل و شرع کے کہتا ہے کہ اے ساقی شراب اعتدال کے ساتھ پینی حرام ہے تو اُٹھ اور اپنا شیشہ یعنی بوتل یا صراحی ہمارے گلاس پر دے مار۔ اس شعر میں افراط شوق کی تصویر کھینچی ہے خواہ کسی چیز کا شوق ہو جب کسی چیز کی طلب اور خواہش حد سے گزر جاتی ہے تو اس بات کی حس نہیں رہتی کہ اپنے ظرف کے موافق اُسکی خواہش کیجائے جب پانی کی پیاس نہایت شدت سے ہوتی ہے تو پیاسا دریا کو دیکھکر یہ چاہتا ہے کہ سارے دریا کو پی جاؤں۔ پس گو کہ مضمون شعر شراب کی تمثیل میں بیان کیا گیا ہے لیکن اسکا مصداق ہر چیز کا مشتاق قرار پاسکتا ہے۔

مو برآید ز کفِ دست اگر دہقاں را (ز ارنالی) نیست ممکن کہ کشد ریشہ سر از دانۂ ما

ظاہر ہے کہ انسان کی ہتیلی میں بال پیدا ہونے کی قابلیت نہیں رکھی گئی۔ کہتا ہے کہ اگر کاشتکار کی ہتیلی میں بال بھی نکل آئیں تو بھی یہ ممکن نہیں کہ ہمارا دانہ پھوٹ کر اُس میں سے ریشہ نکل آئے یعنی ہماری کوششوں کا مشکور ہونا محال ہے۔

خرابیم و رضائش در خرابیہای ما باشد (تصوف) ز چشم بد نگہدار د خدا ما دوست کاماں را

خراب۔ مست، ویران، اور تباہ، تینوں معنوں میں آتا ہے۔ دوست کام وہ شخص جسکی حالت دوستوں کی خواہش کے موافق ہو یعنی عمدہ حالت ہو۔ کہتا ہے کہ ہم

خود بھی خراب ہیں اور دوست کی خوشی بھی یہی ہے کہ خراب حال رہیں پس ہم دوست کاموں کو جنکی حالت دوست کی مرضی کے موافق ہے خدا تعالیٰ نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔

بسا افتادۂ سرمست و بسا افتادہ در طاعت (مناجات) تو دانی تا بہ لطف از خاک برداری گدایاں را

عالم آئینۂ راز ست چہ پیدا چہ نہاں (تصوف) تاب اندیشہ نداری بہ نگاہے دریاب

یعنی اگر تو سوچ نہیں سکتا تو نگاہ ہی سے عالم کو دیکھ کہ اسکا ظاہر و باطن سب مظہرِ اسرار الٰہی ہے۔

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار (تصوف) نیست گر صبح بہاری شب ماہے دریاب

گر پس از جور بہ انصاف گراید چہ عجیب (شوخی) از حیا روے بما گر ننماید چہ عجیب

کہتا کہ ظلم و ستم کے بعد اگر وہ انصاف کی طرف مائل ہو جائے تو کچھ عجب نہیں یعنی اپنے پچھلے ظلم یاد کرکے حیا سے ہم کو منہ نہ دکھلائے تو تعجب نہیں مطلب یہ کہ انصاف بھی کرے گا تو اس طرح کریگا کہ ہم اسکے دیکھنے سے محروم رہیں۔

بودش از شکوہ خطر ورنہ سری داشت بمن (شوخی) بمزارم اگر از مہر بیاید چہ عجب

خیالی پلاؤ پکاتا ہے تاکہ اسی طرح اپنے دل کو تسکین دے۔

باچنیں شرم کہ از ہستیِ خویشش باشد (معذرت) غالب از رخ برہِ دوست نساید چہ عجب

یعنی اس شرم سے کہ اپنے تئیں غلطی سے موجود سمجھ رہا ہے اگر غالب خدا کے آگے سجدہ نہ کرے تو کچھ تعجب نہیں۔

(غزل نعتیہ)

حق جلوہ گر ز طرز بیانِ محمدؐ است	آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ است
آئینہ دارِ پرتوِ مہر ست ماہتاب	شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ است
تیرِ قضا ہر آئنہ در ترکشِ حق است	اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ است
دانی اگر بہ معنی لولاک وارسی	خود ہر چہ از حق ست ازانِ محمدؐ است
ہر کس قسم بدانچہ عزیز است می خورد	سوگندِ کردگار بجانِ محمدؐ است

واعظ احدیث سایۂ طوبیٰ فرو گزار   کاینجا سخن ز سرو روانِ محمدؐ است
بنگرد و نیمہ گشتنِ ماہ تمام را   کان نیمہ جنبشے ز بنانِ محمدؐ است
غالبؔ ثنای خواجہ بہ یزدان گذاشتیم   کان ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

یہ غزل مرزا نے اپنی عام طرز کے خلاف نہایت صاف اور بلیغ لکھی ہے۔ راقم نے مرزا کی زندگی ہی میں اس غزل کی تخمیس کی تھی اور مرزا صاحب کو بھی دکھائی تھی۔ چونکہ وہ تخمیس ابتک شایع نہیں ہوئی اسلیئے مقتضائے مقام یہ ہے کہ اسکو بھی اس غزل کیساتھ نقل کردیا جائے۔

اعجاز از خواصِ لسانِ محمدؐ است   عین الحیوٰۃ گم بہ دہانِ محمدؐ است
گر نور و گر ہدیٰ کہ ازانِ محمدؐ است   حق جلوہ گر ز طرز بیانِ محمدؐ است
آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ است

دانی ز پیشِ چشم تو برخیزد ار حجاب   کز نورِ شمع پردۂ فانوس راست تاب
باشد ظہورِ روشنیِ عارض از نقاب   آئینہ دار پرتوِ مہر ست ماہتاب
شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ است

لطف خدا ست گر بسر کس نہاد دست   قہر خدا ست چوں ز سر کین بجملہ جست
داند کسیکہ شد ز مے مارمیت مست   تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است
اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ است

گوئی اگر بعالمِ ادراک وارسی   بینی اگر بدیدۂ دراک وارسی
سنجی اگر بمرتبۂ خاک وارسی   دانی اگر بمعنیِ لولاک وارسی
خود ہر چہ از حق است ازانِ محمدؐ است

شاہد بقتلِ عاشق و عاشق بخال و خد   مجنوں بپاے لیلی و لیلیٰ بہ فرقِ خود
مومن بہ آلِ احمد و آتش بروحِ جد   ہر کس قسم بد انچہ عزیز ست میخورد
سوگندِ کردگار بجانِ محمدؐ است

اے خامہ وصفِ قامتِ معشوقِ کم نگار
اے دل سخن زراستِ قداں درمیاں میار
قمری! از ذکرِ سرو نفس را نگاہ دار
واعظ! حدیثِ سایۂ طوبیٰ فرو گزار
کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمدؐ است

حکمش بمہر و ماہ روانست چوں قضا
دیدی کہ بازگشتنِ خورشید بر قضا
بودہ است براشارۂ ابروی مصطفیٰؐ
بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہ بتمام را
کاں نیمہ جنبشے زبنانِ محمدؐ است

آنجا کہ از مناقبِ عترت سخن رود
وزآل واز صحابۂ امت سخن رود
واں کاینہمہ زختمِ رسالت سخن رود
ور خود زنقشِ مُہرِ نبوت سخن رود
آں نیز نامور زنشانِ محمدؐ است

ہمت بمدحِ شہ من وحالی گماشتیم
گفتیم واز نگاشتنی ہا نگاشتیم
چوں کام ولب فراخورِ وصفش نداشتیم
غالب ثنای خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

بیخود بوقتِ ذبح پتیدن گناہِ من
(شوخی) دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہِ کیست
یاد واز عدو نیارم وا اینہم ز دوربینی ست
(شوخی) کاندر دلم گزشتن بادوست ہمنشینی ست

کہتا ہے میں جو رقیب کا خیال دل میں نہیں لاتا یہ دوربینی کی بات ہے کیونکہ میرے دل میں ہر وقت دوست رہتا ہے اگر رقیب کا خیال دل میں آئیگا تو گویا رقیب دوست کے ساتھ ہمنشین ہو جائیگا۔

من سوی او بہ بینم واند ز بیحیائی ست
(شوخی) او سوی من نہ بیند وانہم ز شرمگینی ست
چہ فتنہ ہا کہ دراندازۂ کمانِ تو نیست
(عاشقانہ) قیامت ست! ادل دیر مہربانِ تو نیست

رواں فدای تو! نامے کہ بردۂ ناصح!
(عاشقانہ) زہے لطافتِ ذوقیکہ درمیانِ تو نیست
چونکہ ناصح ترکِ عشق کی نصیحت کرتا ہے اسلیے معشوق کا نام عاشق کے سامنے اچھی

طرح نہیں لیتا۔ شاعر ناصح کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے کہ میری جان تجھ پر قربان ہو تو نے کسکا نام لیا؟ وہ کیسی لطافت اور لذت ہو گی جو کہ تیرے بیان میں نہیں ہے، جطرح اسکا نام لینا چاہیے تھا اگر اُس طرح تو بھی وہ نام لیتا تو کیسی لطافت اور لذت تیرے بیان میں ہوتی۔ مگر چونکہ ناصح نے بُری طرح سے اُسکا نام لیا تھا۔ اسلیے کہتا ہے کہ وہ کیسی لطافت ہو گی جو تیرے بیان میں نہیں ہے۔

دل از خموشیِ لعلت امیدوار چرا است (عاشقانہ) چہ گفتۂ بہ زبانے کہ در دہان تو نیست

معشوق نے منہ سے کچھ نہیں کہا مگر اُسکی نگاہ یا تبسم یا کسی اور ادا سے اسکے التفات یا وصل کی امید بندھی ہے۔ پس کہتا ہے کہ تیرے لعل لب کی خاموشی سے میرا دل اسقدر کیوں امیدوار ہے تو نے اُس زبان سے جو تیرے منہ میں نہیں ہے کیا کہہ دیا ہے جس سے اُسکو اُمید بندھی ہے۔

گمان زلیست بود بر منت ز بیدردی (عاشقانہ) بداست مرگ، ولے بدتر از گمان تو نیست

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست (اخلاق) قعر دریا سلسبیل و روے دریا آتش ست

دوسرے مصرع میں عرفی کے مضمون کو اُلٹا ہے۔ اُس نے اس لحاظ سے کہ دریا کے اوپر کی سطح سے راحت حاصل ہوتی ہے اور دریا کی تہ میں پہونچنے سے وہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے جو آگ میں جل جانے سے ہوتا ہے۔ یوں کہا تھا

"روی دریا سلسبیل و قعر دریا آتش ست"

مرزا کہتے ہیں کہ بلا کا خوف خود بلا سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ چنانچہ دریا میں انسان جب ہی تک بیچین رہتا ہے جب تک کہ ڈوب جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جب ڈوب گیا پھر کچھ بھی بیچینی باقی نہیں رہتی۔ پس یوں کہنا چاہیے کہ

"قعر دریا سلسبیل و روے دریا آتش ست"

باک خور امروز زنہار از پے فردا منہ (شوخی) در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش ست

جو لوگ شراب طہور کی اُمید پر دنیا میں شراب نہیں پیتے وہ گویا جو شراب آج نہیں پیتے اسکو کل کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں۔ پس اُن سے کہتا ہے کہ "پاک خور امروز" یعنی سب آج ہی نبیڑ دے اور کل کے لیے مت رکھ، کیونکہ شریعت میں شراب آج تو پانی ہے اور کل وہی آگ ہو جاویگی۔

زوہم نقش خیالی کشیدہ ورنہ (تصوف) وجودِ خلق چو عنقا بدہر نایاب است

قوی فتادہ چو نسبت۔ ادب مجو غالب (تصوف) ندیدہ کر سوے قبلہ پشت محراب است

یعنی جب تعلق اور نسبت قوی ہو جائے تو پھر آداب ظاہری کی توقع نہ رکھنی چاہیئے۔ دیکھو! قبلہ کی طرف پشت کرنا ہر ایک کے لیے خلاف ادب ہے، مگر محراب مسجد جسکو قبلہ سے نہایت مضبوط تعلق ہے اُسکی پشت ہمیشہ قبلہ ہی کی طرف رہتی ہے

ہرچہ فلک نخواستہ است ہیچکس از فلک نخواست (شوخی) ظرفِ فقیہ مے نہ جست بادہ ما گزک نخواست

بحث و جدل بجای ماں میکدہ جوی کاندراں (تصوف) کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

بجاے ماں بمعنی بجاے دار یعنی بحث و جدال کو یونہیں رہنے دے اور میخانے میں جاکہ وہاں نہ جمل کا جھگڑا ہے نہ فدک کا قصہ ہے۔ جمل سے مراد جنگِ جمل ہے جس میں حضرت عائشہ جمل یعنی اونٹ پر سوار ہو کر حضرت امیر سے لڑنے گئی تھیں۔ فدک ایک کھجور کا باغ تھا جسپر حضرت سیدۃ النساء فاطمہ زہرا نے حضرت ابو بکر صدیق کی خلافت میں وراثت کا دعویٰ کیا تھا یہ دونوں جھگڑے منجملہ ان بیشمار نزاعوں کے ہیں جن پر سُنی شیعوں میں ہمیشہ سر پھٹول رہتی ہے۔

دل جلوہ میدہد ہنرِ خود در انجمن (فخریہ) رحمے مگر بجان حسودش نماندہ است

یعنی جب تک میں اپنے تئیں چھپاتا تھا حاسدوں کو کچھ آزار نہیں پہنچتا تھا اب علی الاعلان اپنے ہنر ظاہر کرنے لگا ہوں گویا اب حاسدوں کی جان پر رحم باقی نہیں رہا۔

غالب زباں بُریدہ و آگندہ گوش نیست (بید ماغی) امّا دماغ گفت و شنودش نماندہ است

بلبل! دولت بنالۂ خونیں بہ بند نیست (عاشقانہ) آسودہ زی کہ یار تو مشکل پسند نیست

یعنی اے بلبل تو اپنے نالۂ خونیں کے سبب ضیق میں نہیں ہے، جب چاہتی ہے نالہ کرتی ہے۔ پس تو آرام سے زندگی بسر کر کہ تیرا یار یعنی گل مشکل پسند نہیں ہے۔ بخلاف ہمارے کہ ہمکو رونے اور فریاد کرنے کی بندی ہے، حالانکہ نالۂ خونیں سے دل بھرا ہوا ہے

بیخود بزیر سایۂ طوبیٰ غنودہ اند (تصوف) شبگیر رہروان تمنا بلند نیست

یعنی جو لوگ امانی و آمال کے پھندے میں گرفتار ہیں ان کا سفر کچھ لمبا چوڑا نہیں ہے انکا منتہاے مقصود طوبیٰ کے سایے میں آرام کرنا ہے۔

اختری خوشتر از نیم بجہاں می بایست (اشکایت سخن) خرد پیر مرا بخت جواں می بایست

تا بتنک مایہ بدریوزہ خود آرا نہ شود (قیمت سخن) نرخ پیرایۂ گفتار گراں می بایست

گفتم بروزگار سخنور چو من بسی ست (فخریہ) گفتند اندریں کہ تو گفتی سخن بسی ست

مشکیں غزالہا کہ نہ بینی بہ ہیچ دشت (فخریہ) در مرغزار ہاے خطا و ختن بسی ست

در صفحۂ نبودم ہمہ آں چہ در دل ست (فخریہ) در بزم کمتر ست گل و در چمن بسی ست

دراز دستیِ من جامے ار فگند چہ عیب (رندانہ) ز بینش دلق درع با ہزار پیوند است

نگفتہ کہ بہ تلخی بساز و پند پذیر (رندانہ) بروکہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پند است

یہ خطاب ناصح کی طرف ہے۔

اگر نہ بہر من۔ از بہر خود عزیزم دار (عاشقانہ) کہ بندہ۔ جو بیِ او خوبیِ خداوند ست

درگرم روی سایۂ و سرچشمہ نجوئیم (تصوف) با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

یعنی ہمکو آگے جانے کی جلدی ہے ہم سایہ و سرچشمہ یعنی طوبیٰ اور کوثر پر آرام نہیں لے سکتے۔

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ ست (تصوف) بردار تواں گفت بہ ممبر نتواں گفت

کارے عجیب افتاد بدیں شیفتہ مارا (شوخی) مومن نہ بود غالبؔ و کافر نتواں گفت

گفتم ز کہ پرسم اثرِ عمر گزشتہ (رندانہ) ساقی بہ قدح بادۂ دہ سالہ فرو ریخت

در قالبِ ملّا اثرش پردہ کشا شد (شوخی) خاکے کہ قضا در تنِ کو سالہ فرو ریخت

گر منافق - وصل ناخوش - ور موافق ہجر تلخ (دوستی) دیدہ واغم کرد روے دوستاں دیدن نداشت

یعنی دوستوں کا منہ دیکھنا اور اُن سے تعارف پیدا کرنا نہیں چاہیے تھا کیونکہ جو منافق ہیں اُنکا ملنا ناگوار ہے اور جو موافق ہیں انکی جدائی تلخ ہے۔

بُردم آدم از امانت ہر چہ گردوں بر نتافت (انسان) ریخت مے بر خاک چوں در جام گنجیدن نداشت

یعنی بار امانت میں سے جو کچھ آسمان سے نہ اُٹھ سکا وہ انسان نے اُٹھا لیا گویا جب شراب جام میں نہ سما سکی تو خاک پر گرا دی۔ خاک کا لفظ انسان کے لیے اور جام آسمان کے لیے کس قدر مناسب واقع ہوا ہے۔ اور بار امانت جو انسان پر ڈالا گیا اُس کی تشبیہ اُس شراب سے جو پیالہ چھلکنے سے زمین پر گر پڑے۔ کیسی لطیف و پاکیزہ تشبیہ ہے

قفس و دام را گنا ہے نیست (تصوف) ریختن در نہادِ بال و پر ہست

نہاد - جبلت کو کہتے ہیں۔ قفس اور دام دونوں جانور کے لیے تکلیف اور اذیت کے مقام ہیں جہاں اکثر جانور تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے اور اُسکے بال و پر گر جاتے ہیں۔ یہاں قفس اور دام سے دنیا اور اُسکی تکلیفات مراد ہیں۔ کہتا ہے کہ قفس اور دام پر کچھ الزام نہیں ہے بال و پر گرنے ہی کے لیے بنے ہیں اور جاندار مرنے ہی کے لیے پیدا ہوا ہے۔

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند (تصوف) ہم خزاں ہم بہار در گذر است

یعنی خزاں اور بہار دونوں رفتنی ہیں، اُس میں پتے جھڑتے ہیں تو اس میں پھول جھڑتے ہیں۔

بے تو گر زیستہ ام سختی ایں درد بسنج (عاشقانہ) بگذر از مرگ کہ وابستہ ہنگامے ہست

یعنی موت کے لیے تو ایک وقت معین ہے اس سے قطع نظر کر اور یہ خیال مت کر کہ اب تک مرا کیوں نہیں۔ بلکہ یہ دیکھ کہ اب تک زندہ کیونکر رہا اور کیونکر جدائی کے رنج اور تکلیف کو برداشت کیا۔

کیست در کعبہ کہ رطلے ز نبیذم بخشد (رندانہ) در گروگاں ہلبد جامۂ احرامے ہست

رطل، پیمانۂ شراب۔ نبیذ، شراب۔ گروگان، وہ شے جسکو گرو رکھیں۔ جامۂ احرام، وہ بن سِلا کپڑا جو مناسک حج کے ختم ہوئے تک حاجی پہنے رہتے ہیں۔

نہ بدر جستہ شرارو نہ بجا ماندہ رماد (عاشقانہ) سوختم لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت

رماد، راکھ۔ پہلا سوختم، لازمی۔ دوسرا سوختم، متعدی۔ کہتا ہے میں جل تو ضرور گیا مگر معلوم نہیں اُس نے کس طرح مجھ جلادیا، نہ کوئی پتنگا اُڑا اور نہ راکھ باقی رہی۔

با دوست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام (عاشقانہ) داند کہ حور و کوثر و دار السلام چیست

دوست کو حور سے۔ بادہ کو کوثر سے۔ اور خلوت کو دار السلام یعنی جنت سے تشبیہ دی ہے۔

دلخستۂ غمیم و بود مے دوا ے ما (رندانہ) با خستگان حدیث حلال و حرام چیست

(شوخی رندانہ) (یعنی بیماران و معذوراں)

از کاسۂ کرام نصیب است خاک را تا از فلک نصیبۂ کاس کرام چیست

نیکی ز تست از تو نخواہیم مزدِ کار (شوخی) ور خود بدیم کارِ تو ایکم انتقام چیست

یعنی اگر ہم نے نیکی کی ہے تو وہ تیری ہی طرف سے ہے اُسکی اُجرت ہم نہیں چاہتے اور اگر ہم بد ہیں تو تیرا فعل یعنی تیرے بنائے ہوے ہیں۔ پھر سزا کس لیے ہے؟

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت (شوخی) پرسد چرا کہ نرخِ مے لعل فام چیست

یعنی غالب کے گھر میں صرف ایک پرانا خرقہ اور ایک مصحف تھا اور کچھ نہ تھا پس اُس نے انکو اگر بیچ نہیں دیا تو شراب کا بھاؤ کیوں پوچھتا پھرتا ہے۔ بہم فروخت کے لفظ میں یہ شوخی رکھی ہے کہ اگر دونوں کو ایک ساتھ نہ فروخت کیا ہوگا تو شراب کی قیمت نہ ادا ہو سکے گی۔

لطفِ خدائے۔ ذوقِ نشاطش نمیدہد (عاشقانہ) کافر دلے کہ باستم دوست خو گرفت

یعنی وہ کافر دل جو معشوق کے ظلم سہنے کا عادی ہو اُسکو خدا کی مہربانی میں بھی مزا نہیں آتا۔ بظاہر یہ ایک شاعرانہ شوخی معلوم ہوتی ہے، مگر درحقیقت یہ ایک فیکٹ ہے جو ہوا و ہوس کے کوچے میں ہمیشہ گذرتا رہتا ہے۔ بوالہوس لوگ سب ذلتیں گوارا کرتے ہیں، جدائی کے صدمے، رشک کی جلن، ذلت و بے آبروئی معاشیق کی بے التفاتی و بے اعتنائی وغیرہ سب کچھ سہتے ہیں مگر ہوا و ہوس سے باز نہیں آتے، اور پارسائی و عفت کا طریقہ جو باعث خوشنودی خدا ہے اُسکو اختیار نہیں کر سکتے۔

رضواں چو شہد و شیر بغالب حوالہ کرد (شوخی) بیچارہ بازوا و مے مشکبو گرفت

رموزِ دیں نشناسم درست۔ و معذورم (") نہادِ من عجمی و طریقِ من عربی است

یعنی مَیں پیدا تو عجم میں ہوا ہوں اور میرا مذہب عربی ہے پس اگر اصول مذہب سے واقف نہ ہوں تو مجھکو معذور سمجھنا چاہیے۔

نشاطِ جم طلب از آسماں نہ شوکتِ جم (ترک فضول) قدح مباش زیاقوت بادہ گر عنبی ست

دوسرا مصرع مثال ہے پہلے مصرع کے مضمون کی۔ یعنی انگوری شراب چاہیئے جس سے جمشید کا سا عیش حاصل ہو یاقوت کا پیالہ جس سے جمشید کی سی شاہانہ شوکت ظاہر ہو اگر نہ میسر ہو تو نہ سہی۔

ہر آنچہ در نگری جز بہ جنس مائل نیست (فخریہ) عیارِ بیکسی من شرافتِ نسبی است

یعنی جسکو دیکھیے اپنی جنس کی طرف مائل ہے۔ چونکہ شرافت نسب میں کوئی میری مثل نہیں ہے اسلیے میری طرف کوئی مائل نہیں، اور یہی میری بیکسی کی وجہ ہے۔

نشاطِ معنویاں از شرابخانۂ تست (تصوف) فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

اس تمام غزل میں معشوقِ حقیقی کی طرف خطاب ہے۔

بجام و آئینہ حرفِ جم و سکندر چیست (تصوف) کہ ہر چہ رفت بہر عہد در زمانۂ تست

یعنی یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ جام جہاں نما جمشید کے عہد میں تھا اور آئینہ سکندر کے عہد میں کیونکہ جو کچھ جس زمانے میں گزرا وہ تیرے ہی زمانے میں تھا۔

ہم از احاطۂ تست اینکہ در جہاں مارا (تصوف) قدم بہ بتکدہ و سر بر آستانۂ تست

یعنی تو جو تمام عالم پر محیط ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم تو بتکدے میں مگر ہمارا سر تیرے آستانے پر رہے۔

سپہر را بہ تاراج ما گماشتہ (تصوف) نہ ہر چہ دزد زما بُرد در خزانۂ تست؟

یعنی کیا یہ بات نہیں کہ جو کچھ لٹیرا ہم سے لوٹ کر لے گیا ہے وہ تیرے خزانے میں موجود ہے؟

مرا چہ جرم گر اندیشہ آسماں پیماست (؟) نہ تیز گامیِ توسن ز تازیانۂ تست!

اس شعر میں ضمناً اپنے خیال کی بلند پروازی کا اظہار ہے، اور اصل مقصد یہ ہے کہ جو کچھ ہے وہ تیری ہی طرف سے ہے۔ یعنی اگر میرا خیال اپنی حد سے تجاوز کر کے عالمِ بالا کے اسرار و غوامض میں دخل دیتا ہے تو میرا کیا قصور ہے، تیرے تازیانے نے گھوڑے کو تیز رفتار کر دیا ہے۔

شباب و زہد ما چہ ناقدروانی ہستی ست (شوخی) بلا بجانِ جوانانِ پارسا ریزد

آخرِ منزلِ نخست خوی تو راہ می زند (تصوف) اولِ منزلِ دگر بوئے تو زاد میدہد

یعنی سالک جب تیری راہ میں قدم رکھتا ہے اور پہلی منزل قریب ختم ہونے کے ہوتی ہے تو سخت سخت مشکلات اور امتحانات کا سامنا ہوتا ہے۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے اور دوسری منزل شروع ہوتی ہے تو لذت قرب حاصل ہونے لگتی ہے جو بمنزلِ زادِ راہ کے آگے بڑھنے کی ہمت بندھواتی ہے۔

اے کہ بدیدہ نم ز تست و بسینہ غم ز تست (تصوف) نازشِ غم کہ ہم ز تست خاطرِ شاد می دہد

مست عطائے خود کند ساقی ما نہ مست مے (تصوف) دادہ زیاد می برد بسکہ زیاد می دہد

یعنی ہمارا ساقی شراب سے مست نہیں کرتا بلکہ اپنی عطا و بخشش سے مست کرتا ہے چونکہ وہ ہر دفعہ پہلے سے زیادہ دیتا ہے اسلیے پہلا دیا ہوا بھول جاتے ہیں اس کے احسان کے نشے پر شراب کا نشہ غالب نہیں آنے پاتا۔

دل اسباب طرب گم کردہ در بند غم ناں شد (اخلاق) زراعتگاہِ دہقاں می شود چوں باغ ویراں شد

یہ مضمون مرزا کے حسب حال ہے اور عموماً مسلمانوں کی حالت پر صادق آتا ہے اول عیش و عشرت اور پھر نون تیل لکڑی کی فکر۔ زراعت اور باغ کی مثال کس قدر ممثل لہ کے مطابق واقع ہوئی ہے۔

زما گرم است ایں ہنگامہ بنگر شور ہستی را قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد

یعنی جو کچھ دنیا میں فتنے اور فساد اور جنگ و جدال اور شور و غوغا ہے وہ انسان ہی کے دم سے ہے۔ اگر حضرت انسان نہ ہوتے تو تمام عالم میں سناٹا ہوتا۔

قضا از ذوق معنی شیرہ می ریخت در جانہا کفے از لائے پالایش چکید و آب حیواں شد

لائے پالا صافی کو کہتے ہیں۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

جلوہ اے داغ کہ ذوقم زنمک می خیزد مژدہ اے درد کہ تنگم زدوا می آید

یعنی اے داغ اب تیرے ظاہر ہونے کا وقت آگیا کیونکہ نمک جو تیرے طول پکڑنے اور ترقی پانے کا باعث ہے مجھے اس میں مزا آنے لگا ہے اور اے درد تیری بن آئی ہے کیونکہ مجھے دوا سے تنگ آنے لگا ہے۔

ہچو رازے کہ بمستی ز دل آید بیروں (تصوف) در بہاراں ہمہ بوئے تو ز صبا می آید

اس شعر میں معشوق حقیقی کی طرف خطاب ہے اور اس حدیث کے مضمون کی طرف اشارہ ہے کہ انّ فی ایّامِ دہرِکم نفحاتٍ الا فتعرّضوا لہا۔

خوش است آنکہ باخویش جز غم ندارد (آزادی) ولے خوشتر است آنکہ ایں ہم ندارد

سرابے کہ رخشد بویرانہ خوشتر (رشق) زچشمے کہ پیرایۂ نم ندارد

یعنی وہ سراب جو صحرا میں چمکے اُس آنکھ سے بہتر ہے جو تر نہیں ہے۔

سخن نیست در لطف ایں قطعہ غالب (شوخی) بہشتے بود ہند کا دم ندارد

قطعہ سے مراد قطعۂ زمین ہے۔

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند (تصوف) شمع کشتند وز خورشید نشانم دادند

رخ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند (تصوف) دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند

سوخت آتشکدہ ز آتش نفسم بخشیدند (فخریہ) ریخت بتخانہ ز ناقوس فغانم دادند

گہر از رایت شاہان عجم برچیدند (فخریہ) بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

افسر از تارک ترکان پشنگی بردند (فخریہ) بہ سخن ناصیۂ فر کیانم دادند

گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند (فخریہ) ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

ہرچہ در جزیہ ز گبران مئ ناب آوردند (رندانہ) بشب جمعۂ ماہ رمضانم دادند

ہرچہ از دستگہ پارس بہ یغما بردند (زارنالی) تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند

اخیر کے چھ شعروں میں اس بات کا بیان ہے کہ قضا و قدر نے جو کچھ عرب کی فتوحات کے وقت عجم سے چھینا اسکے عوض میں مجھکو۔ کہ میں بھی عجمی الاصل ہوں۔ کچھ نہ کچھ دیا۔ جب آتشکدہ جلکر راکھ ہوگیا تو مجھے آتش کی جگہ نفس یعنی زبان دی۔ اور جب بتخانہ گر گیا تو مجھے ناقوس کی جگہ آہ و فغاں دی شاہان عجم کے جھنڈوں کے موتی اُتار لیے اور اسکے عوض میں مجھے خامۂ گنجینہ فشاں عنایت کیا۔ اسی طرح ترکوں کے سر سے تاج لوٹ لیا اور مجھکو شاعری میں اقبال کیانی مرحمت فرمایا۔ پھر کہتا ہے کہ موتی تاج میں سے توڑ لیے اور علم و دانش میں جڑ دیے یعنی جو کچھ علی الاعلان لوٹا تھا وہ مجھے چپکے سے دیدیا۔ اور آتش پرستوں سے جو شراب جزیے میں لی وہ ماہ رمضان کی شب جمعہ کو مجھے پلائی۔ خلاصہ یہ کیا جو کچھ پونجی لوٹی تھی اُس میں سے زبان

مجھکو فریاد کرنے کے لیے دیدی۔

(عاشقانہ متصوفانہ)

خوباں نہ آں کنند کہ کس را زیاں رسد ۔ دل بردہ تا وگرچہ ازاں دلستاں رسد

یعنی دل لیا ہے تو ضرور اسکے عوض میں کچھ اُس سے وصول ہوگا، کیونکہ اچھے لوگ ایسا کام نہیں کرتے کہ کسی کو نقصان پہنچے۔

مقصود ما زدیر و حرم جز حبیب نیست (تصوف) ہر جا کنیم سجدہ۔ بداں آستاں رسد

گم شد نشان من چو رسیدم بکنج دیر (تصوف) مانند آں صدا کہ بگوش گراں رسد

شعرائے متصوفین دیر و خرابات و میکدے سے اکثر خانقاہ یا وہ مقام جہاں فقر و فنا کی تعلیم ہوتی ہے مراد لیتے ہیں۔ اپنا نشان دیر میں پہنچکر گم ہو جانے سے مراد فنا ہے۔ اسکی تشبیہ اُس صدا سے جو بہرے آدمی کے کان تک پہنچکر گم ہو جاتی ہے کس قدر بلیغ تشبیہ ہے۔

(اعزاز نفس)

در دام بہر دانہ نیفتم مگر قفس چنداں کنی بلند کہ تا آشیاں رسد

اپنے اعزاز نفس کا اظہار ہے۔ یعنی عزت کے ساتھ قید کرو تو مجھے قید ہونے سے کچھ انکار نہیں ہے۔ پس یہ اُمید نہ رکھو کہ میں دانے کی لالچ سے جال میں آپھنسونگا، نہیں بلکہ قفس کو اتنا اونچا کرو کہ میرے گھونسلے تک پہنچ جائے، میں قفس میں فوراً چلا آؤنگا۔

تیر نخست را غلط انداز گفتہ ام (عاشقانہ) اے وائے گر نہ تیر دگر برنشاں رسد

غلط انداز اُس تیر کو کہتے ہیں جو خطا کر کے غیر مقصود جگہ جا لگے چونکہ عشاق معشوق کے تیر کے مشتاق ہوتے ہیں اسلیے کہتا ہے کہ ایک تیر تو اُسکا آکر لگا ہے مگر اُسکو اپنی نحوست طالع کے خیال سے غلط انداز سمجھتا ہوں۔ اب اگر دوسرا تیر بھی اسی جگہ لگا تو میں سمجھونگا کہ پہلا بھی ارادے سے لگایا گیا تھا ورنہ میرا خیال جو پہلے تیر کی نسبت تھا صحیح ہو جائیگا اور امید بالکل باقی نہ رہیگی۔

اُمید غالب نیست بہ کیشِ مغاں درآے (رندانہ) مے گرچہ جزیہ دست نداد ارمغاں رسد

یعنی اگر پارسیوں پر غلبہ اور حکومت حاصل ہونے کی اُمید نہیں ہے تو انکا مذہب اختیار کرلے کیونکہ اس صورت میں اگر شراب جزیے میں نہ آویگی تو ہدیہ اور سوغات میں ضرور آویگی اس شعر میں گویا یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آتش پرستوں پر غلبہ و استیلا حاصل کرنے کی علت غائی یہی ہے کہ جزیے میں شراب آیا کرے۔ پس جب غلبے کی امید نہ ہو تو لاچار کیش مغاں اختیار کرنا چاہیے، تاکہ اگر جزیے میں نہیں تو ہدیہ و ارمغاں ہی میں شراب وصول ہوا کرے۔

(عاشقانہ)
جاں بر سر مکتوب تو از شوق فشاندم — از عہدۂ تحریر جوابم بدر آورد

(زمانی)
آں کشتیِ بشکستہ ز موجم کہ بتاہی — افگند در آتش گر از آبم بدر آورد

جب کشتی موج کے تھپیڑوں سے ٹوٹ جاتی ہے تو اسکے تختوں کو پانی سے نکالکر آگ میں ایندھن کی جگہ جلاتے ہیں۔ اپنے تئیں کہتا ہے کہ میری مثال بھی اُسی کشتی کی سی ہے کہ ڈوبنے سے بچا تو آگ میں جھونکا گیا۔

(تصوف)
گر جلوۂ رخ تو بہ ساغر نہ دیدہ ایم — چندیں بذوقِ بادہ دل از جا چہ میرود

(زمانی)
ہفت آسیا بگردش و ما در میانِ او — غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ میرود

(دنیا)
مجو آسودگی گر مرد راہی کاندریں وادی — چو خار از پا بر آمد پا ز داماں بر نمی آید

یعنی کسی حالت میں آدمی دنیا کے مخمصوں سے نجات نہیں پا سکتا اگر کانٹا پانوں سے نکل گیا تو پانوں دامن میں الجھیگا

(از رہ بحث و جدل)
برآر از بزم بحث اے جذبۂ توفیق غالب را — کہ ترکِ سادۂ ما با فقیہاں بر نمی آید

"ترکِ سادۂ ما" یعنی غالب جو ایک بھولا بھالا ترک ہے۔ یہ ایسی ترکیب ہے جیسے موسائے من اور خرِ بادِ من یعنی خود میں "با فقیہاں بر نمی آید" یعنی مولویوں کی دلیلوں حجتوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ "با کسے بر نیامدن" کے معنی ہیں اُس سے عہدہ برآ عہدہ برآنہ ہونا۔

چشم و دل باختہ ام - دادِ ہنر خواہد داد (تصوف) آنکہ چوں من ہمہ داں ہمہ بیں تو شود

یعنی چونکہ میرے دل نے تجھ کو جانا ہے جیسا کہ تو ہے اور میری آنکھ نے تجھکو دیکھا ہے جیسا کہ تو ہے اسلیے دل اور آنکھ دونوں کو کھو بیٹھا ہوں - پس میرے اس کام کی داد وہی دیگا جو میری طرح تیرا ہمہ داں اور ہمہ بیں ہوگا -

کفر و دیں چیست جز آلایشِ پندارِ وجود (تصوف) پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دین تو شود

رفتہ بودی و گراز جا بہ سخن سازیِ غیر (عاشقانہ) منت از بخت کہ خاموشیِ ما یاد آمد

یعنی تو نے رقیب کی سخن سازی سے پھر دھوکا کھایا تھا، مگر شکر ہے کہ اسکی سخن سازی دیکھکر ہماری خاموشی تجھکو یاد آگئی جس سے تجھکو یہ خیال ہوا ہوگا کہ سچے عاشق منہ سے کچھ نہیں کہا کرتے -

دوش کز گردشِ بختم گلہ بر روے تو بود (عاشقانہ) چشم سوی فلک و روی سخن سوے تو بود

یعنی نصیب کی گردش کا شکوہ کرتے وقت آنکھ آسمان کی طرف تھی اور باتیں تجھ سے کر رہا تھا - ایک خاص حالت کی تصویر بہت عمدہ لفظوں کھینچی ہے

دوست وارم گرہے راکہ بکارم زدہ اند (عاشقانہ) کایں ہمانست کہ پیوستہ در ابروے تو بود

گر چنیں ناز تو آمادۂ یغما ماند (تصوف) بہ سکندر نہ رسد ہر چہ ز دارا ماند

معشوق حقیقی کی طرف خطاب ہے - سکندر سے مراد بادشاہِ فاتح / اور دارا سے بادشاہ مفتوح -

ہم بہ سوداے تو خورشید پرستم - آرے (تصوف) دل ز مجنوں بُرد آہو کہ بہ لیلا ماند

یعنی اگر میں آفتاب کی پرستش کر دوں تو وہ بھی در حقیقت تیری ہی پرستش ہے جیسے مجنوں ہرنوں پر اسلیے فریفتہ تھا کہ انکی آنکھیں لیلیٰ سے مشابہ تھیں،

شکوۂ دوست ز دشمن نتوانم پوشید (عاشقانہ) گر غمِ ہجر چنیں حوصلہ فرسا ماند

یعنی اگر جدائی کا غم اسی طرح بیصبر کرنے والا رہا تو دوست کا شکوہ ضبط نہ کیا

جا سکیگا یہاں تک کہ اُسکو دشمنوں سے بھی نہ چھپا سکونگا۔

در بغل دشنہ نہاں ساختہ غالب امروز (معیت) مگذارید کہ ماتم زدہ تنہا ماند

بستاند رہ جرعۂ آبے بسکندر (تصوف) دریوزہ گر میکدہ صہبا بہ کدو برد

یعنی سکندر کو ایک بے حقیقت پانی کے گھونٹ سے محروم رکھا اور میکدے کا فقیر شراب جیسی نایاب چیز کا تونبا بھر کرلے گیا۔ مطلب یہ کہ بادشاہوں کو وہ دولت نصیب نہیں جو میکدے یعنی خانقاہ کے ادنی گداؤں کو نصیب ہے۔

یک گریہ پس از ضبط دو صد گریہ رضا دہ (تصوف) تا تلخی آں زہر توانم بہ گلو برد

یعنی جب دو سو دفعہ رونے کو ضبط کردوں تو ایک دفعہ تو رونے کی اجازت دے تاکہ اُس ضبط کے زہر کی کڑواہٹ ایک دفعہ رو کر حلق سے دور کردں۔

ز جوشِ شکوۂ بیدادِ دوست می ترسم (عاشقانہ) مباد مُہر سکوت از دہن فرو ریزد

ایک معقول بات کو محسوسات کے لباس میں ظاہر کرتا ہے مطلب تو یہ ہے کہ اسکے شکوے سے اس قدر بھرا ہوا ہوں کہ شاید اسکو ضبط نہ کرسکوں مگر اسکو اسطرح بیان کرتا ہے کہ اسکی بیداد کا شکوہ دل سے اس جوش کے ساتھ اُبلا ہے کہ منہ پر جو مہر سکوت لگی ہوئی ہے کہیں اسکے ریلے میں بہ نہ جائے۔

بریدہ ام رہِ دوری کہ گر بیفشانم (جفاکشی) بجاے گردِ رواں از بدن فرو ریزد

یعنی میں نے ایسی راہِ دراز طے کی ہے کہ اگر بدن کو جھاڑوں تو گرد کی جگہ جان بدن سے جھڑ جائے یہ تمثیل ہے اُس محنت و مشقت کی جو فکر شعر اور تکمیل فن سخن میں قائل نے کی ہے۔

بکن پرسشم از شکوہ منع کایں خوں نیست (عاشقانہ) کہ خود ز زخم دمِ دوختن فرو ریزد

عجیب و غریب تشبیہ اور نہایت عمدہ خیال ہے اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب معشوق مہربان ہو کر عاشق کی پرسشِ حال کرتا ہے تو

اسوقت عاشق مہجور کا دل بھر آتا ہے اور وہ شکایت کرنی شروع کرتا ہے۔ پس کہتا ہے کہ تو میری پرسش حال کے وقت شکایت سے مجھکو منع نہ کر کیونکہ تو جو پرسش، حال کرتا ہے تو گویا میرے زخم میں ٹانکے لگاتا ہے، اور ٹانکے لگاتے وقت کسی قدر خون کا ٹپکنا ضروری ہے۔ پس یہ شکایت وہ خون ہے جو زخم کے سیتے وقت ٹپکا کرتا ہے۔

اگر بہ دل نہ خلد ہرچہ از نظر گذرد (سفر) زہے روانی عمرے کہ در سفر گذرد

یعنی عمر کا سفر میں گزرنا نہایت عمدہ ہے بشرطیکہ سفر میں جو کچھ نظر سے گزرے اس پر انسان فریفتہ نہ ہو جایا کرے۔

بوصل لطف بہ اندازۂ تحمل کن (عاشقانہ) کہ مرگ تشنہ بود آب چوں ز سر گذرد

کہتا ہے کہ وصل کی حالت میں مہربانی اس قدر زیادہ نہ کر کہ میں اُسکی خوشی کا تحمل نہ کر سکوں اور خوشی کے مارے مرجاؤں، کیونکہ پیاسے کے لئے وہ پانی موت ہے جو سر سے گزر جائے۔

ہرکجا دشنۂ شوق تو جراحت بارد (تصوف) جز خراشے بہ جگر گوشۂ ادہم نرسد
طوبیٰ فیض تو ہر جا گل و بار افشاند (تصوف) جز نسیمے بہ پرستش گہ مریم نہ رسد

جگر گوشۂ ادہم۔ یعنی ابراہیم بن ادہم۔ کو اُن زخموں سے جو تیرے شوق کی چھری برساتی ہے ایک خراش سے زیادہ نہیں پہنچی۔ اور جو پھول اور پھل تیرے فیض کے طوبیٰ سے جھڑتے ہیں ان میں سے صرف ایک ہوا کا جھونکا محراب مریم تک پہنچا ہے۔

مے بہ زہاد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب (شوخی) پیش ایں قوم بہ شورابۂ زمزم نرسد
خواجہ فردوس بہ میراث تمنا دارد (شوخی) وائے گر ذرروش نسل بہ آدم نرسد

خواجہ کا لفظ فارسی میں اکثر ایسے مقام پر بولتے ہیں جیسے طنز کے موقع پر اُردو

میں تیسرے شخص کے لیے آپ یا حضرت بولتے ہیں۔ کہتا ہے کہ آپ آدم کی میراث میں فردوس کے طلبگار ہیں۔ بڑا مزا ہو اگر آپ کا سلسلۂ نسب آدم تک نہ پہنچے مطلب یہ ہے کہ آپ کے اخلاق و عادات انسانیت سے اسقدر بعید ہے کہ ممکن ہے آدم کی نسل سے نہ ہوں۔

جان در غمت فشاندن مرگ از قفا ندارد (تعلق) تن در بلا فگندن ہیم بلا ندارد

چوں لعل تست غنچہ اما سخن نداند (عاشقانہ) چوں چشم تست نرگس اما حیا ندارد

فارغ کسیکہ دل را با دود و اگزارد (نایابی دوا) کشتِ جہاں سراسر وارد گیا ندارد

باید زمے ہر آئینہ پرہیز۔ گفتہ اند (شوخی) آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

کو فنا تا ہمہ آلایش پندار برد (تصوف) از صور جلوۂ و از آئینہ زنگار برد

عشوۂ مرحمتِ چرخ مخر کایں عیار (ستم لطف نما) یوسف از چاہ برآرد کہ بہ بازار برد

عشوہ خریدن دھوکا کھانا اور فریب میں آجانا یعنی آسمان کی مہربانی کے دھوکے میں نہ آنا کہ یہ عیار یوسف کو چاہ سے اسیلے نکالتا ہے کہ بازار میں بیچا کر بکوائے۔

ہر شمیمے را مشامے درخور است (تصوف) بوے پیراہن بکنعاں می رود

جوہر طبعم درخشانست لیک (از نالی) روزم اندر ابر پنہاں می رود

نومیدیِ ما گردشِ ایام ندارد (از نالی) روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

بلبل بچمن بنگر و پروانہ بہ محفل (بیقراری شوق) شوق ست کہ در وصل ہم آرام ندارد

یعنی شوق کو وصل میں بھی آرام نصیب نہیں، اسی لیے نہ بلبل کو چمن میں آرام ہے اور نہ پروانے کو شمع کی موجودگی میں قرار ہے۔

چہ خیزد از سخنے کز درونِ جان نہ بود (سخن پرور) بریدہ بود زبانے کہ خونچکان نہ بود

کہتا ہے کہ جو بات دل سے نہیں نکلتی وہ کچھ اثر نہیں کرتی۔ پس کٹیو وہ زبان جو خونچکان یعنی دردِ دل سے بھری ہوئی نہ ہو۔

حکیم ساقی و مے تند، و من ز بدخوئی (قیمت) ز رطلِ بادہ بخشم آیم ار گراں نہ بود
حکیم سے مراد خدا ہے۔ کہتا ہے کہ ساقی تو اندازے سے زیادہ نہیں دیتا اور شراب یعنی دولت دنیا نہایت تند ہے مگر میں اپنی بدخوئی اور زیادہ طلبی سے شراب کا پیالہ ہلکا پاتا ہوں تو غصے ہوتا ہوں

ز خویش رفتہ ام و فرصتے طمع دارم (تصوف) کہ باز گردم و جز دوست ارمغاں نہ بود
قاعدہ ہے کہ جب آدمی کہیں سفر کو جاتا ہے تو وہاں سے کچھ سوغات و ہدیہ و ارمغاں لیکر وطن میں واپس آتا ہے کہتا ہے کہ میں اپنے آپے سے تو جا چکا ہوں اب یہ چاہتا ہوں واپس پھر کر اپنے آپے میں آؤں تو دوست یعنی حق کے سوا کوئی سوغات لیکر نہ آوں۔

زمامِ ناقہ بدستِ تصرفِ شوق است (تصرف شوق) بسوے قیس گرایش ز ساربان نہ بود
یعنی لیلیٰ کا ناقہ جو قیس کی طرف چلا ہے یہ ساربان کی طرف سے نہیں ہے بلکہ اسوقت اُسکی باگ تصرف شوق قیس کے ہاتھ میں ہے وہ جدھر چاہتا ہے لے جاتا ہے۔

بتانِ شہر ستم پیشہ شہر یار انند (عاشقانہ) کہ در ستم روشِ آموز روزگار انند
برندِ دل بادا اے کہ کس گماں نہ بود (عاشقانہ) فغاں ز پردہ نشیناں کہ پردہ دار انند
نہ زرع و کشت شناسند نے حدیقہ و باغ (عاشقانہ) ز بہر بادہ ہوا خواہ باد و بار انند
یعنی ہوا اور مینہ کچھ اسلیے نہیں چاہتے کہ اُس سے کھیتیاں اور باغ سرسبز و شاداب ہونگے بلکہ صرف اسلیے کہ شراب پینے کا لطف بغیر باد و باراں کے نہیں آئیگا۔

یہ مضمون مرزا کو کہیں تلاش کرنا نہیں پڑا، بلکہ یہ خاص اُنکی طبیعت کا اقتضا تھا۔ جس مکان میں مرزا رہتے تھے اُسکے دروازے پر ایک کمرہ تھا اور کمرے کے آگے ایک برآمدہ تھا جسکے نیچے رستہ چلتا تھا۔ یہ برآمدہ گزرگاہ

سے تقریباً چار گز اونچا ہوگا۔ ایک روز مینہ برس رہا تھا اور مرزا صاحب برآمدے میں بیٹھے ہوے ابر باراں کی مدارات میں معروف تھے۔ اس وقت عالم سرخوشی میں فرمانے لگے کہ جی چاہتا ہے ایسا برسے کہ گلی کی رو کا پانی برآمدے تک آجائے اور میں یہیں بیٹھا بیٹھا گلاس بھر بھر کر پانی پیوں۔ کسی نے کہا حضرت! برآمدے تک پانی آگیا تو شہر پہلے ڈوب جائیگا۔ مرزا ہنس کر چپکے ہو رہے۔

چہ لطف رہروی آنزا کہ خار خاری نیست (الذت سہی) مرو بکعبہ اگر راہ ایمنی دارد

خار خار خلجان۔ کہتا ہے کہ جب تک کچھ خطرہ نہ ہو سفر میں کچھ لطف نہیں۔ پس اگر کعبے کی راہ پُر امن ہے تو کعبہ جانا نہیں چاہیے۔ فی الحقیقۃ جو لوگ نہایت کٹھن منزلیں طے کر کے مقام مقصود تک پہنچتے تھے۔ جو خوشی انکو منزل پر پہنچنے سے ہوتی ہوگی اُسکا سواں حصہ بھی اُن لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا جو ریل اور اسٹیمر میں آجکل سفر کرتے ہیں۔

ناشناسائی ابنائے زماں

بیاورید گر ایں جا بود زباں دانے غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

حد سے زیادہ بلیغ شعر ہے۔ اگرچہ مضمون عام ہے مگر خود شاعر کے حال پر خوب چسپاں ہوتا ہے اور اُس نے یقیناً اپنی ہی نسبت کہا ہے۔ جب کوئی غیر ملک کا مسافر شہر میں وارد ہوتا ہے اور اُسکی زبان کوئی نہیں سمجھتا تو ترجماں کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر کچھ تو اسلیے کہ کسی کو اپنا قدر دان اور پایہ شناس نہیں پاتا، اور کچھ اسلیے کہ اپنے نازک اور باریک خیالات کا سمجھنے والا کسی کو نہیں دیکھتا۔ اپنے تیئں غریب شہر۔ یعنی شہر میں بالکل اجنبی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کسی ترجمان کو بلاؤ کہ اجنبی مسافر کچھ باتیں۔ جو کہنے ہی کے لائق ہیں کہنی چاہتا ہے

بیشم ازاں بپرس کہ پری واہل کوے (عاشقانہ) گویند خستہ زحمت خود زیں دیار برد
نازم فریب خلیج کہ غالب زکوے تو ناکام رفت وخاطر اُمید وار برد
ہر کرا رخت نمازے نبود از نم مے (رندانہ) جاے در حلقۂ رندانِ قدح نوش مباد
جامہ یا رخت کا نمازی ہونا اسکے آلودہ ہونے کو کہتے ہیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں
مغنیاں! بادہ عزیزست۔ مریزید بخاک (رندانہ) جوشد از پردۂ دگر خوں سیاوش، مباد
دوسرے مصرع کی تقدیر عبارت یوں ہے" مبادا خون سیاوش۔ دیگر از پردہ
بجوشد۔ سیاوش کا قصہ مشہور ہے کہ وہ بیگناہ اپنے سسرے افراسیاب کے
ہاتھ سے مارا گیا تھا، اور اسکے خون کے وبال میں تمام ملک کشت وخون میں
مبتلا رہا۔ کہتا ہے کہ اے مغنیو! شراب بھی بڑی عزیز چیز ہے،، اسکو زمین پر مت
گراؤ، ایسا نہ ہو کہ خونِ سیاوش پھر جوش مارے

از رشک گرد آنچہ بمن روزگار کرد (شکایت چرخ) در خستگی نشاط مرا دید۔ خوار کرد
یہ غزل غالباً اُس زمانے میں لکھی گئی ہے جب مرزا عدالت کے مواخذے میں
پھنس گئے تھے۔ یعنی زمانے نے جب مجھکو دیکھا کہ خستگی اور تکلیف میں بھی خوش
ہے تو مجھے ذلیل وخوار کردیا کہ اب تو خوش نہ رہیگا۔

در دل ہمی زبینش من کینہ داشت چرخ (شکوۂ چرخ) چوں دید کان نماند نہاں۔ آشکار کرد
یعنی میرے دانش وبینش کے سبب مجھ سے آسمان پوشیدہ کینہ تو رکھتا ہی تھا، اب
جو دیکھا کہ وہ کینہ لوگوں پر ظاہر ہو گیا ہے تو آسمان کھل کھیلا اور علانیہ دشمنی
کرنے لگا۔

لنگر گسست صرصر وکشتی شکست موج (تقدیر) دانا خورد دریغ کہ ناداں چہ کار کرد
یعنی جو کچھ ہوا وہ میری نادانی سے نہیں بلکہ قضا وقدر کے حکم سے ہوا۔
نومیدی از تو کفر وتو راضی نہ بکفر (شوخی) نومیدیم دگر بہ تو امیدوار کرد

ماحصل شعر کا یہ ہے کہ در حقیقت میں ہوں تو نا امید مگر چونکہ تجھ سے نا امید ہونا کفر ہے اور تو کفر سے راضی نہیں اسلیے مجبوراً اپنے تئیں امید وار بنایا ہے۔

بشرع آویز و حق میجو۔ ز مجنوں کم نہ باید (تصوف) دلش با محمل است۔ اما زبان باساربان دارد

یعنی شرع سے بھی تعلق رکھ اور خدا کو بھی ڈھونڈھ، آخر تو مجنوں سے کم نہیں ہے کہ اُسکا دل تو محمل میں اٹکا ہوا ہے، مگر زبان کو ساربان سے سروکار ہے یعنی ساربان سے باتیں کر رہا ہے اور دل لیلیٰ سے لگا ہوا ہے۔ شرع کو ساربان سے اور حق کو محمل سے تمثیل دی ہے اور یہ نہایت بلیغ تمثیل ہے اور شعر نو نوادر افکار سے ہے۔

خدارا وقت پرسش نیست گفتم۔ بگذر از غالب (عاشقانہ) کہ ہم جاں بر لب و ہم داستاں بازبان دارد

گفتم یعنی میں نے کہدیا ہے، میں کہے دیتا ہوں کہ یہ پرسش کا وقت نہیں ہے، تو غالب کے حال سے درگزر اور پرسش کا خیال چھوڑ دے۔ کیونکہ اُسکی جاں لبوں پر ہے اور داستان زبان پر مبادا وہ اپنی دردانگیز داستاں بیان کرے اور داستان کے ساتھ ہی اُسکی جان بھی نکلجائے۔

گویند صنعاں توبہ کرد از کفر۔ ناداں بندۂ کز خود فروشیہائے دیں بخشش زیزداں خوش نکرد

صنعان کا قصہ مشہور ہے جو پہلے عابد تھا پھر فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا۔ یہاں تک کہ کفر تک نوبت پہنچگئی پھر متنبہ ہوا اور کفر سے توبہ کی۔ کہتا ہے کہ صنعاں کا کفر سے توبہ کرنا مشہور ہے۔ وہ عجب نادان بندہ ہے جسنے دین کی خود فراموشی کے سبب خدا کی بخشش کو پسند نہ کیا۔ یعنی خدا کی خالص بخشش تو وہ تھی کہ وہ توبہ نہ کرتا، اور کفر ہی پر مرتا، اور پھر خدا اسکو بخشدیتا، اور اب جو وہ بخشا جائیگا تو یہ بخشش دین کی قیمت ہوگی پس گویا اُس نے دین کی خود فروشی کے بھروسے پر خدا کی خالص بخشش کو پسند نہ کیا "خوش کردن"

کے معنی ہیں پسند کرنا۔

آں خود بہ بازی می برد۔ دیں رادہ جومی نشمرد (عاشقانہ) بنمودمش دیں خندہ زد۔ آوردمش جاں خوش نکرد

بامن میاویزاے پدر فرزندِ آزر رانگر (شوخی) ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگان خوش نکرد

میاویز۔ یعنی مجھ سے جھگڑا مت کر۔ فرزند آذر ابراہیم علیہ السّلام۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔ یہ نرا مضمون ہی نہیں ہے بلکہ مرزا کے حسب حال بھی ہے، کیونکہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے۔ مرزا کے والد سنّی المذہب اور خود مرزا اثنا عشری تھے۔

درستم حق ناشناسش گفتن از انصاف نیست (شوخی) آں کہ چندیں تکیہ بر حلم خداوندش بود

کہتا ہے کہ اُس ظالم کو حق ناشناش کہنا انصاف نہیں ہے جسکو خدا کے حلم پر اسقدر بھروسا ہے کہ اُسکے بھروسے پر ظلم کیے چلا جاتا ہے اور اسکے مواخذے سے نہیں ڈرتا

با خرد گفتم نشانِ اہلِ معنی باز گوے (اخلاقی) گفت گفتارے کہ با کردار پیوندش بود

بہر خواری بلکہ سرگرم تلاشم کردہ اند پارۂ نزدیک در ہر دُور باشم کردہ اند

دور باش۔ ہٹو بچو کی آواز کو کہتے ہیں جو بادشاہوں کی سواری کے آگے آگے نقیب پکارتے چلتے ہیں۔ کہتا ہے کہ مجھکو جو قضا و قدر نے سرگرم تلاش کیا ہے اُس سے مقصود میرا خوار و ذلیل کرنا ہے پس راہ تلاش میں جو دھتکار مجھپر پڑتی ہے اُس سے ظاہر ہے کہ میری ذلت و خواری زیادہ ہوتی ہے اور اس طرح جو امر میرے سرگرم تلاش کرنے سے مقصود ہے وہ حاصل ہوتا ہے۔ پس گویا ہر دور باش پر میں کسی قدر مقصود کے نزدیک ہوتا جاتا ہوں۔

چرخ ہر روزم غم فردا بخوروں میدہد (زاہدانہ) تا قیامت فارغ از فکر معاشم کردہ اند

از چہ غالب خواجگیہاے جہاں تنگ نیست گرنہ با سلمان و بوذر خواجہ تاشم کردہ اند

بخشم ناسزا میگوید و از لطفِ گفتارش گماں دارم کہ حرفِ دلنشینی بعد ازیں گوید

لطفِ گفتار کی تعریف اس سے بہتر کسی پیرائے میں نہیں ہو سکتی۔ کہتا ہے

کہ معشوق غصے میں برابر مجھکو برا بھلا کہتا ہے مگر اسکے لطف کلام سے میں ہمیشہ اسی امید میں رہتا ہوں کہ اب کوئی اچھی بات کہتا ہے۔ اب کوئی مہربانی کا کلمہ اُسکی زبان سے نکلتا ہے۔

دل از پہلو بروں آرم جمش جام خود انگارد   وگر لختے برافشانم سلیمانش نگیں گوید

اپنے دل پر فخر کرتا ہے کہ اگر اسکو پہلو سے نکال کر دکھاؤں تو جمشید اسکو اپنا جام جہاں بیں سمجھے، اور اگر اُسکا ایک لخت نکال کر ڈالدوں تو سلیمان اس کو خاتم سلیمانی کا نگیں بتائے۔

من بوفا مردم و رقیب بدر زد   (عاشقانہ) نیمہ لبش انگبیں و نیمہ تبرزد

بدر زد یعنی نکل بھاگا۔ تبرزد مصری۔ کہتا ہے کہ میں تو نباہ کرتا کرتا مرگیا اور رقیب نکل بھاگا گویا معشوق کا آدھا لب شہد تھا کہ میں اس میں پھنسکر رہ گیا اور آدھا مصری تھا کہ رقیب اُس پر سے اڑگیا۔

دعوے او را بود دلیل بدیہی   (عاشقانہ) خندۂ دنداں نما بجنِ گُہرزد

کتنے بڑے خیال کو کن مختصر لفظوں میں اور پھر کس صفائی اور خوبی سے ادا کیا ہے کہتا ہے کہ معشوق موتی پر اس طرح ہنسا کہ اسکے دانت نظر آنے لگے۔ پس اُسکا خندہ گویا اس بات کا دعوئی ہے کہ موتی کی کچھ حقیقت میرے دانتوں کے سامنے نہیں، اور اس دعوی کی دلیل اُسکا خندۂ دنداں نما ہے، کیونکہ اسکے دانتوں کا سب پر ظاہر ہوجانا یہی اس بات کی دلیل ہے کہ موتی اسکے دانتوں کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ پس اُسکے دعوے کی دلیل نہایت بدیہی اور ظاہر ہے۔

(شکوہ چرخ)

نہم جبیں بدرش آستاں بگرداند   نشیمنش بہ سرِ رہ عناں بگرداند

آستاں بگرداند یعنی چوکھٹ کے پتھر کو الٹ کر اوپر کا رخ نیچے اور نیچے کا رُخ

اوپر کر دیتا ہے۔

امتحان آلہی

تو نالی از خلہ خار و نگری کہ سپہر | سر حسین علی بر سناں بگرداند
بروے بہ شادی واند وہ دل منہ کہ قضا | چو قرعہ بر خط امتحاں بگرداند
یزید را بہ بساطِ خلیفہ بنشاند | کلیم را بہ لباسِ شباں بگرداند
تیغت ز فرق تا بہ گلو یم رسیدہ باد | شوخی ز حد گذشت زبانم بریدہ باد

اول یہ آرزو کرتا ہے کہ تیری تلوار میرے سر پہ پڑے اور حلق تک اُتر جائے۔ پھر یہ سمجھکر کہ یہ مرتبہ ہر شخص کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ کہتا ہے کہ گستاخی حد سے گزر گئی میری زبان قلم ہوجیو۔

گرفتہ الم زکوے تو آساں نہ رفتہ ام (عاشقانہ) | ایں قصہ از زبانِ عزیزاں شنیدہ باد
ذوقیست ہمدمی بفغاں بگذرم ز رشک | خارِ رہت بپائے عزیزاں خلیدہ باد

یعنی اگرچہ تیرے عشق میں دوسرے کی شرکت گوارا نہیں، مگر چونکہ کئی آدمیوں کے ملکر نالہ و فریاد کرنے میں عجب لطف ہے اسلیے میں رشک سے قطع نظر کرتا ہوں اور کہتا ہوں خارِ رہت بپاے عزیزاں خلیدہ باد"

در تیغ زدن منت بسیار نہادند (عاشقانہ) | بردند سر از دوش و سبکدوش نکردند

یعنی تلوار سے سر اُتار کر بھی معشوق نے سبکدوش نہ کیا پہلے سر کا بوجھ تھا اب اس احسان کا بوجھ ہے کہ اپنی تلوار سے بے قدر سر اُتارا ہے۔

(شعبدہ و سے)

روزیکہ بہ مے زور وبہ نے شور نہفتند | اندیشہ بکارِ خرد و ہوش نہ کردند

یعنی شراب کا نشہ اور نے کی آواز کا درد۔ دونوں عقل و ہوش کے دشمن ہیں۔ پس جب کارکنانِ قضا و قدر نے شراب میں زور نے میں شور ودیعت کیا تھا اس وقت عقل و ہوش کے انجام کا کچھ خیال نہیں کیا۔

تاجرِ شوق دراں رہ بتجارت نہ رود (تصوف) | کہ رہ انجامد سرمایہ بغارت نہ رود

یعنی شوقِ الٰہی کا تاجر اُس رستے نہیں چلتا کہ جو رستہ چلتے چلتے ختم ہو جائے اور اُس رستے میں سرمایہ لُٹا نہ جائے۔

رمز بشناس کہ ہر نکتہ ادائے وارد (تصوف) محرم آن ست کہ رہ جز باشارت نرود

کہتا ہے کہ ہر نکتہ۔ یعنی ہر چیز کی رمز کو سمجھنا چاہیئے کیونکہ محرم راز وہی شخص ہے جو بغیر اُدھر کے اشارے کے ایک قدم نہیں اُٹھاتا۔ یعنی جو کچھ نیچر سکھاتی ہے اسکے موافق عمل کرتا ہے۔ کھانے میں، پینے میں، سونے میں، جاگنے میں، غرضکہ ہر کام اور ہر چیز میں نیچر کی ہدایت کے بغیر کچھ نہیں کرتا۔

زاہد از حور بہشتی بجز این نشناسد (شوخی) کہ شود دست زدِ شوق و بکارت نرود

دست زدِ شوق ہونا یعنی شوق کے زیر مشق ہونا۔ خلاصہ مطلب یہ کہ زاہدِ شریعت کے تمام الفاظ سے اُنکے حقیقی معنی مراد لیتا ہے اور کسی بات کو تمثیل و استعارے و کنایے پر محمول نہیں کرتا۔

بیا د جوش تمنائے دیدنم بنگر (عاشقانہ) چو اشک از سرِ مژگاں چکیدنم بنگر

کہتا ہے کہ آ۔ اور دیدار کی تمنا جو میرے دل میں جوش مار رہی ہے اُسکو دیکھ۔ اور پلکوں کے رستے سے آنسو کی طرح میرا ٹپکنا ملاحظہ کر۔ جوشِ تمنائے دیدار کی تصویر اس سے بہتر غالباً کسی نے نہ کھینچی ہوگی کہ "میں آنسو کی طرح پلکوں کے رستے سے ٹپکا جاتا ہوں"

زمن بجرم طپیدن کنارہ می کردی (عاشقانہ) بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد (تصوف) در انتظارِ ہما دام چیدنم بنگر

کہتا ہے کہ ہما کے انتظار میں میرا جال بچھانا تو دیکھو۔ جو دانہ جال کے نیچے ہما کے پھنسانے کے لیے ڈالا تھا وہ اُگا اور بڑھا اور یہاں تک بڑھا کہ اس میں گھونسلے بن گئے۔ مگر ہما ہی دام میں نہ آیا۔

اے ذوقِ نوا سنجی بازم بخروش آور
غوغائے شبیخونے بر بنگہِ ہوش آور

گر خود نجہد از سر - از دیدہ فرو بارم
دل خوں کن و آں خوں را در سینہ بجوش آور

ہاں ہمدمِ فرزانہ دانی رہِ ویرانہ
شمعے کہ نخواہد شد از باد خموش آور

(غوغا یعنی بلبل عاشقانہ ترانہ)

ویرانہ یعنی غریب خانہ - جو شمع کہ ہوا سے نہ بجھے گی یعنی شراب -

شورابۂ ایں وادی تلخست اگر رادی
از شہر بسوئے من سرچشمۂ نوش آور

کہتا ہے کہ میں جس وادی میں ہوں یہاں کا پانی تو تلخ ہے اے ہمدم فرزانہ اگر تو فیاض ہے تو شہر سے میرے لیے سرچشمۂ نوش یعنی شراب لا -

دانم کہ زرے داری - ہر جا گزرے داری
مے گر ندہد سلطان از بادہ فروش آور

گر مغ بہ کدو ریزد بر کف منہ راہی شو
ور شہ بسبو بخشد بردار و بدوش آور

کہتا ہے کہ تیرے پاس دام بھی ہیں، اور تو سب جگہ آتا جاتا بھی ہے، اگر بادشاہ عطا کرے تو فبہا - ورنہ بادہ فروش سے لا - اگر مغ (آتش پرست) یعنی بادہ فروش تو بنے میں ڈالدے تو تو ہاتھ پر رکھ اور چلدے - اور جو بادشاہ گھڑا بھر کر عنایت کرے تو کندھے پر اُٹھا اور لے آ -

ریحاں ومد از مینا رامش چکد از قلقل
آں در رہ چشم افگن ایں از پے گوش آور

رامش - راگ - آں سے مراد ریحاں اور ایں سے مراد قلقل -

گا ہے بسبکدستی از بادہ زخویشم بر
گا ہے بسیہ مستی از نغمہ بہوش آور

گا ہے بسبکدستی - یعنی کبھی جلدی سے مجھ کو شراب پلا کر مدہوش کردے اور پھر جب میں مست ہو جاؤں تو مجھکو گانا سنا کر ہوشیار کر -

غالب - کہ بقایش باد ہمپائے تو گر ناید
بارے غزلے فردے زاں موئنہ پوش آور

ہمپائے تو یعنی ہمراہ تو - موئنہ پوش اونی کپڑے پہننے والا - مرزا جاڑے میں روئی دار کپڑا نہیں پہنتے تھے، اکثر اونی یا پشمینے کا چغہ کوٹ اور ٹوپی وغیرہ پہنتے تھے

یقین عشق کن و از سرِ گماں برخیز (عاشقانہ) بہ آشتی بنشیں یا بہ امتحاں برخیز

چرا بہ سنگ و گیاہ می‌جی اے زبانۂ طور (انقلاب) زراہِ دیدہ بدل در رو و زجاں برخیز

زبانہ۔ شعلہ وہ تجلّی جو سنگ و گیاہ۔ یعنی کوہِ طور اور نخل ایمن پر ظاہر ہوئی تھی اُسکی طرف خطاب کرتا ہے کہ اے شعلۂ طور! پتھر اور درخت سے جو کہ تیرے قابل نہیں ہیں کیوں لپٹتا ہے؟ ہماری آنکھ کی راہ سے دل میں اُتر اور جان سے بھڑک اُٹھ۔

عیادت است نہ پرخاش تند خوئی چیست؟ (عاشقانہ) بیا و غمزدہ بنشیں، ولب گزاں برخیز

معشوق عیادت کو آیا اور عاشق کا حال نہایت سقیم دیکھکر بے لطف ہوا ہے اُس سے کہتا ہے کہ تو عیادت کے لیے آیا ہے، لڑائی کے لیے نہیں آیا، پھر یہ تند خوئی اور بدمزاجی کیسی ہے؟ یہاں آکر بے لطفی کے سوا اور کیا حاصل ہو سکتا ہے! پس آ اور مغموم بیٹھ۔ اور ہونٹ کاٹتا ہوا اُٹھ۔

نفس چوں زبوں گردد دیو را بفرماں گیر (اخلاق) محرمِ سلیمانم نقشِ خاتم از من پرس

کہتا ہے کہ جب نفس مغلوب ہو گیا پھر جنکو محکوم کر لینا آسان ہے۔ میں سلیمان کا محرمِ راز ہوں، اُسکی انگوٹھی پر یہی کندہ تھا جس سے تمام جن اسکے محکوم تھے۔

بوسہ از لبانم دہ، عمرِ خضر از من خواہ (رندانہ) جامِ مے بہ پیشم نہ عشرتِ جم از من پرس

وردِ من بود غالب، یا علی و بو طالب (منقبت) نیست نجل با طالب، اسمِ اعظم از من پرس

کہتا ہے کہ میرا وظیفہ یا علی ابن ابی طالب ہے، مجھکو طالبِ صادق سے کچھ بخل نہیں ہے، اسمِ اعظم مجھ سے پوچھ لے کہ یہی "یا علی" اسمِ اعظم ہے۔

لطفِ بخت ہر نگہ خشمگیں شناس (عاشقانہ) آرائشِ جبینِ شکر فاں زچیں شناس

بے غم نہادِ مردِ گرامی نمے شود (اخلاق) زنہار قدرِ خاطرِ اندوہگیں شناس

زنہار کے معنی یہاں ضرور بالضرور کے ہیں۔ یہ لفظ جب نہی پر آتا ہے تو ہرگز کے معنی ہوتے ہیں اور جب امر پر آتا ہے تو ضرور کے معنی دیتا ہے۔

دود سودائے تتق بست آسماں نامیدمش (تصوف) دیدہ برخواب پریشاں زد جہاں نامیدمش

دنیا و مافیہا کا ہیچ ہونا بیان کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ ایک خیالی دھواں اٹھکر شامیانہ سا بن گیا ہم نے اُسکا نام آسمان رکھ لیا۔ اور آنکھ کو ایک پریشان خواب نظر آیا اسکو جہاں سمجھ گئے اسی طرح اسکے بعد کے کئی شعروں میں اسی مضمون کی تفصیل ہے مثلاً

وہم۔ خاکے ریخت در چشم بیاباں دیدمش (تصوف) قطرۂ بگداخت۔ بحر بیکراں نامیدمش

باد دامن زد بر آتش، نو بہاراں خواندمش (تصوف) داغ گشت آں شعلہ از مستی خزاں نامیدمش

چونکہ، نو بہار میں تمام جذبات نفسانی جوش میں آتے ہیں، اور عشق و ہوس کی تحریک ہوتی ہے اسلیے بہار کو آگ سے تشبیہ دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہوا نے آگ کو دامن سے سلگایا۔ میں نے اسکو بہار قرار دیدیا۔ اور جب وہ شعلہ جل بجھا۔ تو میں نے اس کا خزاں نام رکھدیا۔

(تعریض بر اہل وطن)

غربتم ناساز گار آمد، وطن فہمیدمش کرد تنگی حلقۂ دام آشیاں نامیدمش

کہتا ہے کہ جب پردیس میں مجھے تکلیفیں پہونچنے لگیں تو میں اسکو وطن سمجھا، گویا جب دام کے حلقے نے تنگی کی تو میں اسکو اپنا آشیانہ سمجھ گیا۔ مطلب یہ کہ وطن میں اس قدر بے مہری و مغائرت لوگوں سے دیکھی تھی کہ جب پردیس مجھکو راس نہ آیا تو میں نے اسکو بھی وطن ہی تصور کرلیا۔

بود در پہلو بہ تمکینے کہ دل مے گفتمش (عاشقانہ) رفت از شوخی بآئینے کہ جاں نامیدمش

یہاں بود کی ضمیر معشوق کی طرف راجع ہے۔ کہتا ہے کہ وہ میرے پہلو میں ایسی تمکین کے ساتھ بیٹھا تھا جس طرح پہلو میں دل رہتا ہے۔ اور وہ شوخی سے اٹھکر اس طرح چلا گیا کہ میں اسکو جان کہہ اٹھا یعنی جو جان کے جانے سے کیفیت ہوتی ہے وہی اسکے جانے سے ہوئی۔

دل زباں را راز داں آشنائیہا نخواست (عاشقانہ) گاہ بہماں[۵] گفتمش گاہے فلاں نامیدمش
درسلوک از ہرچہ پیش آمد گزشتن داشتم کعبہ دیدم۔ نقش پائے رہرواں نامیدمش

دل درغمش بسوز کہ جاں می دہد عوض ور جاں دہی۔ غمے بہ ازاں می دہد عوض
نبود سخن سرائی ما رائیگاں۔ کہ دوست دل می برد زما و زباں می دہد عوض

کہتا ہے کہ یہ سخن سرائی ہمکو مفت نہیں ملی ہے، بلکہ دوست جب دل لیے لیتا ہے تو اسکے عوض زبان عنایت کرتا ہے۔ زبان کو دل کا عوض قرار دینے میں شاعر نے لطافت یہ رکھی ہے کہ فی الحقیقة جب تک انساں کہیں دل نہیں دیتا اور عاشق نہیں ہوتا تب تک زبان میں گرمی اور شعلہ بیانی پیدا نہیں ہو سکتی، خواہ عشق مجازی ہو خواہ عشق حقیقی۔

مرا کہ بادہ ندارم زروزگار چہ حظ (رندانہ) ترا کہ ہست و نیاشامی از بہار چہ حظ
خوش است کوثر و پاکست بادہ گر درو ست (رندانہ) ازاں رحیق مقدس دریں خمار چہ حظ
چمن پُر از گل و نسریں دلربائی نیست (تصوف) بدست فتنہ ازیں گرد بے سوار چہ حظ

چمن پُر از گل و نسریں سے مراد دنیا ہے، اور دلربا سے مراد وہ ذات بے نشان ہے جو دید و دریافت سے باہر ہے۔ کہتا ہے کہ اس فتنہ خیز دشت یعنی دنیا میں جہاں قدم قدم پر راہزن اور قزاق گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ اس گرد بے سوار سے کیا مدد پہنچ سکتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب راہ میں مسافر کو خطرہ ہوتا ہے اور اسکی کمک کے لیے کوئی سوار آتا ہے تو اول گرد نظر آتی ہے، پھر سوار نمودار ہوتا ہے مگر اس دشت میں گرد یعنی آثار و علامات تو سب موجود ہیں مگر سوار کا کہیں پتہ نہیں۔

---

[۵] ہماں اور فلاں دونوں مرادف یکدیگر ہیں۔ جب کسی کا نام صراحتہً نہیں لینا ہوتا تو وہاں یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اُردو میں ایسے موقع پر دِہ یا وہ شخص یا اُسکا ڈھمکا بولتے ہیں ۱۲۔

چنیں کہ نخل بلنداست و سنگ ناپیدا (التصوف) زمیوہ تا نہ فتد خود ز شاخسار چہ حظ

یعنی جبکہ نخل اس قدر بلند ہے اور پھل جھاڑنے کے لیے پتھر ناپید ہیں تو جب تک میوہ خود درخت سے نہ گرے - یعنی جب تک جاذبہ عنایت ہمکو خود اپنی طرف نہ کھینچے اور شاہد حقیقی خود اپنی جھلکی نہ دکھائے - ہمکو کیا فائدہ ؟

نہ مراد و لتِ دنیا - نہ مرا اجرِ جمیل (شکایت) نہ چو نمرود توانا - نہ شکیبا چو خلیل

بُنہ و بار بہ شبگیر در افگندہ براہ (فکر عقبےٰ) آنکہ دانست سراسیمگیِ صبح رحیل

بُنہ و بار - ساز و سامان - شبگیر پچھلی رات - یعنی جو شخص یہ جانتا ہے کہ کوچ کی صبح کو کیسی گھبراہٹ اور کھلبلی پڑتی ہے - وہ رات ہی سے تمام ساز و ساماں باندھ جوڑ کر رستہ کے سرے پر ڈالدیتا ہے -

نہ کنی چارہ لبِ خشکِ مسلمانے را (رندانہ) اے بہ ترسا بچگان کردہ مے ناب سبیل

یہ خطاب ہے خدا کی طرف - معنی ظاہر ہیں -

غالب سوختہ جاں را چہ بگفتار آری (ناقدر دانی) بہ دیارے کہ ندانند نظیری ز قتیل

ندانند نظیری ز قتیل - یعنی نظیری اور قتیل میں فرق نہیں کرتے -

شعلہ چکد - غم کرا - گل شگفد مزد کو؟ (فخریہ) شمع شبستانم - باد سحر گاہیم

اپنی مصیبت اور اپنی فیض رسانی اور اس پر لوگوں کی بیدردی اور ناقدردانی ظاہر کرتا ہے - کہتا ہے کہ میں گویا شمع شبستانی ہوں کہ اس میں سے شعلے جھڑتے ہیں مگر کسی کو اُسکے ساتھ ہمدردی نہیں - اور گویا میں باد سحر گاہی ہوں جو پھول کھلاتی ہے مگر اُسکی اُجرت کوئی ادا نہیں کرتا -

از صف طفلاں و سنگ رہ شدہ بر خلق تنگ (شوخی) زود ز کو نگذرد کوکبۂ شاہیم

یعنی میری شاہانہ سواری کوچے سے جلد نہیں گزرتی کیونکہ لڑکوں کے ہجوم اور پتھروں کے ستھراؤ سے راہ تنگ ہو جاتی ہے -

جذب تو باید قوی کال ببرد۔ باک نیست (تصوف) گر نتواند رسید بخت بہ ہمراہیم
کہتا ہے کہ تیرا جذبہ قوی چاہیے جو مجھکو منزل تک لیجائے۔ پس نصیب اگر میرے ساتھ نہ چل سکے تو کچھ حرج نہیں۔

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس (فخریہ) ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم
برلب یا علی سرائے۔ بادہ روانہ کردہ ایم (رندانہ) مشرب حق گزیدہ ایم عیش مغانہ کردہ ایم
روانہ کردہ ایم۔ یعنی جاری کردہ ایم۔ کہتا ہے کہ چونکہ لب پر یا علی جاری ہے اس لحاظ سے تو ہم نے مذہب حق اختیار کیا ہے، اور چونکہ اس پر شراب جاری ہے اس لحاظ سے مغوں، یعنے آتش پرستوں کا سا عیش کرتے ہیں۔ یعنی دین و دنیا دونوں ہمکو حاصل ہیں۔

بادہ بوام خوردہ و زر بہ قمار باختہ (ندامت) وہ کہ زہر چہ ناسزاست ہم بسزا نکردہ ایم
یعنی شراب پینا اور روپیہ ضائع کرنا تو برا تھا ہی، ہم نے ان برائیوں کو بھی خوبی کے ساتھ نہ کیا۔ شراب پی تو قرض کی، اور روپیہ کھویا تو جوے میں۔

نالہ بلب شکستہ ایم۔ داغ بدل نہفتہ ایم (اخفاے عشق) دولتیان ممسکیم زر بخزانہ کردہ ایم
نالہ بلب شکستہ ایم۔ یعنی اُسکو منہ سے نہیں نکلنے دیتے، اور ضبط کرتے ہیں اور داغ کو دل میں چھپائے رکھتے ہیں، ہم دولتمند تو ہیں مگر خسیس ہیں اپنی دولت کو خزانے میں رکھتے ہیں۔

گر فراموشی بفریادم رسد۔ وقتست وقت (تصوف) رفتہ ام از خویشتن چندانکہ در یادِ خودم
کہتا ہے کہ میں اپنے آپے سے تو گزر گیا ہوں مگر ابھی آپے کو بھولا نہیں ہوں اگر فراموشی اسوقت میری فریاد کو پہنچے اور آپے کو بھلا بھی دے تو بہت مناسب ہے۔

ہر قدم لختے زخود رفتن بود در بارِ من ہمچو شمع بزم در راہ فنا زادِ خودم
کہتا ہے کہ راہ فنا میں جو کچھ کہ میرے بار۔ یعنی خورجی یا زنبیل۔ میں ہے وہ صرف

یہی ہے کہ ہر قدم پر تھوڑا تھوڑا اپنے آپ سے دور ہوتا جاتا ہوں۔ گویا جس طرح کہ شمع راہ فنا میں آپ ہی اپنا زاد راہ ہے۔ کہ برابر پگھلتی جاتی ہے اور زاد راہ کی طرح گھٹتی جاتی ہے اسی طرح میں بھی آپ اپنا زاد راہ ہوں۔

یاد باداں روزگاراں کاعتباری داشتم (عاشقانہ) آہ آتشناک وچشم اشکباری داشتم

جوانی کے زمانے کو یاد کرتا ہے۔ جبکہ بوالہوسی یا عشق و محبت زور شور پر تھا، آہ آتشناک تھی اور آنکھ اشکبار۔

دیگر از خویشتم خبر نبود تکلف برطرف (بیخودی) ایں قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

ایں چہ شور است کہ از شوق تو در سر دارم (عاشقانہ) دل پروانہ و تمکین سمندر دارم

آں چرا در طرب ایں زچہ رو در تعب است (تصوف) خندہ بر غفلت درویش و توانگر دارم

کہتا ہے کہ میں درویش اور توانگر دونوں کی غفلت پر ہنستا ہوں جبکہ دنیا کا طرب اور تعب دونوں ہیچ ہیں تو ایک خوش کیوں ہے؟ اور دوسرا رنجیدہ کس لیے ہے؟

رازدارِ تو و بدنام کنِ گردشِ چرخ (مناجات) ہم سپاس از تو و ہم شکوہ ز اختر دارم

خدا سے کہتا ہے کہ جو تجھ سے تکلیف پہنچتی ہے اُسکی مصلحت کو خوب سمجھتا ہوں مگر آسمان کو بدنام کرتا ہوں۔ پس درحقیقت تیرا احسان مند ہوں مگر بظاہر ستارے کا شکوہ گزار۔

خوشنودم از تو وز پے دورباشِ خلق (عاشقانہ) آوازۂ جفائے تو در عالم افگنم

کہتا ہے کہ میں نے تجھکو جفاکار اسلیے مشہور کر رکھا ہے کہ اور کوئی تیری طرف رغبت نہ کرے ورنہ درحقیقت میں تجھ سے ہر طرح راضی اور خوشنود ہوں۔

دو زند گر بفرض زمیں را بہ آسماں (فخر) حاشا کزیں فشار در ابرو خم افگنم

ہم بعالم ز اہل عالم برکنار افتادہ ام (افسوس مشتمل فخر) چوں امام سبحہ بیروں از شمار افتادہ ام

زمن حذر نکنی گر لباس دیں دارم نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم

اس شعر کے مصداق وہ مکار اور ریاکار لوگ ہیں جنکو متشرع اور مقدس سمجھکر اُنکے آگے کوئی بات ہنسی یا بے تہذیبی یا رند مشربی کی کہتے ہوئے شرم آتی ہے، مگر انکو ذرا ٹٹول کر دیکھیے تو وہ ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلنے والے نکلتے ہیں۔ اس میں خطاب معشوق کی طرف ہے جو نو عمر ہونے کے سبب مقدس آدمیوں کی صحبت سے بھاگتا ہے۔

(شکایت)

نشستہ ام بگدائی بشاہراہ و ہنوز　　ہزار دزد بہر گوشہ در کمین دارم

ہنوز کا لفظ یہاں ایسا ہے جیسا اُردو میں "تاہم" باوجود اسکے" بولتے ہیں۔ کہتا ہے کہ میں امیروں کی مدح سرائی کے لحاظ سے تو ایسا ہوں جیسے شاہراہ میں ایک گدا بیٹھا ہو، مگر اس لحاظ سے کہ لوگ میرے مضمون چراتے ہیں میرا یہ حال ہے کہ ہزاروں چوٹے میری گھات میں لگے ہوئے ہیں۔

زوعدہ دوزخیاں رافزوں نیازارند (توقع) توقعے عجب از آہ آتشیں دارم

کہتا ہے کہ اہل دوزخ کو ظاہر ہے کہ میعادِ معیّن سے زیادہ دوزخ میں نہ رکھیں گے، پس اس خیال سے میں اپنی آہ آتشیں سے ایک عجیب توقع رکھتا ہوں، یعنی یہ کہ آہ آتشین بھی ہمیشہ نہ رہیگی۔ اس توقع کو عجیب اسلیے کہا ہے کہ اُسکو بھی دوزخ پر قیاس کر کے اُس سے آخر کار نجات کا امیدوار ہے۔

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب　　خطا نمودہ ام وچشم آفریں دارم

دوسرا مصرع نظیری کا ہے جسکا پہلا اصل مصرع یہ ہے،

مرا بہ سادہ دلیہای من تواں بخشید

نظیری کا یہ شعر بڑے رتبے کا ہے، مگر حق یہ ہے کہ مرزا نے یہ مصرع تضمین کیا کیا ہے گویا اسکو چھین لیا ہے۔ مرزا کے مقطع کا مطلب اب یہ ہو گیا کہ نظیری کی غزل پر غزل لکھنی تھی تو خطا۔ مگر میں نے اس پر ایسی غزل لکھی ہے

کر اپنی اس خطا پر آفریں کا اُمید وار ہوں۔

غزل مسلسل عاشقانہ

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم　　قضا بگردش رطلِ گراں بگردانیم

معشوق سے کہتا ہے کہ تو آ، تاکہ آسمان کا یہ قاعدہ کہ وہ دوست کو دوست سے نہیں ملنے دیتا ہم تم دونوں ملکر پلٹ دیں اور حکم قضا کو رطل گراں۔ یعنی جام شراب۔ کی گردش سے پھیر دیں۔

بگوشۂ بنشینیم و در فراز کنیم　　بکوچہ بر سر رہ پاسباں بگردانیم

در فراز کنیم۔ یعنی دروازہ بند کردیں اور چوکیدار کو حکم دیں کہ کوچے میں پھرتا رہے اور کسی کو نہ آنے دے۔

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم　　وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم

اگر کلیم شود ہمزباں سخن نہ کنیم　　وگر خلیل شود میہماں بگردانیم

گل افگنیم و گلابے بہ رہگذر پاشیم　　مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن رانیم　　بکار و بار زنے کارواں بگردانیم

گہے بہ لابہ سخن با ادا بیامیزیم　　گہے بہ بوسہ زباں در دہاں بگردانیم

لابہ۔ تملق و خوشامد۔ سخن کو ادا کے ساتھ ملانا۔ راؤ چاؤ اور راز و نیاز کی باتیں کرنا۔

نہ شرم ہیک سو، باہم آویزیم　　بشوخی کہ رُخ اختراں بگردانیم

ز جوشِ سینہ سحر را نفس فرو بندیم　　بلائے گرمی روز از جہاں بگردانیم

یعنی اختلاط کے موقع پر ہم دونوں ایسے زور زور سے سانس لیں کہ صبح کا دم بند کر دیں، اور اسکو طلوع نہ ہونے دیں، اور دن کی گرمی کی بلا جہان سے ٹالدیں۔

بوہم شب ہمہ را در غلط بیندازیم　　ز نیمہ رہ رمہ را باشباں بگردانیم

یعنی سب کو رات کے دھوکے میں ڈالدیں یہاں تک کہ چرواہے کو ریوڑ سمیت آدھے رستے سے شہر کی طرف اُلٹا پھیر دیں۔

بجنگ باج ستانان شاخساری را　　　تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم

یعنی جو لوگ درختوں سے میوہ اور فواکہ کی ڈالی لینے کو آئیں انکو لڑکر باغ کے باہر ہی سے خالی جھال کے ساتھ پھیر دیں۔

بہ صلح بال فشانان صبحگاہی را　　　ز شاخسار سوے آشیاں بگردانیم

یعنی جو پرندے صبح کو گھونسلوں سے درختوں پر آکر کلیل کرتے ہیں انکو نرمی اور چمکار کے ساتھ گھونسلوں کی طرف لوٹا دیں۔

ز حیدریم من و تو۔ زما عجب نہ بود　　　گر آفتاب سوے خاوراں بگردانیم

کہتا ہے کہ ہم تم حیدری ہیں، ہم سے تعجب نہیں کہ جس طرح بقول بعض حیدر کرار سے معجزہ ردالشمس ہوتا تھا۔ ہم بھی آفتاب کو مشرق کی طرف واپس پھیر دیں۔

رفت بر ما انچہ خود ما خواستیم　(اندراست)　وایہ از سلطان بہ غوغا خواستیم

قاعدہ ہے کہ جب فقیر بادشاہ سے بھیک مانگتے وقت شور وغل کرتا ہے تو اسکو مار کر ہٹا دیتے ہیں اور کچھ نہیں دیتے کہتا ہے ہمپر جو سختی گزری وہ خود ہم نے ہی چاہی تھی، کیونکہ بادشاہ سے بھیک مانگتے وقت غل شور بہت کیا، اسلیے وہاں سے دھتکارے گئے اور کچھ نہ ملا۔ سلطان سے مراد خدا تعالیٰ ہے۔

دانش و گنجینہ پنداری یکے ست　(فخریہ)　حق نہاں داد آں چہ پیدا خواستیم

پنداری اور گوئی اور گویا کے ایک معنی ہیں۔ کہتا ہے کہ علم اور خزانہ گویا ایک ہی چیز ہیں، کیونکہ جو چیز ہم نے علانیہ مانگی۔ یعنی دولت۔ وہ خدا نے ہم کو پوشیدہ طور پر دی۔ یعنی علم ہنر۔

رفت و باز آمد ہما در دام ما　(تصوف)　باز سر دادیم و عنقا خواستیم

کہتا ہے کہ ہما ہمارے دام میں پھنس کر نکل گیا تھا پھر آن پھنسا، اب چاہیے تھا کہ اُسکی زیادہ نگرانی کرتے اور اُسکو نکلنے نہ دیتے، مگر ہم نے اسکو خود چھوڑ دیا اور عنقا کی خواہش کی۔ ہما سے مراد دولت دنیا، اور عنقا سے مراد احدیت ذات۔

وحشتے در سفر از برگ سفر داشتہ ایم (آزادی) توشۂ راہ۔ ولے بود کہ برداشتہ ایم

داغ احسانِ قبولی بُعمانش نیست (فخر منضمن شکایت) ناز بر خرمی بختِ ہنر داشتہ ایم

قبولی اور قبول ایک معنی میں آتا ہے۔ خرمی بخت ہنر۔ یعنی سرسبزی بخت ہنر۔ کہتا ہے کہ ہمکو اپنے ہنر کی خوش نصیبی پر ناز ہے اس پر کمینوں کی قبولیت کے احسان کا داغ نہیں ہے۔

زخم جگرم بخیۂ و مرہم نہ پسندم (فخر منضمن شکایت) موج گہرم جنبش و رفتار نداثم

یعنی جس طرح زخم جگر تک بخیہ و مرہم کی رسائی نہیں ہے اور آب گہر کی موج میں جنبش و رفتار نہیں ہے، ایسا ہی میرا حال ہے یعنی نہ کسی کو میرے درد کی خبر ہے۔ نہ میرے کمال کی اطلاع ہے۔

نقدِ خردم۔ سکۂ سلطان نپذیرم (فخر) جنسِ ہنرم گرمی بازار ندانم

غالب نبود کوتہی از دوست۔ ہمانا (شکر) زاں ساں دہدم کام کہ بسیار ندانم

یعنی وہ اس طرح حاجت روائی کرتا ہے کہ اکثر مجھکو شعور نہیں ہوتا کہ کیونکر یہ کام بن گیا۔

ذیل کی غزل نواب مصطفےٰ مرحوم کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا اُس میں پڑھی گئی تھی چونکہ دلی کے تمام نامور شعرا کا، جو وہاں فارسی غزلیں لکھکر لیجاتے تھے۔ مرزا نے اس غزل میں ذکر کیا ہے اور غزل بھی نہایت فصیح ہے اسلیے بطور یادگار کے ساری غزل یہاں نقل کیجاتی ہے۔

باپری[1] چہرہ غزالان وزعدم رم شاں (عاشقانہ) دل بمردم نخم طرۂ خم درخم شاں

---

[1] یعنی زہے پری چہرہ غزالاں۔ ۱۲

(عاشقانہ)

کافر انند جہاں جوے۔ کہ ہرگز نہ بود　　طرۂ حور دلاویز تر از پرچمِ شاں

(عاشقانہ)

آشکارا کُش، بدنام و نکو نامی جوے　　آہ ازیں طائفہ، وانکس کہ بود محرمِ شاں

(صدق طلب)

زشک بر تشنۂ تنہا رو داری دارم　　نہ بر آسودہ دلانِ حرم و زمزمِ شاں

(اخلاق)

بگذر از خستہ دلانے کہ ندانی ۔ ہشدار　　خستگانند کہ دانی و نداری غمِ شاں

یعنی ان مصیبت زدوں کو جانے دے جنکو تو نہیں جانتا، مگر خبردار رہ کہ بہت سے ایسے آفت زدہ ہیں جنکو تو جانتا ہے مگر اُنکا کچھ غم تجھ کو نہیں۔

(بیدردی اطبا)

داغِ[لہ] خوں گرمیِ ایں چارہ گرانم ما گو ی　　آتش است آتش اگر پنبہ و گر مرہمِ شاں

(ذکر معاصرین)

ایکہ راندی سخن از نکتہ سرایانِ عجم　　چہ بما منتِ بسیار نہی از کمِ شاں

ہند را خوش[لہ] نفسانند سخنور ۔ کہ بود　　باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں

مومنؔ و نیرؔ و صہبائیؔ و علویؔ ۔ وانگاہ　　حسرتیؔ اشرفؔ و آزردہؔ بود اعظمِ شاں

غالبِؔ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بشمار　　ہست در بزمِ سخن ہمنفس و ہمدمِ شاں

مومن ۔ یعنی حکیم مومن خاں ۔ جنکے دیوان اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں موجود ہیں۔ نیّر ۔ یعنی نواب ضیاء الدین احمد خاں رئیس لوہارو جنکا کلام دونوں زبانوں میں بقدرِ معتدبہ موجود ہے مگر کوئی دیوان مرتب نہیں ہوا۔ صہبائی یعنی مولانا امام بخش جنکی نظم و نثر فارسی اور دیگر رسائل اور شروح تین جلدوں میں چھپکر شایع ہو چکی ہیں علوی مولانا عبد اللہ خاں علوی اُستادِ مولانا صہبائی جنکی نظم و نثر فارسی چھپ چکی ہے، اور عربی میں بھی انکے قصائد موجود ہیں۔ حسرتی ۔ نواب محمد مصطفٰے خاں رئیس جہانگیر آباد ۔ جنکے دیوان اُردو و فارسی دونوں زبانوں میں چھپ چکے ہیں، اور اُس کے سوا سفرنامۂ حج تذکرۂ گلشن بیخار، اور رقعاتِ فارسی بھی انکی تصانیف سے شایع ہو چکی ہیں۔ آزردہ ۔ مولانا مفتی

لہ محبت ہمدردی لہ خوش نفساں یعنی سخنوراں ہند ۔ ۱۲

محمد صدرالدین خاں جنکا کلام اُردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں موجود تھا مگر افسوس ہے کہ اُس میں سے بہت کچھ ضائع ہوگیا ہے لیکن بعض مذہبی رسالے جواُن سے یادگار رہ گئے ہیں شائع ہوچکے ہیں۔

تازدیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن (فخریہ) ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است (فخریہ) شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

مطرب از شورم بہر بزمے کہ خواہد زد نوا (فخریہ) چاکہا ایثارِ جیبِ پیرہن خواہد شدن

حرف حرفم در مذاق فتنہ جا خواہد گرفت (فخریہ) دستگاہِ نازِ شیخ و برہمن خواہد شدن

کہتا ہے کہ میرا ایک ایک حرف بذاق فتنہ میں جگہ پائیگا۔ یعنی فتنہ کو پسند آئیگا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ برہمن اسکو اپنے موافق سمجھے گا اور شیخ اپنے موافق خیال کریگا، اور دونوں اپنی اپنی جگہ اس پر فخر کرینگے، اور ایک دوسرے کو جھٹلائینگے۔ اور آپس میں گل خپ ہونگے۔

(انجام شاعری)

ہے چہ میگویم؟ اگر اینست وضع روزگار دفترِ اشعارِ باب سوختن خواہد شدن

اس سے پہلے بطور فخر کے کہا تھا کہ یوں ہوگا اور وُوں ہوگا، پھر کہتا ہے کہ ہے ہے میں کیا کہتا ہوں؟ اگر زمانے کا حال ایسا ہی رہا تو دفتر شعر باب سوختن یعنی جلادینے کے لائق ہوجائیگا۔

چشم کور آئینہ دعوی بکف خواہد گرفت (انجام شاعری) دستِ شل مشاطۂ زلفِ سخن خواہد شدن

شاہدِ مضمون کہ اینک شہری جان و دست روستا آوارہ کام و دہن خواہد شدن

یعنی آیندہ یہ حال ہوگا کہ شاہد مضمون جو اب جان و دل کے شہر میں مقام رکھتا ہے وہ کام و دہن کے دیہات میں آوارہ ہوجائیگا۔ یعنی جن اشعار اور خیالات میں اب نہایت دقیق اور گہری نگاہ سے غور کیجاتی ہے وہ صرف لوگوں کی زبانوں پر رہ جائیں گے اور انکی تہ کو کوئی نہ پہنچیگا۔

زاغ راغ اندر ہوائے نغمہ بال و پر زناں (انجام شاعری) ہم نوائے پردہ سنجان چمن خواہد شدن

جنگلی کوّے (یعنی تک بندی کرنے والے شاعر) نغمہ سنجی کی ہوا میں پنکھ پسارے ہوئے چمن کے نغمہ سنجوں (یعنی عالی درجہ شاعروں کی) برابری کرینگے۔

شاد باش اے دل درین محفل کہ ہر جا نغمہ ایست (انجام دنیا) شیون رنج فراقِ جان و تن خواہد شدن

اب کہتا ہے کہ دنیا میں ان باتوں کا فکر کرنا بے سود ہے۔ یہ سب نغمے موزوں ہوں یا ناموزوں ایک دن موت کے نوحے بن جائینگے۔

ہم فروغ شمع ہستی تیرگی خواہد گزید (انجام دنیا) ہم بساط بزم مستی پرشکن خواہد شدن

گرد پندار وجود از رہگذر خواہد نشست بحر توحیدِ عیانی موجزن خواہد شدن

کہتا ہے کہ ہستی کے دھوکے کا غبار جو راہ میں اُٹھا ہوا نظر آتا ہے یہ سب بیٹھ جائیگا یعنی سب فنا ہو جائینگے اور توحید عیانی کا دریا موجزن ہو گا یعنی ذات واحد کے سوا کچھ باقی نہ رہیگا۔

(ترجیح کافر بہ مسلمان)

دولت بغلط نبود از سعی پشیماں شو کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

کہتا ہے کہ دولت یعنی سعادت کبھی غلطی نہیں کرتی، وہ اسکے پاس جاتی ہے جو اسکے لائق ہوتا ہے پس تو اے مخاطب اپنی سعی سے پشیمان ہو۔ اور وہ دولت کیا ہے؟ کافر ہونا۔ کہتا ہے کہ تو کافر تو نہیں ہو سکتا۔ لاچار مسلمانی پر قناعت کر۔ غالباً مرزا نے کفر سے وہ کفر مراد لیا ہے جو صوفیۂ کرام کی اصطلاح کے موافق ایک بڑا مرتبہ مراتب فقر و درویشی میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن قطع نظر ان معنوں کے اس شعر کے ایک اور معنی نہایت لطیف و پاکیزہ زمانے کے حسب حال بھی ہو سکتے ہیں جو شاید شعر کہتے وقت مرزا کے خیال میں نہ گزرے ہوں، مگر ضرور ہے کہ انھیں کے نتائج افکار میں شمار کیے جائیں۔ کیونکہ بلغا اکثر کلام کی بنیاد ایسے جامع اور حادی الفاظ پر رکھتے ہیں کہ گو قائل کا مقصود ایک خاص معنی

سے زیادہ نہ ہو مگر کلام اپنی عمومیت کے سبب بہت سے محمل رکھتا ہو۔ مطلب یہ ہے
کہ ایسا مسلمان ہونا۔ جسکو سارا زمانہ مسلمان کہے اور مسلمان سمجھے یہ تو بہت
آسان ہے، مگر قوم کی بھلائی کی وہ تدبیریں کرنی۔ کہ اُسکی بھلائی انکے بغیر
دشوار معلوم ہو۔ اور ان تدبیروں کے اختیار کرنے میں لوگوں کے طعن تشنیع
سے نہ ڈرنا۔ یہاں تک کہ بدمذہب اور کافر مشہور ہونا مگر قوم کی خیراندیشی
سے دست کش نہ ہونا۔ نہایت دشوار بلکہ بعض حالتوں میں قریب ناممکن کے
ہے کہ ہزاروں اور لاکھوں میں نہیں بلکہ کروروں میں ایک ایسا فرد دنیا کے
عجائبات میں سمجھا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ایسا کافر بننا تو بہت مشکل ہے،
ناچار مسلمانی پر اکتفا کر۔ یہ معنی کسی کے ذہن نشین کرنے نہایت مشکل تھے
مگر الحمدللہ کہ خود ہماری قوم میں حسن اتفاق سے اسوقت ایک شخص موجود ہے
جسکی حالت پر نظر کرنے کے بعد اس شعر کے کوئی دوسرے معنی ان معنوں سے
زیادہ چسپاں نہیں معلوم ہوتے یعنی ڈاکٹر سر سید احمد خاں جس نے کافر، ملحد،
نیچری، دجال، سب کچھ کہلوانا منظور کیا مگر قوم کی خیرخواہی سے دست بردار نہ ہوا۔

از ہرزہ رواں گشتن قلزم نتواں گشتن (قطعاً، ناقصاں) جوئی! بہ خیاباں رو سیلی! بہ بیاباں شو

ہرزہ یعنی برلے نام جاری ہو جانے سے قلزم نہیں ہوا جاسکتا۔ اے مخاطب تو
ایک نالی ہے۔ باغ کی کیاریوں میں جا، اور ایک رو ہے جنگل کی راہ لے۔
یہ اُن ناقص العیار لوگوں کی طرف خطاب ہے جو کسی فن میں تھوڑی سی
شُدبُد حاصل کرکے اپنے تئیں کاملین میں شمار کرنے لگتے ہیں۔

گر چرخ فلک گردی سر بر خطِ فرماں نہ در گوے زمیں باشی وقف خم چوگاں شو

یعنی تو کیسا ہی عالی رتبہ اور گرانمایہ ہو جائے اطاعت و فرمانبرداری کرنی
ضرور ہے چاہو اطاعت کو عام لو اور چاہو خاص خدا کی فرمانبرداری مراد رکھو

کیونکر جس طرح دین میں بغیر خدا اور رسول کی فرماں برداری کے کام نہیں چلتا اسی طرح دنیا میں سلاطین وملوک اور ماں اور باپ اور افسر اور آقا وغیرہ کی اطاعت کے بغیر کچھ بن نہیں آتی۔

(صبر و شکیب)
دربند شکیبائی مردم زجگر خائی   اے حوصلہ تنگی کن۔ اے غصہ فراواں شو
کہتا ہے کہ صبر کے شکنجے میں کلیجہ مسوستا مسوستا مرگیا۔ یعنی تھک گیا۔ اب سوا اسکے اور کسی طرح اس بلا سے چھٹکارا نہیں کہ حوصلہ تنگی کرنے لگے غم حد سے بڑھ جائے۔ پس کہتا ہے کہ اے حوصلہ تو جیساکہ اب تک فراخ اور وسیع رہا ہے اب برخلاف اُسکے تنگ ہو جا، اور اے غم تو زیادہ ہو جا تاکہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکے، اور کھل کھیلوں۔ اور جگر خواری کے عذاب سے نجات پاؤں۔

(شکایت)
سرمایہ کرامت کن وانگاہ بغارت بر   برخرمن ما برقے برمزرعہ باراں شو
اگرچہ ہوتا ہمیشہ یہی ہے کہ اول سرمایہ دیتے ہیں پھر جب چاہتے ہیں اُسکو تباہ کردیتے ہیں مگر شاعر بطور مبالغے کے یہ جتاتا ہے کہ ہماری کھیتی پر مینھ تو کبھی نہیں برساتا مگر خرمن پر بجلی گراتا رہتا ہے۔ یہ انسان کی ایک قدرتی خاصیت ہے کہ مصیبتوں کے وقت نعمتوں کو بالکل فراموش کر دیتا ہے اسی خاصیت پر شاعر نے شعر کی بنیاد رکھی ہے۔

ذیل کی غزل مسلسل اور محض عاشقانہ ہے۔ جس میں معشوق کی خصلتیں بیان کی ہیں اور اُسکو بہادر شاہ کی تعریف اور شکایت ظریفانہ پر ختم کیا ہے۔ اس غزل میں صرف حسنِ بیان کا لطف ہے، خیالات بلند نہیں ہیں۔

(غزل مسلسل عاشقانہ)
بتے دارم از اہل دل رم گرفتہ   بشوخی دل از خویشتن ہم گرفتہ
دل گرفتن اکتا جانا یعنی اس قدر شوخ اور نازک مزاج ہے کہ اپنے آپ سے بھی بگڑ جاتا ہے۔

زسفاک گفتن چو گُل بر شگفتہ — دریں شیوہ خود را مسلم گرفتہ

یعنی اگر کوئی اُسے سفاک کہتا ہے تو بُرا نہیں مانتا بلکہ خوش ہوتا ہے گویا اپنی سفاکی کو مسلم الثبوت مانے ہوے ہے۔

فسوں خواندہ وکار عیسیٰ نمودہ — پری بودہ و خاتم از جم گرفتہ

یعنی افسوں سے معجزے کا کام لیتا ہے اور پری ہو کر جمشید کی انگوٹھی چھین لیتا ہے۔

دمش رخنہ در زہد یوسف فگندہ — غمش گندم از دست آدم گرفتہ

دم سے مراد بات ہے۔ دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ اسکے غم میں آدم کو گندم جیسی چیز فراموش ہو جاتی ہے۔

گہے خردہ بر لحن مطرب سرودہ — گہے طعنہ بر نطق ہمدم گرفتہ

بہ بیداد صد کشتہ برہم نہادہ — ببازیچہ صد گونہ ماتم گرفتہ

یعنی آپ ہی مارتا ہے اور آپ ہی بطور کھیل کے ماتم کرتا ہے۔

برویش زگرمی نگہ تاب خوردہ — بکویش برفتن صبا دم گرفتہ

نیارد زمن ہیچ گہ یاد ہرگز — مگر خوے خاقان اعظم گرفتہ

ظفر کز دم اوست در نکتہ سنجی — کہ غالب بآواز عالم گرفتہ

یہاں دم کے معنی افسوں اور کرامت کے ہیں تقدیر عبارت یوں ہے کہ غالب در نکتہ سنجی بہ آواز عالم گرفتہ۔

(غزل مسلسل در توحید)

چوں زبانہا لال و جانہا پُر زغوغا کردہٗ — بایدت از خویش پرسید انچہ باما کردہٗ

یہ تمام غزل توحید میں ہے۔ کہتا ہے جبکہ تو نے ہماری زبانیں گونگی کردی ہیں اور باوجود اسکے جانوں کے اندر شورش بھر دی ہے۔ اب تو اپنے ہی سے پوچھ لے کہ تو نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔

گر نہ مشتاق عرض دستگاہِ حسن خویش — "جاں فدایت" دیدہ از بہر چہ بینا کردۂ
ہفت دوزخ در نہادِ شرمساری مضمر است — انتقام است ایں کہ با مجرم مدارا کردۂ

کہتا ہے کہ شرمندگی وہ عذاب ہے جسکی نہاد یعنی ذات میں ساتوں دوزخ چھپی ہوئی ہیں۔ پس اگر تو نے گنہگار کے ساتھ مدارا یعنی رعایت کی اور اسکو بخشدیا تو عین انتقام ہے، وہ اس شرمندگی سے کہ باوجود اس قدر گناہوں کے ہم کو کچھ سزا نہیں دی گویا سات دوزخوں میں جھونک دیا گیا۔

صد کشادا آنرا کہ ہم امروز رخ بنمودۂ — مژدہ باد آنرا کہ محوِ ذوق فردا کردۂ
خستگاں را دل بہ پرسشہائے پنہاں بردۂ — با درستاں گر نوازشہائے پیدا کردۂ

خستگاں، زخمی اور شکستہ دل لوگ۔ یعنی جن کی حالت زار بظاہر ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا انپر خدا کا غصہ ہے۔ درست صحیح و سالم کو کہتے ہیں، درستاں اس کی جمع ہے یعنی وہ لوگ جن کی حالت درست اور ہر ایک خستگی اور شکستگی سے محفوظ ہے گویا ان پر خدا کی عنایت و مہربانی سب سے زیادہ ہے۔ کہتا ہے کہ اگر تو نے درستوں پر ظاہری عنایتیں مبذول فرمائی ہیں تو زخمی دلوں کو پوشیدہ مہربانیوں سے مفتوں کیا ہے۔

چشمۂ نوش ست از زہرِ عتابت کامِ جاں — تلخیِ مے در مذاقِ ما گوارا کردۂ

خدا تعالیٰ کے غصے اور عتاب کو چشمۂ نوش قرار دیتا ہے، اور اُسکو شراب سے تشبیہ دی ہے۔ کہ جس طرح شراب کا ذائقہ ہر شخص کو تلخ معلوم ہوتا ہے مگر شرابیوں کے مذاق میں اس سے زیادہ کوئی شے خوشگوار نہیں۔ اسی طرح تیرا عتاب گو بظاہر تلخ معلوم ہو مگر تیرے عشاق اُسکو چشمۂ نوش سمجھتے ہیں۔

جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر ست — خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردۂ

کہتا ہے کہ تو نے مخلوقات کو پیدا کرکے اس میں اپنے حسن کا آپ تماشا دیکھا ہے،

تو گویا جلوہ حسن اور نظارہ عشق درحقیقت ایک ہی جنس سے ہیں۔ یعنی ناظر اور منظور ایک چیز ہیں۔

چارہ در سنگ وگیاہ ورنج با جاندار بود ۔۔۔ پیش ازاں کیں در رسد آں را مہیا کردہ

کہتا ہے کہ بیماری تو جاندار کے ساتھ مخصوص تھی، اور بیماری کا علاج سنگ وگیاہ یعنی معدنیات اور نباتات میں تھا، پس تو نے جانداروں کے پیدا کرنے سے پہلے سنگ وگیاہ کو مہیا کر دیا۔ جیسا کہ علم جیولوجی میں پہاڑوں اور درختوں کا حیوان اور انسان سے پہلے پیدا ہونا ثابت کیا گیا ہے۔

دیدہ میگرید، زباں می نالد و دل می تپد ۔۔۔ عقدہ ہا از کار غالب سربسر وا کردۂ

مقطع میں پھر اپنی عادت کے موافق شوخی کی ہے۔ تمام ناملائم حالتوں کو جو قائل پر گذر رہی ہیں انکو از راہ شوخی اور طنز کے عمدہ پیرایے میں ڈھالا ہے۔ کہتا ہے کہ آنکھ روتی ہے، زبان فریاد کرتی ہے، اور دل تڑپتا ہے، گویا تمام عقدے تو نے حل کر دیے ہیں۔ چونکہ آنکھ کا رونا، زبان کا فریاد کرنا اور دل کا تڑپنا، ان تینوں حالتوں میں ایک کشایش کی صورت محسوس ہوتی ہے اسلیے ان تمام حالتوں کو اپنے عقدوں کے حل کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ اگر اس مضمون کو شوخی پر محمول نہ کیا جائے تو یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ عشق کی معراج یہی ہے کہ آنکھ روئے، زبان فریاد کرے، اور دل تڑپے، پس غالب پر جو یہ حالتیں طاری ہیں گویا عشق کی راہ میں جتنے عقدے تھے وہ تو نے سب حل کر دیے۔

(غزل مسلسل عاشقانہ)

تا بجم ز دل برد کافر ادائے ۔۔۔ بالا بلندے کوتہ قبائے

چوں مرگ ناگہ بسیار تلخے ۔۔۔ چوں جاں شیریں اندک وفائے

در کام بخشی ممسک امیرے ۔۔۔ در دل ستانی مبرم گدائے

گستاخ سازے پوزش پسندے ۔۔۔ طاقت گدازے مہر آزمائے

از خوے ناخوش دوزخ نہیبے وز روے دلکش مینو لقائے
زردشت کیشے آتش پرستے برسم گزارے زمزم سرائے

بُرسم۔ جھاؤ یا انار وغیرہ کی بالشت بالشت بھر کی لکڑی کاٹ کر آتش پرست رکھ لیتے ہیں، اور عبادت یا نہانے، یا کھانے کے وقت انکو ہاتھ میں لیکر پڑھتے ہیں برسم گزار اور زمزم سرائے آتش پرست کو کہتے ہیں۔ زمزم اور زمزمہ وہ دعا ہے جو آتش پرست بُرسم ہاتھ میں لیکر پڑھتے ہیں۔

در کینہ ورزی تفسیدہ دشتے در مہربانی لبستان سرائے

تفسیدہ دشت تپتا ہوا صحرا۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

از زلف پرخم مشکیں نقابے از تابش تن زریں ردائے

یعنی زلف پُرخم اسکے چہرے پر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے سیاہ نقاب منہ پر پڑی ہوئی ہو۔ اور جو کپڑا وہ بدن پر ڈالتا ہے وہ بدن کی چمک دمک سے سنہرا معلوم ہوتا ہے۔

در عرض دعوے لیلے نکوہے بر رغم غالب مجنوں ستائے

یعنی جب دعوی حسن وجمال کرتا ہے تو لیلیٰ کی ہجو کرتا ہے اور غالب کے چڑانے کو مجنوں کی تعریف کرتا ہے کہ بڑا عاشق صادق تھا۔

تو کے ز جور پشیماں شدی چہ می گوئی (عاشقانہ) دروغ راست نمائی کہ داشتی داری

یعنی تو جو یہ کہتا ہے کہ "میں ظلم سے پشیمان ہوگیا ہوں" تو کب پشیمان ہوا ہے؟ کیونکہ وہ جھوٹ جو سچ معلوم ہو۔ جیسا تو پہلے بولتا تھا اب بھی بولتا ہے۔ پس تیرا یہ کہنا کہ میں ظلم سے پشیمان ہوں یہ بھی اسی ظلم میں داخل ہے۔

بسینہ چوں دل و در دل چو جاں خزیدی باز (عاشقانہ) نگاہ مہر فزائے کہ داشتی داری

کہتا ہے کہ تو سینے میں دل کی طرح اور دل میں جان کی طرح بیٹھ چکا ہے، پھر بھی

تیری نگاہِ مہر فزا کا وہی حال ہے جو پہلے تھا، کہ محبت کی آگ بھڑکا کے چلی جاتی ہے
عتاب و مہر تو از ہم شناختن نتواں (عاشقانہ) خرد فریب ادائے کہ داشتی داری
جہانیاں ز تو برگشتہ اند گر غالب (شکایتہ و گلہ) ترا چہ باک بخدائے کہ داشتی داری
بیہودہ نیست سعی صبا در دیار ما (تصوف) اے بوئے گل پیام تمنائے کیستی
یادش بخیر تا چہ قدر سبز بودہٗ (عاشقانہ) اے طرفِ جوئبار چمن جائے کیستی
جائے کسے سبز بودن - اسکی جگہ کا خالی رہنا - اور سبز ہونے کے معنی ہرسبز وشاداب ہونے کے بھی ہیں - طرفِ جوئبار - کنارہ جوئبار - چمن کی پٹڑی پر سبزہ دیکھکر کہتا ہے کہ اے کنارۂ جوئبار چمن تو جو اس قدر سرسبز و شاداب ہے تو کس کی جگہ ہے - کیونکہ وہاں معشوق کو نہیں پایا اسلیے لبطور شگون نیک کے اول یادش بخیر کہکر پھر سوال کرتا ہے۔
نشنیدہ لذت تو فرو می رود بدل (تصوف) اے حرف محو! لعل شکر خائے کیستی
از ہیچ نقش غیر نکوئی ندیدہٗ اے دیدہ محوِ چہرۂ زیبائے کیستی
با ہیچ کافر ایں ہمہ سختی نہ می رود اے شب بمرگِ من کہ تو فردائے کیستی
بمرگ من - یعنی اے شب تجھکو میری موت کی قسم - چونکہ اُس وقت اپنی موت سے زیادہ کسی چیز کو عزیز نہیں سمجھتا اسلیے رات کو اپنی موت کی قسم دیکر پوچھتا ہے کہ تو کس کی فردائے قیامت ہے؟ یعنی جو سختی کہ تجھ میں میرے اوپر گزری ہے کسی کافر کے ساتھ نہ گزرتی ہوگی - پھر تو کافر سے بھی بڑھکر کون سے گنہگار کی قیامت کا دن ہے، بتا تو سہی؟
(غزل مسلسل عاشقانہ)
ایکہ گفتم نہی دادِ دل - آرے نہی تا چو من دل بغان شیوہ نگارے نہی
چشمۂ نوش ہمانا نہ تراد و زدے کش نگیری و در اندیشہ فشارے نہی
کہتا ہے کہ اُس دل سے یقیناً چشمۂ نوش نہیں جھک سکتا جسکو کہ تو بھینچکر تصور

میں فشار نہ دیوے۔ یعنی جب تک کہ دل عشق مجازی کے صدمے نہیں جھیلتا اور طرح طرح کی کوفت اس میں نہیں اٹھاتا اس میں صفائی اور لطافت اور گھلاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔

ماہ و خورشید دریں دائرہ بیکار نیند | تو کہ باشی؟ کہ بجز زحمتِ کارے ندہی

اور وہ کام یہی ہے کہ عشق کے شکنجے میں دل کو فشار دیا جائے۔

سر براہ دم شمشیر جوانی نہ نہی | تن بہ بندِ غم فتراک سوارے ندہی

خوں بذوقِ غم یزداں نشناسی نخوری | دیں بمہرِ حقِ الفت نگذارے ندہی

یزداں نشناس اور حق الفت نگذار، دونوں مرکب صفتیں ہیں۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

آخر کار نہ پیداست؟ کہ در تن فسرد | کف خوے کہ بداں زینتِ دارے ندہی

فسرد فسردن کا مضارع ہے۔ فسردن ٹھٹھر جانا خشک ہو جانا۔ یعنی کیا یہ بات ظاہر نہیں ہے؟ کہ وہ خون جس سے تو کسی صلیب کو رنگین نہ کریگا مرنے کے بعد بدن میں خشک ہوکر رہ جائیگا۔

حیف گر تن بسگانِ سرِ کوے نہ رسد | واے گر جاں بسرِ راہ گذارے ندہی

رہزنانِ اجل از دستِ تو ناگاہ برند | نقد ہوشے کہ بسوداے بہارے ندہی

بخمِ طرۂ حورانِ بہشت آویزند | نازپروردہ دلے راکہ بیارے ندہی

گر تنزل نہ بود۔ ابرِ بہاری غالب | کہ دُر افشانی و زافشاندہ شمارے ندہی

یعنی اگر اس کہنے میں تیری کسرِ شان نہ ہو تو اے غالب تیری مثال ابر بہاری کی سی ہے کہ موتی برساتا ہے اور انکی گنتی نہیں بتاتا یعنی بیشمار موتی برساتا ہے۔

دریا زحباب آبلہ پاے طلب تست (تصوف) | نورِ نظراے گوہرِ نایاب کجائی

شوریست نواریزیِ تارِ نفسم را | پیدا نہ اے جنبشِ مضراب کجائی

یعنی میرے تارِ نفس سے نغمے نکل رہے ہیں اُنھوں نے ایک شور برپا کر رکھا ہے، مگر آہ جنبشِ مضراب کہ جس سے یہ تار بج رہا ہے تو کہاں ہے؟ تیرا کہیں پتا نہیں۔

بنمائے بہ گوسالہ پرستاں ید بیضا (فخریہ) غالب بہ سخن صاحبِ فرتاب کجائی

فرتاب کرامت اور معجزے کو کہتے ہیں۔ گوسالہ پرستوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو ناقص العیار شاعروں کو مانتے ہیں۔

دیدہ ور۔ آنکہ تا نہد دل بہ شمارِ دلبری (تصوف) در دلِ سنگ بنگر د رقصِ بتانِ آزری

دیدہ ور یعنی صاحبِ نظر وہ شخص ہے کہ جب اسکو یہ خیال پیدا ہو کہ دنیا میں کون سی چیزیں دلکش و دلربا ہیں تو وہ انگھڑ پتھر کے اندر بتانِ آزری کو رقص کرتے ہوئے دیکھے یعنی مادّے میں جو قابلیت اور استعداد خدا نے ودیعت کی ہے وہ پہلے اس سے کہ قوت سے فعل میں آئے اس پر ظاہر ہو جائے۔

لے کہ تو ہیچ ذرہ را جز بہ رہِ تو روی نیست (تصوف) در طلب تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

یہ خطاب ہے جنابِ احدیت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جس ذرے کو دیکھیے اسکا منہ تیرے ہی رستے کی طرف پھرا ہوا ہے اور اسلیے تیری راہِ طلب میں خود بادیہ یعنی صحرا کو اپنا رہبر بنایا جا سکتا ہے کیونکہ اُسکا ہر ذرہ تیری ہی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

ہر کہ دلست در برش داغ تو رویدش ز دل (تصوف) تا چو بدیگرے دہد۔ باز بری بداوری

کہتا ہے کہ جسکے پہلو میں دل ہے اسکے دل سے تیرا داغ روئیدگی کی طرح اُگتا ہے، اور یہ اسلیے کہ اگر وہ دل کسی اور سے لگائے تو اس حجت سے کہ تیری نشانی اس پر موجود ہے۔ وہاں سے اپنی چیز یعنی دل واپس لے لے۔ داوری ۔ جھگڑا۔ ٹنٹا۔ اور حجت۔

رشکِ ملک چسود چرا؟ چوں بتو رہ نمی برد (تصوف) بیہدہ در ہوائے تو می پرد از سبکسری

یعنی ہم ملائکہ پر کیوں رشک کریں جبکہ وہ بھی بیفائدہ تیری تلاش میں پرواز

کرتے پھرتے ہیں اور تجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔

حیف کہ من بخوں تپم۔ وزتو سخن رود کہ تو (التعون) اشک بدیدہ بشمری، نالہ بسینہ بنگری

یعنی افسوس کہ میں تو خون میں پڑا ہوا لوٹوں اور تیری نسبت یہ کہا جائے کہ تو آنسو آنکھ کے اندر گن لیتا ہے اور فریاد کو سینے کے اندر دیکھ لیتا ہے۔

کوثر اگر بمن رسد خاک خورم زبے نمی (زارنالی) طوبیٰ اگر زمن شود ہیمہ کشم زبے بری

یعنی میری شومی بخت کا یہ حال ہے کہ اگر کوثر مجھے ملجائے تو اس میں نمی باقی نہ رہے اور مجھے اُس سے خاک کے سوا کچھ حاصل نہ ہو اور اگر طوبیٰ میری ملک ہوجائے تو وہ ایسا بے بر ہوجائے کہ اُسکی لکڑی ایندھن کے کام آئے۔

بینیم از گداز دل در جگر آتشے چو سیل (حالت فکر شعر) غالب اگر دم سخن رہ بضمیر من بری

کہتا ہے کہ اگر فکر شعر کے وقت تو میری حالت درونی کو ٹٹولے تو دل کے گداز سے آگ کی رَو بہتی ہوئی تجھکو نظر آئے۔ یہ اُس جوش اور اس آگ کا بیان ہے جو اصلی شاعروں کے دل میں شعر کہتے وقت بھڑکتی رہتی ہے۔

مرزا کی غزلیات جو مقدار میں چار ہزار بیت سے کچھ زیادہ ہیں، اور جن میں منتخب اور برگزیدہ اشعار ایک چوتھائی سے کم نہ ہونگے۔ ان میں سے کسی قدر اشعار۔ جو سرسری نظر میں صاف اور عمدہ ہوئے بطور نمونے کے یہاں نقل کردیے گئے ہیں تاکہ جو لوگ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں مگر اتنا دماغ نہیں رکھتے کہ مرزا کے کلام کو اوّل سے آخر تک بنظر غور دیکھیں۔ وہ مرزا کی غزل کا نمونہ دیکھکر اس بات کا اندازہ کرسکیں کہ مرزا کی غزل شعراے ایران کے کون سے طبقے کی غزل سے مناسبت رکھتی ہے؟ اور انکی اور مرزا کی غزل میں کیا نسبت پائی جاتی ہے؟ اگرچہ مقتضاے مقام یہ تھا کہ اُس موقع پر مرزا کی چند غزلوں کا موازنہ اُن سب لوگوں کی غزل کے ساتھ کیا جاتا جن کی غزل پر مرزا نے

اپنی غزل بلکہ اپنی تمام شاعری کی بنیاد رکھی ہے، یعنی نظیری، عرفی، ظہوری، طالب، اسیر وغیرہ مگر چونکہ اس مختصر میں زیادہ گنجایش نہیں، اور نیز عام طبائع کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دلبستگی بھی نہیں معلوم ہوتی۔ اسلیے یہاں مرزا کی صرف دو غزلوں کا مقابلہ نظیری اور ظہوری کی غزلوں سے۔ کہ اسوقت ان دونوں کے دیوان ہمارے پاس موجود ہیں۔ کیا جاتا ہے۔

نظیری کی جو مشہور غزل پاخفتست اور بلاخفتست ہے مرزا صاحب نے بھی اس پر غزل لکھی ہے۔ نظیری کی غزل نو بیت کی ہے جس میں سے ایک شعر پڑھا نہیں گیا۔ اور مرزا کی غزل بارہ بیت کی ہے اسلیے مرزا کی غزل میں سے بھی اول صرف آٹھ بیتیں لیجائینگی تاکہ ٹھیک ٹھیک موازنہ ہو سکے اور بعد موازنے کے باقی اشعار بھی نقل کر دیے جاوینگے۔

غالب	نظیری
بوادیے کہ دراں خضر را عصا خفتست	نظر بظاہر و مہیا دو رخفا خفتست
بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتست	اجل رسیدہ چہ داند بلا کجا خفتست

نظیری نے اس بات کو کہ عشق ایسے طور پر دفعتہً پیدا ہو جاتا ہے جسکا شان گمان تک نہیں ہوتا ایک معمولی حالت کے پیرائے میں۔ جو ہمیشہ صید اور صیاد کے باہم گذرتی رہتی ہے۔ بیان کیا ہے نظیری کا بیان۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ بہت صاف اور نیچرل ہے اور گویہ مطلع اُسکے اعلیٰ درجے کے اشعار میں محسوب نہیں ہو سکتا۔ لیکن مرزا کے مطلع سے بہرحال بہتر ہے۔ مرزا نے گویا اپنی ناگوار زندگی کا دشوار گزار مرحلہ خوشی خوشی طے کرنے کو اس تمثیل میں بیان کیا ہے کہ جس خطرناک وادی میں حضرت خضر بھی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں میں وہاں سینے کے بل چلتا ہوں۔ مرزا کے اس مطلع پر انکی زندگی میں "عصا خفتست"

کے لفظ پر اعتراض ہوا تھا، مرزا نے جواب دیا کہ سعدی نے بھی تو کہا ہے:۔

"دُلے بجملۂ اول عصا ے پیر بخفت"

مگر اس جواب کو لوگوں نے تسلیم نہیں کیا، کیونکہ شیخ کے ہاں اس قدر قرائن موجود ہیں کہ "عصا خفتن" سے جو معنی اُس نے لبطور استعارے کے مراد رکھے ہیں ان کے سوا دوسرے معنی کی طرف خیال ہی نہیں جاتا۔ بخلاف مرزا کے شعر کے کہ جب تک یہ نہ جتایا جائے کہ سعدی نے عصا خفتن کے یہ معنی لیے ہیں۔ تب تک اُس سے یہ معنی مفہوم نہیں ہو سکتے۔

نظیری	غالب
کجا ز عشوۂ آں چشم نیم باز رہیم	وگر ز ایمنی راہ و قرب کعبہ چہ حظ
کہ فتنہ خاستہ از خواب و پاے ما خفتست	مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست

نظیری معشوق کی اس حالت کو۔ جبکہ وہ سوتے سے اُٹھا ہو اور آنکھیں کچھ کھلی اور کچھ مندی ہوں اور اپنا جی اسکے سامنے سے پرے ہٹنے کو چاہتا نہ ہو۔ اس طرح ادا کرتا ہے کہ فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا ہے، اور ہمارا پانوں سو گیا ہے پس اُس کی چشم نیم باز کے عشوے سے کیونکر رہائی ہوگی۔

مرزا مسافر کی اُس حسرت ناک حالت کو جبکہ راہ بخطر اور منزل مقصود قریب ہو مگر نہ مسافر میں نہ اسکی سواری میں آگے قدم اُٹھانے کی طاقت ہو۔ اس طرح بیان کرتے ہیں "وگر ز ایمنی راہ الخ۔ ان دونوں شعروں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر مطلقاً ترجیح نہیں دیجا سکتی جو عاشقانہ مضامین کو پسند کرتے ہیں وہ ضرور نظیری کے شعر کو پسند کرینگے مگر اس لحاظ سے کہ مرزا کا بیان عاشق اور غیر عاشق سب کے حالات پر حاوی ہے اور ہر شخص جس پر ایسی حالت گزرے اسکا مصداق ہو سکتا ہے یقیناً نظیری کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے

غالب	نظیری
غمت بشہر شبیخوں زناں بہ بنگہ خلق	کسی بہ قلب شبم ترکتا زمی آرد
عسس بخانہ وشہ در حرم سرا خفتست	کہ بر فراش قصب پاے در حنا خفتست

نظیری کا شعر محض عاشقانہ ہے اور اس لحاظ سے کہ یہ مضمون اوّل اسکو سوجھا ہے مرزا کے شعر پر ترجیح دینے کے قابل ہے کہتا ہے کہ میرے گھر پر آدھی رات گئے وہ شخص آکر ڈاکا ڈالتا ہے جو ریشمی بچھونوں میں پانوں کو مہندی لگائے پڑا سوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اسکا تصور اور اُسکا خیال بغیر اسکے کہ اسکو اطلاع ہو رات کو آکر چھاتی پر سوار ہو جاتا ہے اور راحت و آرام بالکل برباد کر دیتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ تیرا غم شہر میں لوگوں کے گھروں پر شبخوں مار رہا ہے اور کوتوال اپنے گھر میں اور بادشاہ محلسرا میں چین سے پڑے سوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مرزا کے دل میں یہ خیال نظیری کے شعر سے پیدا ہوا ہے مگر مرزا کی غیر معمولی اُپج اور بلند پروازی کے ثبوت کے لیے صرف یہی اقتباس کافی ہے کہ تھوڑے سے تصرف سے نظیری کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ نیز مرزا کے بیان میں حقیقت و مجاز دونوں پہلو موجود ہیں اور نظیری کا بیان صرف مجازی معنی میں محدود ہے۔

غالب	نظیری
ببیں ز دور و مجو قرب شہ کہ منظر را	شمیم مہر ز باغ وفا نمی آید
دریچہ باز و بدر وازہ اژدہا خفتست	بہر چمن کہ تو بشگفتہ، صبا خفتست

اگرچہ مآل دونوں شعروں کا واحد ہے، مگر دونوں کے بیان کا عالم الگ الگ ہے۔ نظیری اس طرح بیان کرتا ہے کہ وفاے حقیقی کے باغ سے مہر و التفات کی خوشبو نہیں آتی گویا جس چمن میں وہ پھول (یعنی معشوق حقیقی) کھلا ہوا ہے وہاں

کی صبا پڑی سوتی ہے ۔یعنی اُسکو اہتزاز مطلق نہیں ہے ۔جس سے اُس چمن کی خوشبو عالم میں پھیلے۔

مرزا یوں کہتے ہیں کہ آثار و افعال کے ذریعے سے اُسکو دور ہی سے دیکھ لو، اور قرب شاہ۔یعنی ذات بحت کی تلاش مت کرو، کیونکہ اگرچہ جھروکے کے پٹ کھلے ہوے ہیں (یعنی اسکے آثار و افعال سب پر ظاہر ہیں) مگر اندر کوئی نہیں جانے پاتا، کیونکہ عین دروازے پر اژدہا سوتا ہے۔اس تقریر سے ظاہر ہے کہ مآل دونوں کا یہ ہے کہ معرفتِ ذات محالات سے ہے۔مگر ہمارے نزدیک مرزا کا بیان نظیری کے بیان سے زیادہ بلیغ اور زیادہ دلکش واقع ہوا ہے۔

غالب	نظیری
بصبح حشر چنیں خستہ روسیہ خیزد	طبیب عشق ببرد طمع زبیمارے
کہ در شکایتِ درد و غم دوا خفتست	کہ شب براحت ازیں درد بے دوا خفتست

نظیری کہتا ہے کہ مرض عشق کا طبیب اس بیمار کے علاج سے مایوس ہو جاتا ہے جو کسی رات کو اس درد بے دوا یعنی عشق کی بےچینی سے آرام کے ساتھ سو گیا ہو، گویا مریض عشق کی علامت محمود یہی ہے کہ اسکو کبھی راحت نصیب نہ ہو۔مگر شعرائے متصوفین کے اصول کے موافق نظیری کے بیان میں یہ خلل تھا کہ وہ راحت کو ردی علامت بتاتا ہے، حالانکہ عاشق صادق کی علامت یہی ہے کہ اُسکو دوست کی راہ میں درد اور تکلیف کبھی محسوس ہی نہ ہو بلکہ ہر ایک درد اور تکلیف عین راحت معلوم ہو۔پس نظیری کے بیان سے گویا یہ لازم آتا تھا کہ عاشق صادق وہی ہے جو ہمیشہ بےچینی اور بیقراری میں بسر کرے، اور جب ایسا ہوگا تو کبھی نہ کبھی شکایت بھی اسکی زبان سے نکلے گی۔مرزا نے اسی لیے اس مضمون کو الٹ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ بیمار حشر کے دن روسیاہ

اُٹھے جو درد دل کی شکایت اور دوا کی تلاش کرتا ہوا سویا ہے۔

نظیری	غالب
کس از معانقۂ روز وصل باید ذوق	درازیِ شب و بیداریِ من اینہمہ نیست
کہ چند شب زہم آغوش خود جدا خفتست	زبختِ من خبر آرید تا کجا خفتست

نظیری کا شعر صاف ہے۔ کس: آں کس کی جگہ لایا ہے۔ معانقۂ روز وصل۔ وہ معانقہ جو وصل کے دن عاشق و معشوق میں واقع ہو شعر کا مضمون معمولی ہے، مگر الفاظ نے جان ڈالدی ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ شب ہجر کی درازی اور میری بیداری کا کیا خیال کرتے ہو، یہ تو کچھ بھی بات نہیں ہے ہاں یہ تلاش کرو کہ میرا النصیب کہاں پڑا سوتا ہے؟ کیونکہ رات کی درازی، اور میری بیداری اور ایسی ایسی اور سیکڑوں مصیبتیں سب اُسی کے سو جانے سے پیدا ہوئی ہیں۔ محاکمہ دونوں میں یہ ہے کہ نظیری کا شعر زیادہ نیچرل اور حالی ہے۔ اور مرزا کے شعر میں شاعرانہ لطافت اور خوبی نظیری کے شعر سے زیادہ ہے اور کوئی بات اُس میں اَن نیچرل بھی نہیں ہے۔

نظیری	غالب
شب امید بہ از روزِ عید می گزرد	بدیں نیاز کہ باتست نازمی رسدم
کہ آشنا بہ تمنائے آشنا خفتست	گدا بہ سایۂ دیوارِ پادشا خفتست

نظیری کا شعر اُسکی تمام غزل میں بیت الغزل ہے بلکہ اسکے سارے دیوان کے اُن ۲۔ نشتروں میں سے ایک نشتر ہے جو اساتذہ نے اُسکی غزلیات میں سے انتخاب کیے ہیں۔

مرزا کا شعر گو نظیری کے شعر کی برابری نہیں کرسکتا۔ مگر ایسے بلند شعر پر یہ شعر نکالنا مرزا ہی کا کام تھا۔ تشبیہ نہایت بلیغ اور دلنشیں واقع ہوئی ہے۔

یعنی مجھ جیسے ادنیٰ درجے کے آدمی کو جو تیرے جناب میں نیاز ہے اُس پر مجھکو ایسا ہی ناز ہے جیسا اُس فقیر کو ہونا چاہیے جو بادشاہی محل کی دیوار کے سائے میں پڑا ہو۔

غالب	نظیری
بخواب چوں خودم آسودہ دل بداں غالبؔ	فسانہ صرفِ نظیری مکن کہ خواب کند
کہ خستہ غرق بخوں خفتہ است تا خفتست	شکستۂ کہ بعد درد مبتلا خفتست

نظیری کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ نظیری کو فسانہ اس غرض سے سُنانا فضول ہے کہ ایک شکستہ و کوفتہ آدمی (نظیری) جو طرح طرح کی تکلیف میں مبتلا ہوکر پڑ رہا ہے۔ وہ سو رہیگا۔

مرزا کے شعر کا ماحصل یہ ہے کہ اگر میں سو بھی جاؤں تو اے غالب! مجھکو اپنی طرح آسودہ اور خوشحال نہ سمجھنا، کیونکہ بیمار (یعنی میں) جب سویا ہوں تو خون میں ڈوبا ہوا سویا ہوں۔ پس ایسے شخص کو جاگتے یا سوتے کیا راحت نصیب ہو سکتی ہو۔

یہاں تک دونوں غزلوں میں سے صرف آٹھ آٹھ شعر ہم نے نقل کیے ہیں اور مرزا کے آٹھ شعر وہ لکھے ہیں جو کسی نہ کسی قدر نظیری کے اشعار سے لفظی یا معنوی مناسبت رکھتے تھے۔ اب مرزا کے باقی اشعار جو نظیری کی غزل سے تعداد میں زیادہ ہیں لکھتے ہیں۔

خروشِ حلقۂ رنداں ز نازنین پسریست	کہ سر بہ زانوے زاہد بہ بوریا خفتست
ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز	گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتست
دلم بسبحہ و سجادہ و ردا لرزد	کہ دزد مرحلہ بیدار و پارسا خفتست
براہ خفتنِ من ہر کہ بنگرد داند	کہ میر قافلہ در کارواں سرا خفتست

پہلا شعر محض رندانہ ہے، اور زبان کی گرمی اور شوخی کے سوا اور کوئی معنوی

لطافت نہیں رکھتا اسکے بعد کے تینوں شعر ہم لے کی ردیف کے انتخابی اشعار میں مع ہر ایک کی شرح کے لکھ آئے ہیں ان میں سے پہلا شعر ہمارے نزدیک مرزا کی تمام غزل میں بیت الغزل ہے اور پچھلے دونوں شعر بھی نظیری کی غزل کے عام اشعار سے کسی طرح رتبے میں کم نہیں ہیں۔ پس اگر نظیری کا بہت ادب کیا جائے تو ہم اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے کہ دونوں غزلوں کو مساوی درجے میں رکھیں ورنہ انصاف یہی ہے کہ ہیأت مجموعی کے لحاظ سے مرزا کی غزل نظیری کی غزل سے یقیناً بڑھ گئی ہے۔ لیکن ایک آدھ غزل میں نظیری سے سبقت لے جانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کی غزل کو مطلقاً نظیری کی غزل پر ترجیح دی جائے نظیری وہ شخص ہے جسکی نسبت مرزا صائب کہتے ہیں

صائب چہ مجال ست شوی ہمچو نظیری   عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را"

اور مرزا جلال اسیر کہتے ہیں۔

ہمچشمیِ نظیری حد بشر نباشد

اور شیخ ابوالفضل آئین اکبری میں اُسکی نسبت لکھتے ہیں

درے از نزہتگاہِ معنی بروے کشودہ اند

بس ہماری غرض مذکورۂ بالا غزلوں کے مقابلہ کرنے سے صرف اس قدر تھی کہ مرزا نے غزل میں نظیری کے تتبع کو جس درجے تک پہنچایا تھا اُس سے لوگ اچھی طرح مطلع ہو جائیں۔ ورنہ اس غزل کے سوا اور جس قدر غزلیں مرزا نے نظیری کی غزلوں پر لکھی ہیں اُن میں شاید ہی کوئی غزل ایسی ہوگی جس میں نظیری کی غزل کا پلہ مرزا کی غزل سے غالب نہ ہو کیونکہ اکثر پچھلے شعرا اگلوں کی انھیں غزلوں پر طبع آزمائی کرتے ہیں جو ان کے سارے دیوان میں چیدہ و برگزیدہ اور منتخب ہوتی ہیں۔ پس ایسی زمینوں میں اگلوں سے

پچھلوں کا سبقت لیجانا کچھ معنی کھسل نہیں ہے۔

اب ہم مرزا کی ایک غزل کا موازنہ ظہوری کی غزل کے ساتھ کرتے ہیں کہ یہ دونوں غزلیں شیخ سعدی کی غزل پر لکھی گئی ہیں۔

شب فراق چہ داند کہ تا سحر چنداست — مگر کسیکہ بہ زندان عشق دربندست

اگرچہ مرزا نے ظہوری کی غزلوں پر بہت کم غزلیں لکھی ہیں۔ مگر چونکہ وہ اپنے تئیں ظہوری کا متتبع ظاہر کرتے ہیں اسلئے اُسکی ایک غزل کے ساتھ بھی مرزا کی غزل کا موازنہ کرنا ضرور تھا۔ ظہوری کا دیوان جو ہمارے پاس موجود ہے اُس میں یا تو کاتبوں کی تصحیف ہے، اور یا خود ظہوری کی پیچیدہ بیانی کے سبب۔ اکثر اشعار کے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ بہت مشکل سے صرف ایک غزل ایسی نکلی ہے جس کے ہر ایک شعر کے کچھ نہ کچھ معنی اپنی سمجھ کے موافق لگا لیے گئے ہیں اور اسکے تمام اشعار کا مقابلہ بعض اصحاب کی معرفت دوسرے صحیح نسخے سے بھی کر لیا گیا ہے۔ اس لیے وہی غزل موازنہ کے لیے انتخاب کی گئی ہے اور چونکہ وہ شیخ کی غزل پر لکھی گئی ہے اس واسطے یہ خیال کیا گیا ہے کہ ظہوری نے اس میں اپنی پوری طاقت صرف کی ہوگی۔ اور ایک وجہ اس غزل کی تخصیص کی یہ ہے کہ مرزا نے اپنی تمام غزل ایک شعر کے سوا تمام اشعار میں وہی قافیے باندھے ہیں جو ظہوری کے ہاں بندھے ہوئے تھے۔ اور نیز دونوں غزلیں ابیات کی تعداد کے لحاظ سے بھی برابر یعنی دس دس بیت کی ہیں۔

ظہوری	غالب
بعشق قابل دیوانگی خردمندست	چو صبح من زسیاہی بشام مانندست
ببر زجملہ کہ آزاد۔ مرد ایں بندست	چگوئیم کہ زشب چند رفت یا چندست

ظہوری کہتا ہے کہ عشق میں جو شخص دیوانگی کی قابلیت رکھتا ہے اسی کو خردمند

سمجھنا چاہیے۔ پس چاہیے کہ تو سب سے قطع تعلق کر دے، کیونکہ جو شخص تعلقات سے آزاد ہے وہی بند عشق کا مرد (یعنی اسکے لائق) ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ جبکہ میری صبح تاریکی کے سبب شام سے مشابہ ہے تو مجھ سے یہ کیا پوچھتے ہو رات کتنی گذری یا کتنی باقی ہے؟ مطلب یہ ہے کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک میرے دن اور رات پر تاریکی چھائی رہتی ہے، پس مجھے کیا خبر ہے کہ کتنی رات گذری اور کتنی باقی ہے۔ ظہوری کے شعر میں اسکے سوا کچھ جدت نہیں ہے کہ اُس نے اپنی عادت کے موافق اس میں بھی صنعتِ تضاد کا التزام کیا ہے (یعنی دیوانگی پر خردمندی کا اطلاق کیا ہے اور آزاد پر مقید کا) مرزا نے ایک معمولی خیال میں جدت پیدا کی ہے اور نہایت صفائی سے مطلب ادا کیا ہے۔

غالب	ظہوری
نگاہ مہر بہ دل سر نداده چشمۂ نوش	بشکر دیدۂ تر ترزبا نیٔ دارم
ہنوز عیش باندازۂ شکر خند ست	کہ زہر گریہ طراوت دہ شکر خند ست

ظہوری کہتا ہے کہ میں دیدۂ تر کے شکر میں ترزبان اور رطب اللسان ہوں، کیونکہ گریے کا زہر معشوق کے شکر خند کو طراوت دیتا ہے (یعنی ہمارے رونے پر اُسکو بے اختیار ہنسی آتی ہے) گویا ہمارے آنسو خندۂ معشوق کی جڑ کو تر و تازہ رکھتے ہیں۔ مرزا کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق گو بظاہر ہم سے ہنسی خوشی کے ساتھ ملتا ہے مگر کوئی دلی محبت کی بات ابتک ظہور میں نہیں آئی جس سے ہمارا دل باغ باغ ہو جائے۔ اس مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے کہ ابھی تک اسکی نگاہِ مہر و محبت نے لذت و حلاوت کی سُوت ہمارے دل میں جاری نہیں کی بلکہ ہم صرف اسکے ظاہری شکر خند پر فریفتہ ہو رہے ہیں۔

ظہوری کے ہاں وہی لفظی مناسبتیں جیسے دیدۂ تر اور ترزبانی یا زہر گریہ

اور شکر خند بہ نسبت مرزا کے زیادہ ہیں مگر مرزا کا شعر اُس سے زیادہ بلیغ نیچرل اور عاشقانہ ہے۔

غالب	ظہوری
نہ گفتۂ کہ بہ تلخی بساز پند پذیر	مگر کہ رخصت بے طاقتی شود مرہم
برو۔ کہ بادۂ ما تلخ تر از ین پند ست	کہ گوش دل شدگاں ریش گشتہ پند ست

ظہوری کہتا ہے کہ دل شدگاں (یعنی ہم عاشقوں) کے کان ناصح کی نصیحتوں سے زخمی ہو گئے انکے اس زخم کا مرہم یہی ہو سکتا ہے کہ انکو بے طاقتی (یعنی بے حوصلگی اور عدم تحمل) کی اجازت دیجائے۔ تاکہ وہ ناصح سے گلنپ ہو کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔

مرزا ناصح سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے ناصح! تو نے یہی نہیں کیا؟ کہ تلخی (یعنی ہماری نصیحت) سے موافقت کرلے، اور ہمارا کہنا مان لے۔ جا اپنا رستہ لے، ہماری شراب اس نصیحت سے تازہ تلخ ہے، پس ہمکو تیری نصیحت کی تلخی سے آشتی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ قافیہ بھی جیسا کہ ظاہر ہے مرزا کے ہاں بہ نسبت ظہوری کے زیادہ گرم بندھا ہے۔

غالب	ظہوری
دراز دستی من چاکی ار فگند۔ چہ عیب!	چہ غم کہ عہد گسل داروت کشاکش را
زبیش۔ دلق ورع با ہزار پیوند ست	کہ ہر گسیختنی صد ہزار پیوند ست

ظہوری کہتا ہے کہ اگر ناز و غمزے کی کشاکش تجھ سے عہد شکنی کرا لی رہتی ہے تو کچھ افسوس کی بات نہیں، کیونکہ ہر گسیختنی (یعنی ہر عہد شکنی) لاکھ پیوند کا حکم رکھتی ہے۔ مطلب یہ کہ جس قدر تو عہد توڑتا ہے اسی قدر پیوند عشق زیادہ مستحکم ہوتا جاتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ اگر میری درازدستی اور بیباکی و رندمشربی نے دلق ورع وتقویٰ کو کسی قدر پھاڑ ڈالا ہے تو میرا چنداں قصور نہیں ہے کیونکہ اس میں تو پہلے ہی سے ہزاروں پیوند لگے چلے آتے ہیں۔ یعنی خود اہل ورع وتقویٰ ہی اسکی دھجیاں اڑا چکے ہیں، مگر ریاکاری سے پیوند لگا لگا کر اُسکا عیب ڈھانکتے رہتے ہیں۔ ظہوری کے شعر میں عشق ومحبت کے ایک ایک دقیق معاملے کی طرف اشارہ ہے۔ جو عشاق پر ہمیشہ گذرتا ہے۔ اور صنعت تضاد کا التزام بھی نہیں چھوڑا گسیختن پر اسکے ضد حقیقی یعنی پیوند کا اطلاق کیا ہے۔ باوجودیکہ ظہوری کے یہاں یہ قافیہ نہایت عمدگی سے بندھا تھا۔ مرزا نے بھی اس قافیے کے باندھنے میں کچھ کم داد بلاغت نہیں دی، یہاں تک کہ ظہوری کے شعر کو مشکل سے اُس پر ترجیح دیجا سکتی ہے۔

غالب	ظہوری
زبیم آنکہ مبادا بمیرم از شادی	بگو حدیثِ وفا از تو باور ست بگو
نہ گوید ارچہ بمرگ من آرزومندست	شوم فدای دروغی کہ راست مانندست

مرزا نے مانند کا قافیہ مطلع کے سوا پھر کسی شعر میں نہیں باندھا۔ اور ظہوری کے یہاں آرزومند کا قافیہ کہیں بھی نہیں بندھا۔ اسلیے یہ دونوں مختلف القوافی بیتیں ایک جگہ لکھدی گئی ہیں۔ معنی دونوں کے ظاہر ہیں۔ ظہوری کا شعر بہت صاف اور لطیف اور مرزا کے شعر سے زیادہ نیچرل ہے۔ مرزا نے مضمون میں جدت تو پیدا کی ہے مگر۔ یہ سنکر کہ معشوق ہمارے مرنے کا آرزومند ہے خوشی سے مرجانا۔ واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔

غالب	ظہوری
وجود او ہمہ حسن ست و ہستیم ہمہ عشق	زاہل مہر ومحبت نشاں ندارم کس

به مہر خویش و به بیمہری تو سوگند ست　　به بخت دشمن و اقبال دوست سوگند ست

ظہوری کا شعر صاف ہے ۔ اوّل دعویٰ کرتا ہے کہ مہر و محبت کا دنیا میں کہیں وجود نہیں ، اور اس دعوے پر اپنی محبت اور معشوق کی بیمہری کی قسم کھاتا ہے جسکی خوبی اور لطافت ظاہر ہے ۔

مرزا کا دعویٰ یہ ہے کہ معشوق کا وجود سراپا حسن و جمال ہے ، اور میری ہستی سراسر عشق و محبت ہے ۔ اور اس دعوے پر رقیب کے نصیب کی اور معشوق کے اقبال کی قسم کھاتا ہے ۔ جس میں ظہوری کی قسم سے زیادہ لطافت اور نزاکت پائی جاتی ہے ۔ رقیب کے نصیب کی قسم اسلیے کھائی ہے کہ جو وجود سراپا حسن و جمال ہے وہ بالکل اُسی کے حصے میں آگیا ہے ۔ اور معشوق کے اقبال کی قسم اسلیے کھائی ہے کہ مجھ جیسا شخص اسکے سودا میں عشق و محبت کا پتلا بن گیا ہے اسکے سوا لفظی مناسبتیں ۔ جیسے حسن و عشق ، وجود و ہستی ، دشمن و دوست اور بخت و اقبال یا تمام شعر کا تناسب اجزا میں تقسیم ہونا ۔ اس نے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے ۔

ظہوری　　　　غالب

ز رہروانِ تو منزل شمار را کہ شمرد　　شمار کجروی دوست در نظر دارم
غم از کسے کہ نمید اند اندہش چند ست　　دریں نورد ندانم کہ آسماں چند ست

ظہوری کہتا ہے کہ تیری راہ میں جو شخص ۔ منزلیں گنتا ہے اور یہ خیال رکھتا ہے کہ کتنا رستہ طے ہوا اور کتنا باقی ہے ۔ اسکو تیرے رہرووں میں کون شمار کرتا ہے ؟ پھر کہتا ہے کہ "غم از کسے ست" یعنی غم معشوق اس شخص کا حصہ ہے جسکو اپنے غم کی کمی یا زیادتی کا مطلق شعور نہیں ۔

مرزا کہتے ہیں کہ میرے خیال میں دوست کی کجروی کا تصور ایسا جما ہوا ہے کہ

مجھے یہ خبر نہیں کہ اس نورد (یعنی کجروی) میں آسمان کس قدر شریک ہے۔ مرزا کا بیان کسی قدر ظہوری کے بیان سے صاف ہے مگر مضمون کے لحاظ سے دونوں شعروں میں کچھ لطافت یا خوبی معلوم نہیں ہوتی۔

ظہوری	غالب
شود گسستہ بایام گرچہ زنجیر ست	بہ رنج از پئے راحت نگاہداشتہ اند
اسیر آنکہ بہ تار نگاہ در بند ست	ز حکمت است کہ پای شکستہ در بند ست

ظہوری کہتا ہے کہ ایک مدت کے بعد لوہے کی بیڑی بھی کٹ جاتی ہے اور قیدی رہا ہو جاتا ہے پس درحقیقت قیدی وہی ہے جو نگاہِ معشوق میں الجھا ہوا ہے۔ جسکو قید سے کبھی رہائی نہیں۔

مرزا کہتے ہیں کہ یہاں تکلیف میں اسلیے رکھا جاتا ہے کہ راحت حاصل ہو۔ اور اسکی مثال یہ ہے کہ پاشکستہ آدمی کو چلنے پھرنے نہیں دیتے اور جب تک ہڈی جڑ نہ جائے مقید رکھتے ہیں۔ اس سے مطلب یہی ہوتا ہے کہ آخرکار اُسکو راحت حاصل ہو۔ ظہوری کے شعر میں کسی قدر جدت ہے مگر شعر کی بندش سست اور ڈھیلی ہے۔ مرزا کے یہاں مضمون میں کچھ ایسی جدت نہیں ہے مگر بیان نہایت چست اور ٹھیک ٹھاک ہے۔

ظہوری	غالب
ز بندگان نسزد آرزو۔ خدا نہ کند	اگر نہ بہر من۔ از بہر خود عزیزم دار
ہمیں بس ست کہ ما بندہ او خداوند ست	کہ بندہ۔ خوبی او خوبی خداوند ست

ظہوری کے شعر میں "خدا نہ کند" یا تو محض حشو ہے، اور اسکے بعد کچھ عبارت مقدر ہے یعنی "خدا نہ کند کو ما آرزو بکنیم" باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔ مرزا کا شعر ان کی غزل میں بیت الغزل ہے اور معنی اور لفظاً دونوں

طرح ظہوری کے شعر پر ترجیح رکھتا ہے۔

ظہوری	غالب
اسیر عشق ظہوری نشانہ دارد	نہ آں بود کہ وفا خواہد از جہاں غالب
نشانہ اینکہ بہ بیداد دوست خرسند ست	بدیں کہ پرسد و گویند ہست خرسند ست

ظہوری کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اسیر عشق کی یہ پہچان ہے کہ وہ دوست کے ظلم سے خوش رہتا ہے۔

مرزا کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ میرا مقصود وفا کی تلاش سے یہ نہیں ہے کہ میں اہل دنیا سے وفا کا طالب ہوں بلکہ میں اسی میں خوش ہوں کہ میں پوچھوں کہ دنیا میں وفا ہے؟ اور وہ لوگ اسکے جواب میں کہیں کہ ہاں ہے۔ دونوں مقطع ہموار ہیں مگر باوجود اسکے مرزا کا بیاں بانکپن سے خالی نہیں۔

ہم نے دونوں شاعروں کی غزلوں کی شرح بخوبی کردی ہے، مگر زیادہ نکتہ چینی کرنا غیر ضروری سمجھا ہے۔ اور دونوں غزلوں میں محاکمہ کرنا بھی ناظرین کی رائے پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ خود بشرطیکہ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہونگے۔ اس بات کا اندازہ کرلیں گے کہ دونوں غزلوں میں کیا نسبت ہے۔

رباعیات

مرزا کی رباعیات تعداد میں قریب سوا سو کے ہیں جن میں سے اکثر شوخی و بیباکی، بادہ خواری، فخر و مباہات، اور شکایت و زار نالی کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ اور کسی قدر متصوفانہ اور چند خاص خاص مضامین پر ہیں خمریات میں ظاہرا عمر خیام کا تتبع معلوم ہوتا ہے۔ مرزا رباعی میں بہ نسبت

عام غزلیات کے زیادہ صفائی و شگفتگی اور گرمی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اُن میں سے کسی قدر رباعیاں بطور نمونے کے یہاں نقل کیجاتی ہیں۔ اور جہاں ضرورت ہوگی رباعی کے ساتھ اسکی شرح بھی کردیجائیگی۔

غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم (۱) زاں رو بصفائی دم تیغ ست دمم
چو رفت سپہیدی زدم چنگ بشعر (فخریہ) شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

گہر و گوہر۔ اصل دودہ۔ نسل و خاندان زادشمم۔ پشنگ کے باپ اور توراں فریدوں کے بیٹے کا نام ہے جسکی نسل میں مرزا اپنے تئیں بتاتے ہیں۔ دم تیغ، تلوار کی دھار۔ دمم یعنی میرا کلام۔ سپہیدی، سلطنت و سپہ سالاری نیا، دادا۔ نیاگاں جمع۔ کہتا ہے جب سپہیدی ہماری قوم سے رخصت ہوگئی تو میں نے شعر کہنا اختیار کرلیا، گویا بزرگوں کا ٹوٹا ہوا تیر میرا قلم بن گیا۔

شرطست کہ بہرِ ضبطِ آداب و رسوم (۲) خیزد بعد از نبی امام معصوم
زاجماع چہ گوئی بہ علی باز گرائے (تفضیلیہ) جائے نشیں مہر باشد نہ نجوم

یہ رباعی مرزا کے تفضیلی ہونے پر دلالت کرتی ہے نہ تشیع پر کیونکہ خلفائے ثلثہ پر نجوم کا اطلاق حضرات شیعہ نہیں کرسکتے۔

راہیست ز عبد تا حضورِ اللہ (۳) خواہی تو دراز گیر و خواہی کوتاہ
ایں کوثر و طوبیٰ کہ نشانہا وارد (تصوف) سرچشمہ و سایہ ایست در نیمۂ راہ

کہتا ہے کہ بندہ سے خدا کی حضور تک ایک راہ ہے، خواہ اسکو دراز سمجھو خواہ کوتاہ سمجھو۔ اور یہ جو کوثر و طوبیٰ ہیں جن میں اُسکی راہ کے کچھ کچھ نشان پائے جاتے ہیں۔ یہ ایسے ہیں جیسے اثناء راہ میں چشمہ اور سایہ آجاتا ہے

آں مرد کہ زن گرفت دانا نہ بود (۴) از غصہ فراغتش ہمانا نہ بود
دارد بہ جہاں خانہ و زن نیست درو (شوخی) نازم بخدا چرا توانا نہ بود

تیسرے مصرع میں وارد کا فاعل غم ہے جسکا نام چوتھے مصرع میں لیا ہے خانہ سے مراد خانۂ کعبہ ہے باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

(۵) بادست غم۔آں بادکہ حاصل ببرد آب رُخ ہوشمند و غافل ببرد
(شوخی) بگذاشتہ ام خمے زصہبا بہ پسر کش اندوہ مرگِ پدر از دل ببرد

کہتا ہے کہ غم ایک ہوا ہے۔ایسی ہوا کہ تمام خرمن کو اڑا لیجائے، اور دانا اور نادان کی آبرو کو بہا لیجائے، اسی لیے میں بیٹے کے لیے ایک شراب کا مٹکا چھوڑ چلا ہوں، تاکہ باپ کے مرنے کا غم اسکے دل سے دھو دے۔

(۶) اے آنکہ براہِ کعبہ روے داری نازم کہ گزیدہ آرزوے داری
(شوخی) زیں گونہ کہ تندمی خرامی۔دانم درخانہ زن ستیزہ خوے داری

کعبے جانے والے سے کہتا ہے کہ تیرا ارادہ تو بہت عمدہ ہے، مگر تو جو ایسا بھاگا جاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ تیرے گھر میں بد مزاج عورت ہے جسکے سبب سے کعبے جانے میں اسقدر جلدی ہے۔

(۷) شاہا ہر چند وا بہ جو آمدہ ام دانی کہ چہ مایہ نغز گو آمدہ ام
(فخریہ) رنگم کہ بہار را بہ رو آمدہ ام آبم کہ محیط را بجو آمدہ ام

(۸) زانجا کہ دلم بو ہم دربند نبود باہیچ علاقہ سخت پیوند نبود
(بے تعلقی) مقصودِ من از کعبۂ و آہنگ سفر جز ترکِ دیارِ زن و فرزند نبود

یعنی چونکہ میں وہم میں۔جو نیست کو ہست کی صورت میں دکھاتا ہے گرفتار نہ تھا، اسی لیے کعبے کے عزمِ سفر سے میرا مقصد زن و فرزند کا ملک چھوڑ دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

(۹) اے جام شراب شاد کامی زدۂ درجو روم از بلند نامی زدۂ
(عاشقانہ) یاد آر زمن چو بسینی اندر راہے تنہا روِ خستۂ حرامی زدۂ

حرامی، قزاق - حرامی زدہ، قزاقوں کا لوٹا ہوا اس شعر میں معشوق کی طرف خطاب کیا ہے - اور اپنی حالت کو اس مسافر سے مشابہ بتایا ہے جو تنہا ہو، مجروح ہو اور قزاقوں نے اُسے لوٹ لیا -

اے آنکہ ترا سعی بدر ماں من ست (۱۰) منعم مکن از بادہ کہ نقصان من ست
حیف ست کہ بعد من بمیراث رود (شوخی) ایں یک دو سہ خم کہ شبستان من ست

طبیب کی طرف خطاب ہے کہ مجھے بیماری میں شراب سے کیوں منع کرتا ہے؟ اگر میں مرگیا تو غضب ہو جائیگا، کہ یہ اکٹھے دو تین مٹکے میرے کام تو نہ آئیں گے میرے وارثوں کو پہنچ جائینگے -

آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقی دہر (۱۱) ریزد ہمہ دردو درد و تلخ آبۂ زہر
بگذر ز سعادت و نحوست - کہ مرا (شکوۂ روزگار) ناہید بہ غمزہ کشت، مریخ بقہر

ناہید یعنی زہرہ کو سعد اور مریخ کو نحس قرار دیا گیا ہے - کہتا ہے کہ سعادت و نحوست کے خیال کو جانے دو میرے حق میں تو سعد و نحس دونوں کے ستارے نحس ہو گئے کہ زہرہ نے مجھے غمزے سے قتل کیا اور مریخ نے قہر سے

شرطست کہ روی دل خراشم ہمہ عمر (تعریض بہ حکومت وقت) خونابہ بہ رخ زدیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگ مومن چوں کعبہ سیہ پوش نہ باشم ہمہ عمر

غالب روش مردم آزاد جدا ست (۱۲) رفتارِ اسیران رہ و زاد جدا ست
ما ترک مراد را ارم مے دانیم (ترک مراد) واں باغچہ ضبطی شداد جدا ست

یعنی آزاد لوگوں کی اور روش ہے اور جو لوگ توشہ اور رسم و راہ کے گرفتار ہیں انکا اور ڈھنگ ہے ہم کہ آزاد لوگ ہیں ہمارے نزدیک ترکِ مراد کا نام ارم ہے، اور وہ ارم جس سے شداد محروم رکھا گیا - وہ ہمارے ارم سے الگ ہے -

(۱۴) این نامہ کہ راحتِ دلِ ریش آورد — سرمایۂ آبروے درویش آورد
(تعریف درود) در ہر بنِ مو دمید جانے۔ یعنی — سامانِ نثارِ خویش با خویش آورد

(۱۵) منصور۔ غمش زنکتہ چنیان چہ بود — در راست خطر زہمنشیناں چہ بود
(تعریف) چوں عاقبتِ یگانہ بمیاں دار ست — دریاب کہ انجام و و بمیاں چہ بود

کہتا ہے کہ اگر منصور کو لوگ کہیں کہ سولی پر چڑھایا گیا اور ذلت سے مارا گیا تو منصور کو اسکی کچھ پروا نہیں مگر تم دیکھو کہ جب منصور جیسے یگانہ ہیں لوگوں کا انجام دار ہے تو دو رمیوں کا انجام کیا ہونیوالا ہے۔

(۱۶) ہر کس زحقیقت خبرے داشتہ است — بر خاکِ رہ عجز سرے داشتہ است
(شوخی) زاہد ز خدا ارم بہ دعوے طلبد — شدّاد ہمانا پسرے داشتہ است

کہتا ہے کہ جو شخص اپنی یا انسان کی حقیقت سے واقف ہوتا ہے اسکو عاجزی کرنے کے سوا کچھ بن نہیں آتی۔ پس زاہد جو خدا سے ارم دعوے کے ساتھ طلب کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ شداد نے بیٹا اپنا وارث چھوڑا تھا، کیونکہ اوّل تو ارم جو کہ متروکہ شدّاد ہے اسکا دعویٰ کرنا، اور پھر خدا کے سامنے اسکے مانگنے میں ہیکڑی کرنی، یہ دونوں باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ شدّاد نے اپنا وارث حقیقی چھوڑا تھا۔

(۱۷) غالب بہ سخن گرچہ کسے ہمسر نیست — از نشۂ ہوش ہیچ اندر سر نیست
(شوخی) مے خواہی و مفت و نغز انگہ بسیار!!! — ایں بادہ فروش۔ ساقی کوثر نیست

کہتا ہے کہ اے غالب اگرچہ شاعری میں کوئی تیرا ہمسر نہیں، گو عقل کا نشہ تیرے دماغ میں بالکل نہیں ہے، شراب چاہتا ہے، وہ بھی مفت اور وہ بھی عمدہ، اور پھر کثرت سے!!! یہ بادہ فروش ہے ساقی کوثر نہیں کہ تیری سب خواہشیں پوری کر دیگا۔

گردیدن زاہداں بجنت گستاخ (۱۸) دیں دست درازی بہ ثمر شاخ بہ شاخ
چوں نیک نظر کنی ز روے تشبیہ (شوخی) ماند بہ بہائم و علف زارِ فراخ

یعنی زاہدوں کا بہشت میں بیباک پھرنا، اور جا بجا ٹہنیوں پر پھلوں کے لیے ہاتھ مارنا، اگر غور کرکے دیکھو تو اسکی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک وسیع چراگاہ ہے اور اس میں ڈھور ڈنگر چرتے پھرتے ہیں

آنرا کہ بود در سے در فرجام (۱۹) ہم محرم خاص آید و ہم مرجع عام
آساں نہ بود کشاکش پاس قبول (اخلاق) زنہار نہ گردی بہ نکوئی بدنام

فرجام - انجام، اور نکوئی انجام اور رنگ و رونق کو بھی کہتے ہیں یہاں رنگ و رونق یعنی شہرت و ناموری مراد ہے۔ کہتا ہے کہ جسکی شہرت صحیح اور سچی ہوتی ہے وہ ضرور ہے کہ خواص کا محرم اور عوام کا مرجع واقع ہو۔ مگر پاس قبول کی کشاکش یعنی ہر موقع پر اس بات کا خیال رکھنا کہ قبولیت میں فرق نہ آئے نہایت سخت چیز ہے پس ہرگز نیکی کے ساتھ بدنام یعنی مشہور ہونا نہیں چاہیے اس موقع پر بجائے مشہور کے بدنام کا لفظ نہایت بلیغ واقع ہوا ہے جس سے ساری رباعی میں جان پڑگئی ہے۔

در عالمِ بے زری کہ تلخست حیات (۲۰) طاعت نہ تواں کرد بہ امید نجات
اے کاش ز حق اشارت صوم و صلوٰۃ (شوخی) بودے بوجودِ مال چوں حج و زکوٰۃ

کہتا ہے کہ بےمقدوری کی حالت میں جبکہ زندگی تلخ ہوتی ہے نجات کی امید پر طاعت نہیں ہوسکتی، کاش ایسا ہوتا کہ جس طرح حج اور زکوٰۃ میں استطاعت اور تمول شرط ہے روزے اور نماز میں بھی یہی شرط ہوتی۔

ہرچند زمانہ مجمع جہال ست (۲۱) در جہل نہ حال شاں بیک منوال ست
کودن ہمہ - لیک از یکے تا دگرے فرق خرِ عیسیٰ و خرِ دجال ست

کہتا ہے کہ اگرچہ زمانے میں جھڑان جاہل بھرے ہوئے ہیں، مگر جہل میں انکا حال متفاوت و مختلف ہے کو دن تو سب ہیں مگر ایک دوسرے میں ایسا فرق ہے جیسا خرِ عیسیٰ اور خرِ دجال میں۔

تا میکش و جوہر دو سخنور داریم (۲۲) شانِ دگر و شوکتِ دیگر داریم
در میکدہ پیریم کہ میکش از ماست (میکش و جوہر) در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

یہ رباعی منشی جواہر سنگھ جوہر اور میر احمد حسین میکش کے حق میں کہ دونوں مرزا کے عزیز شاگردوں میں سے تھے۔ لکھی ہے۔ در میکدہ پیریم۔ یعنی پیرِ مغانیم باقی رباعی کے معنی ظاہر ہیں۔

دستم بہ کلید مخزنے مے بایست (۲۳) ور بود تہی۔ بدامنے می بایست
با ہیچ گہم بہ کس نیفتاد سے کار (فخریہ) یا خود بزمانہ چوں منے می بایست

کہتا ہے کہ یا تو میرے ہاتھ میں کسی خزانے کی کنجی چاہیے تھی، اور اگر ہاتھ خالی ملا تھا تو اُس میں کسی کا دامن ہونا چاہیے تھا۔ جسکے توسل سے زندگی بسر ہوتی، یا مجھ کو کبھی کسی سے کام نہ پڑتا اور یا زمانے میں خود مجھ جیسا صاحب کمال ہوتا۔ جو میری قدر کرتا۔

ہستم زمے امید سرمست۔ و بس ست (۲۴) دارم سرایں کلاوہ در دست و بس ست
گرا ارزش لطف و کرمے نیست۔ مباش! (امید عفو) استحقاق ترحمے ہست و بس ست

سرایں کلاوہ۔ یعنی سرایں رشتہ۔ باقی معنی ظاہر ہیں۔

گرگرد ز گنج گہرے برخیزد (۲۵) مپسند کہ دود از جگرے برخیزد
منت نتواں نہاد بر گدیہ گراں (خطاب بغنیا) بنشیں کہ بخدمت دگرے برخیزد

گنج گہر سے گرد اُٹھنے کے معنی اسکے خالی ہو جانے کے ہیں۔ کہتا ہے کہ اگر جواہرات کا خزانہ خالی ہو جائے تو بلا سے مگر یہ گوارا مت کر کہ کسی کے جگر سے دھواں

اُٹھے، بھیک مانگنے والوں پر احسان نہیں رکھا جا سکتا۔ خدا نے انکی خدمت
پر تجھکو کھڑا کیا ہے اگر تجھ سے یہ خدمت پوری نہیں ہو سکتی تو بیٹھ جا، تاکہ دوسرا
اس خدمت کے لیے اُٹھے۔

اے دوست بسوئی ایں فرو ماندہ بیا (۲۶) از کوچۂ غیر راہ گرداندہ بیا
گفتی کہ مرا مخواں کہ من مرگ توام (عاشقانہ) بر گفتۂ خویش باش و ناخواندہ بیا

اوپر کے دونوں مصرعے صاف ہیں اسکے بعد کہتا ہے کہ اے دوست تو نے
مجھ سے کہا تھا کہ مجھے مت بلانا میں تیری موت ہوں اچھا اب تو اپنے کہنے
پر قایم رہ اور جس طرح کہ موت بن بلائے آتی ہے تو بھی بن بلائے چلا آ۔

اے آنکہ ہما اسیر دامت باشد (۲۷) صاف مے خسروی بجامت باشد
تسبیح بہر اسمِ الٰہی کہ بود آغاز ز ابتدائے نامت باشد

یہ رباعی سبحان علیخاں مرحوم کو مرزا نے خط لکھا تھا اسکے اول میں لکھی
تھی معنی ظاہر ہیں۔

بازیٔ خورِ روزگار بودم ہمہ عمر (۲۸) از بخت امیدوار بودم ہمہ عمر
بے مایہ بفکر سود ماندم ہمہ جا (امید بیجا) بے وعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر

باید کہ دلت ز غصہ برہم نہ شود (۲۹) از رفتن زر دست خوش غم نہ شود
ایں سیم و زرست خواجہ ایں سیم و زرست! (خطاب با غنیا) غم نیست کہ ہر چند خوری کم نہ شود

دست خوش مغلوب و زبردست۔ کہتا ہے کہ اے دولتمند! چاہیے کہ روپیہ کے
کم ہو جانے سے تیرا دل پریشان اور غم میں دبا ہوا نہ رہے۔ اے حضرت
یہ سیم و زر ہے، اور پھر کہتا ہوں کہ سیم و زر ہے یہ غم نہیں ہے کہ جسقدر
کھائے جایئے کم نہیں ہوتا۔

دارم دلِ شاد و دیدہ بینا ئے (۳۰) (گرانی گوش) وز کری گوشم نہ بود پروائے

خوب ست کر نشنوم زہر خود رائے گلبانگ اَنا ربکم الا علائے

کہتا ہے کہ مجھکو کری گوش یعنی ثقل سماعت کی کچھ پرواہ نہیں، بلکہ اسکو بہتر سمجھتا ہوں۔ کیونکہ مغرور اور خود پسندوں کی زبان سے اَنا ربکم الاعلیٰ (جو کہ فرعون کا مقولہ ہے) نہیں سنتا۔

(۳۱)
اے کردہ بآرائش گفتار پسیچ۔ در زلف سخن کشودہ راہ خم و ہیچ

(توحید وجودی)
عالم کہ تو چیز دیگرش میدانی ذاتے ست بسیط منبسط دیگر ہیچ

پسیچ۔ قصد۔ زلف سخن میں خم و ہیچ کی راہ کھولنے سے مراد بیان میں پیچیدگی پیدا کرنی کہتا ہے کہ عالم جسکو تو نے کچھ چیز سمجھ رکھا ہے وہ صرف ذات واحد ہے جو بسیط ہے۔ یعنی مرکب نہیں اور منبسط ہے یعنی تمام فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ بس اسکے سوا کچھ نہیں۔

(۳۲)
اے تیرہ زمیں کہ بودہ بستر من ہر خاک کہ باتست ہمہ بر سر من

(شکایت)
زر بہر کساں و بہر من دانہ و دام!! اے مادرِ دیگراں و مادندر من

مادندر سوتیلی ماں کو کہتے ہیں۔ زمین سے خطاب کرتا ہے کہ اوروں کے لیے تو تجھ پر سونا بچھا ہوا ہے اور میرے لیے دانہ و دام کے سوا کچھ نہیں، گویا تو اوروں کی ماں ہے اور میری مندر ہے۔ یہ مضمون تھوڑے تھوڑے فرق سے رودکی اور فرخی نے بھی باندھا ہے، مگر مرزا کے ہاں سب سے عمدہ طور پر بندھا ہے رودکی کہتا ہے۔

جہانا چہ بینی تو از بچگاں ؎ ؎ کہ مادر گہے گاہ مادندری

اور فرخی کہتا ہے۔

مہر فرزندی بر خواجہ فگندہ ست جہاں این جہاں مادرِ او نیست کہ مادندرِ اوست

(۳۳)
آنرا کہ زدست بے زری پامال ست (رسوائی) رسوائی نیز لازم احوال ست

ما خشک لبیم و خرقہ آلودہ بہ مے ساقی مگرش پیالہ از غربال ست

کہتا ہے مفلس آدمی کے لیے یہ بھی ضرور ہے کہ رسوا اور بدنام ہو۔ چنانچہ ہمکو دیکھو! کہ ہمارے ہونٹ تو خشک ہیں اور کپڑے شراب میں آلودہ ہیں گویا ساقی کا کام چھلنی کا بنا ہوا ہے کہ منہ تک آتے آتے ساری شراب کپڑوں پر ٹپک جاتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ مفلس آدمی جو شراب پینے لگتا ہے وہ بہت جلد بدنام اور رسوا ہو جاتا ہے کیونکہ کبھی کلال کی دوکان پر جاکر ہاتھ پسارتا ہے، اور جو تھوڑی بہت ملجاتی ہے تو بدمست ہوکر اُسکی دوکان ہی پر یا راہ میں گر پڑتا ہے، آنے جانے والے سب اُسکو دیکھتے ہیں۔ کبھی کلال کے دام چڑھ جاتے ہیں تو اس سے بازار میں تکرار ہوتی ہے اور سب لوگ دیکھتے ہیں حالانکہ کبھی اسکو اطمینان سے سیر ہوکر شراب پینی میسر نہیں ہوتی۔ اس حالت کو اس تمثیل کے پیرایے میں بیان کیا ہے کہ گویا ساقی تقدیر ہمکو چھلنی کے پیالے میں شراب دیتا ہے کہ ہونٹ تک تو تر نہیں ہوتے اور کپڑے سارے شرابور ہو جاتے ہیں ایسی بلیغ تمثیلیں بہت کم دیکھی گئی ہیں

اے دادہ بباد عمر در لہو و فسوس (۳۴) زنہار مشوز رحمت حق مایوس
ہشدار! کز آتش جہنم حق را تہذیب غرض بود نہ تعذیب نفوس

فسوس۔ ہزل و استہزا۔ کہتا ہے کہ جہنم میں ڈالنے سے بندوں کو تکلیف دینی مقصود نہیں ہے بلکہ جس طرح سونے کو آگ میں تپانے سے اُسکی کھوٹ نکالنی منظور ہوتی ہے اسی طرح آتش جہنم سے نفوس انسانی کو مہذب کرنا مقصود ہے۔

یارب تو کجائی کہ بما زر نہ دہی (شوخی) (۳۵) بیدرد خدائی کہ بما زر نہ دہی

بے مایہ چو مائی کہ بہ مازر نہ دہی
تو نہ غائبی، او نے بیرحمی

اس رباعی میں مرزا کی شوخی وگستاخی حد سے زیادہ گزر گئی ہے۔ دارالافتا میں تو یقیناً اس پر کفر کا فتویٰ دیا جائیگا، لیکن ہمارے نزدیک ایسے کلام سے بجائے کفر کے زیادہ تر قائل کے ایمان اور یقین پر استدلال ہوتا ہے۔ صاف پایا جاتا ہے کہ سائل معاش کی تنگی وفراخی وخوشحالی وبدحالی کو محض خدا کی طرف سے جانتا ہے، اور تدبیر وعقل ودانش کو اس میں بالکل عاجز ودرماندہ سمجھتا ہے، یہاں تک کہ جب معاش سے بہت تنگ ہوتا ہے تو یہ نہیں خیال کرتا کہ ہم نے تدبیر نہیں کی، یا تدبیر میں مجھ سے غلطی ہوگئی، یا ہماری کاہلی وسستی سے یہ تنگدستی ہمکو نصیب ہوئی، بلکہ نہایت تعجب کے ساتھ خدا کی جناب میں عرض کرتا ہے کہ کیا تیرا خزانہ خالی ہوگیا ہے جو ہمکو کچھ نہیں ملتا؛ ہاں اس قسم کے خطابات آداب شریعت کے بالکل خلاف ہیں، اور ایسے ہی خطابات کی نسبت کہا گیا ہے۔

مادروں را بنگریم وحال را
مابروں را ننگریم وقال را

قصائد مرزا کے قصائد۔ جن میں قطعات، نوحے، ترکیب بند، ترجیع بند مخمس وغیرہ بھی شامل ہیں۔ کیا باعتبار کمیت اور کیا بلحاظ کیفیت کے ان کے اصناف نظم میں سب سے زیادہ ممتاز صنف ہے۔ اگرچہ مرزا کی غزل کا ایک معتدبہ حصہ متاخرین کے طبقے میں کسی بڑے سے بڑے نامور اور مسلم الثبوت اُستاد کی غزل سے گرا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ اکثر کی غزل پر ہر ایک لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے مگر اسی کے ساتھ غزلیات کا ایک دوسرا حصہ ایسا بھی ہے جسمیں تغزل کی شان یعنی عام فہم اور خاص پسند ہونا۔ بہت کم پایا جاتا ہے بخلاف قصیدے کے کہ اس میں قصیدے کی شان جیسی کہ ہونی چاہیے اول سے آخر تک یکساں طور پر جلوہ گر ہے۔

قصائد میں مرزا نے کہیں خاقانی کا تتبع کیا ہے کہیں سلمان وظہیر کا اور کہیں عرفی و نظیری کا، اور ہر ایک منزل کامیابی کے ساتھ طے کی ہے۔ مرزا کی تشبیب بہ نسبت مدح کے نہایت شاندار اور عالی رتبہ ہوتی ہے اور اسی سے قصیدے کی پستی و بلندی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مشرقی شاعری میں عموماً اور ایران کی شاعری میں خصوصاً کوئی مضمون مدح و ستایش سے زیادہ پھیکا سیٹھا ٹھنڈا اور بے لطف نہیں ہوتا، علی الخصوص متاخرین نے مبالغہ کی لے کو بڑھاتے "بڑھاتے" مدح کو ہجو کے درجے تک پہنچا دیا ہے اور اس کلیہ سے مرزا کی مدح بھی مستثنیٰ نہیں۔ البتہ عرفی نے مدحیہ مبالغوں میں ایک قسم کا بانکپن پیدا کیا ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے جس طرح قدما کے قصائد میں وہ آن نہیں پائی جاتی اسی طرح مرزا کے قصائد بھی اُس سے معرا ہیں۔ لیکن مرزا کے اکثر قصیدوں کی تشبیبیں کچھ شک نہیں کہ عرفی کی تشبیبوں سے سبقت لے گئی ہیں۔

چونکہ مرزا کے تمام قصائد اور اُنکے ملحقات کے انتخاب کی اس مختصر میں گنجایش نہیں ہے اسلیے ہم ایک آدھ پورا قصیدہ اور باقی صرف چند تشبیبیں اور ایک آدھ مدح اور کچھ قطعے اور نوحے بطور نمونے کے اس مقام پر نقل کرتے ہیں اور اخیر میں مرزا کا ایک ترکیب بند نظیری کے ترکیب بند کے ساتھ اس غرض سے نقل کرینگے تاکہ اصحاب ذوق صحیح کو دونوں کے کلام میں موازنہ اور اس بات کا اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ مرزا نے اکبری طبقے کے چیدہ اور برگزیدہ شعرا کے تتبع کو کس حد اور کس درجے تک پہنچایا تھا۔

توحید

اے زوہم غیر غوغا در جہان انداختہ　　گفتہ خود حرفے و خود را در گمان انداختہ

دیدہ بیروں و دروں از خویشتن پروا نگمے — پردۂ رسمِ پرستش درمیاں انداختہ

نقش بر خاتم زحرفِ بے صدا انگیختہ — شور در عالم زحسنِ بے نشاں انداختہ

چرخ را در قالبِ ابداع دَرّوا ریختہ — خاک را بر قطعِ پیدائی ستاں انداختہ

عاشقاں در موقفِ دار و رسن وا داشتہ — غازیاں در معرضِ تیغ و سناں انداختہ

رنگہا در طبعِ اربابِ قیاس آمیختہ — نکتہ ہا در خاطرِ اہلِ بیاں انداختہ

باچنیں ہنگامہ در وحدت نمی گنجد دوئی — مردہ را از خویش دریا بر کراں انداختہ

[illegible]

دوئی کو مُردے سے اور وحدت کو دریا سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جس طرح دریا مردے کو باہر پھینکدیتا ہے اسی طرح باوجود ہنگامۂ کثرت کے وحدت میں دوئی نہیں سما سکتی۔ بالکل نئی اور نہایت بلیغ تشبیہ دی ہے۔

نردبانے بستہ با دیوار کاخے در نظر — انتقائے در نہادِ این و آں انداختہ

رفتہ ہر کس تا قدمگاہے وز انجا خویش را — پایہ پایہ از فرازِ نردباں انداختہ

غم چو گیرد بخت بتواں شکوہ از دلدار کرد — بہر آسائی اساسِ آسماں انداختہ

گل چو ماند دیر گردد بر دلش بازار سرد — بہر تجدیدِ طرب طرحِ خزاں انداختہ

آتشے از روے گلہاے بہار افروختہ — شعلۂ در جانِ مرغِ صبح خواں انداختہ

دجلۂ در ساغرِ معنی طرازاں ریختہ — رشحۂ در کاسۂ دریا دلاں انداختہ

جز بدیں آب آتشِ زردشت نتواں سرد کرد — کعبہ را جوے بہشت از ناوداں انداختہ

جز بدیں الماس نتواں تخمِ دُردانہ سفت — رخنہ از اسلام در کیشِ مغاں انداختہ

یعنی آتشِ زردشت ہر ایک پانی سے نہیں بجھ سکتی تھی اسلیے میزابِ کعبہ سے بہشت کی نہر جاری کردی اور کیشِ مغاں ایک ایسا موتی تھا کہ اسلام جیسے الماس کے سوا اسکا بیندھنا یعنی اس میں رخنہ ڈالنا ناممکن تھا۔

؎۱ معلق۔۱۲ ؎۲ فرش۔۱۲ ؎۳ ۔۱۲ ؎۴ جاؤ۔۱۲ ؎۵ یعنے بازارش بروں سرد گردد۔۱۲

چشم را[۵] بخشیده چوناں گردشے کازپا بہوش ‎— برزمیں وا نند طرح آسماں انداختہ
داده ابرو را بد انساں جنبشے کاہل قیاس ‎— در تن شمشیر پندارند جاں انداختہ
ای ز شرمِ خاکساران تو - از شہپر - ہما ‎— چوں گلیم کہنہ ظل را بر گراں انداختہ
ذوقِ تمکینِ گدایانِ تو - گنج شاه را ‎— از دلِ گنجور و چشمِ پاسباں انداختہ
تا دریں صورت زچشمِ دشمناں پنہاں بود ‎— دوست را اندر طلسمِ امتحاں انداختہ
تا علاجِ خستگی آسائش دیگر دہد ‎— خار ہا در رہگذارِ میہماں انداختہ

مرثیہ و نوحہ

کفرست کفر - در پے روزی شتافتن ‎— ننگ ست ننگ - در غمِ دنیا گریستن
گاہے بداغ شاہد و ساقی گداختن ‎— گاہے بمرگ مام و بابا گریستن
باید بدرد ہرزه گرستن دگر گریست ‎— بیجا گریستیم - در ایفا گریستن
رشک آیدم بہ ابر کہ در حدِ وسعِ اوست ‎— بر خاکِ کربلائے معلےٰ گریستن
رفت آنچہ رفت - بایدم اکنوں نگاہداشت ‎— از بہر نورِ دیدۂ زہرا گریستن
باران رحمتے!!! کہ باندازِ شست و شو ‎— دارد بہ روسیاہیِ اعدا گریستن
خود را ندیدزاں لب نوشین بکامِ خویش ‎— زیبد بہ شور بختیِ دریا گریستن
مزدِ شفاعت و صلۂ صبر و خونبہا ‎— ہیچ از کسے نخواستہ الّا گریستن
چوں رزقِ غیب در دترا عام کرده اند ‎— ہر می زند زمومن و ترسا گریستن

(نوحہ)

اے فلک شرم از ستم بر خاندانِ مصطفےٰ ‎— داشتی زیں پیش سر بر آستانِ مصطفےٰ
لے بمہر و ماه نازاں ہیچ میدانی چہ رفت ‎— از تو بر چشم و چراغِ دودمانِ مصطفےٰ
سایہ از سروِ روانِ مصطفےٰ افگند بخاک ‎— ہاں چہ بر خاک افگنی سر در روانِ مصطفےٰ
گرمیِ بازارِ امکاں خود طفیلِ مصطفےٰ است ‎— بیں چہ آتش میزنی اندر دکانِ مصطفےٰ

---

[۵] یعنی چشمِ معشوقاں - [۶] یعنی شست و شوی ...

کینہ خواہی[1] ہیں!! کہ با اولادِ سجادش کنی — اینچہ با مہ کردہ اعجاز بنانِ مصطفیٰ
نیک نبود گز تو بر فرزند دلبندش رود — اینچہ رفت از مرتضیٰ بر دشمنانِ مصطفیٰ
یا تو دانی مصطفیٰ را فارغ از رنج حسینؑ؟ — یا تو خواہی زیں مصیبت امتحانِ مصطفیٰ
یا مگر گاہے ندیدی مصطفیٰ را با حسینؑ؟ — یا مگر ہرگز نبودی در زمانِ مصطفیٰ
آں حسینؑ ست اینکہ گفتی مصطفیٰ روحی فداہ — چوں گزشتی نام پاکش بر زبانِ مصطفیٰ
آں حسینؑ ست اینکہ سودے مصطفیٰ پیشمش[2] رخ — بوسہ چوں باقی نماندے در دہانِ مصطفیٰ
قدسیاں را نطق من آوردہ غالب در سماع — گشتہ ام در نوحہ خوانی مدح خوانِ مصطفیٰ

نوحہ

اے کج اندیشہ فلک حرمتِ دیں بایستے — علمِ شاہ نگوں شد نہ چنیں بایستے
تا چہ افتاد کہ بر نیزہ سرش گردانند — عزتِ شاہ شہیداں بہ ازیں بایستے
حیف باشد کہ فتد خستہ ز توسن بر خاک — آنکہ جولانگہِ او عرشِ بریں بایستے
حیف باشد کہ ز اعدادِ ام[3] آبے طلبید — آنکہ سائل بدرش روح امیں بایستے
تازیاں را بہ جگر گوشۂ احمد چہ نزاع — وطنِ اصلیِ ایں قوم زچیں بایستے
ایہا القوم! اتنزل بود ار خود گویم — میہماں بے خطر از خنجر کیں بایستے

یعنی یہ تو ادنیٰ درجہ کی بات ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ اہلِ شام کربلا کا مہماں خنجر کیں سے محفوظ رہنا چاہیے تھا بلکہ جو سخن اس موقع پر کہنے کے لایق ہے وہ یہ ہے یعنی جیسا اگلے اشعار میں بیان ہوا ہے۔

سخن اینست کہ در راہِ حسینؑ ابن علیؑ — بوسہ از روی عقیدت بہ جبیں بایستے
چشم بد دور بہ ہنگام تماشائے رخش[4] — رونما سلطنتِ روی زمیں بایستے
داشت ناخواستہ در شکر قدومش دادن[5] — اگرش ملک گر تاج و نگیں بایستے

---

[1] انتقام کسی ۱۲ [2] یعنی چشم بر رخس ۱۲ [3] آبے ۱۲ [4] [5] دادن داشت یعنے می بایست داد ۱۲

چوں بفرمانِ خود آرائی و خودبینی و بغض
آں نکرد یدکہ از صدق ویقیں بایستے

با اسیرانِ ستمدیدہ پس از قتلِ حسینؑ
دل نرم و منش مہرگزیں بایستے

چہ ستیزم بقضا ورنہ بگویم غالبؔ
عَلَمِ شاہ نگوں شد نہ چنیں بایستے

(نوحہ)

وقت ست کہ در پیچ و خمِ نوحہ سرائی
سوزد نفسِ نوحہ گر از تلخ نوائی

وقت ست کہ آں پردگیاں بزرہ تعظیم
بر درگہِ شاں کردہ فلک ناصیہ سائی

از خیمۂ آتش زدہ عریاں بدر آیند
چوں شعلہ دخاں بر سرِ شاں کردہ ردائی

جانہا ہمہ فرسودۂ تشویشِ اسیری
دلہا ہمہ خوں گشتۂ اندوہ رہائی

اے چرخ چو آں شد گر از ہرچہ گردی
اے خاک چو ایں شد دگر آسودہ چرائی

خوں گرد۔ فروریز!! اگر صاحبِ مہری
برخیز و بخوں غلط! گر از اہلِ وفائی

تنہا ست حسین ابن علی در صفِ اعدا
اکبر تو کجا رفتی و عباس کجائی

توقیعِ شفاعت کہ پیمبر ز خدا داشت
از خونِ حسین ابن علی یافتہ روائی

فریاد از آں حاملِ منشورِ امامت
فریاد از آں نسخۂ اسرارِ خدائی

فریاد از آں زاری و خونابہ فشانی
فریاد از آں زاری و بیبرگ ولوائی

فریاد ز بیچارگی و خستہ درونی
فریاد ز آوارگی و بے سروپائی

غالب جگرے خوں کن و از دیدہ فرو بار
گر روے شناس غمِ شاہِ شہدائی

(نوحہ)

سروِ چمنِ سروری افتاد ز پا۔ ہاے
شہ غرقہ بخوں ہیکلِ شاہِ شہدا ہاے

بر خاکِ رہ افتادہ تنے ہست۔ سرش کو
آں روی فروزندہ و آں لعلِ دوتا۔ ہاے

عباسِ دلاور کہ در آں راہروی داشت
شمشیر بیکدست و بیکدست لوا۔ ہاے

آں قاسمِ گلگوں کفنِ عرصۂ محشر
وآں اکبرِ خونیں تنِ میدانِ وغا۔ ہاے

آں اصغرِ دل خستۂ پیکانِ جگر دوز — واں عابدِ غمدیدۂ بے برگ و نوا - ہائے
اے قوتِ بازوے جگر گوشۂ زہرا — دستِ تو بشمشیر شد از شانہ جدا - ہائے
اے شہرہ بدامادی و شادی کہ نداری — کافور کفن - بگذرم از عطر و قبا - ہائے
اے مظہرِ انوار کہ بود اہلِ نظر را — دیدار تو دیدارِ شہِ ہر دو سرا - ہائے
اے گلبنِ نورستۂ گلزارِ سیادت — نا یافتہ در باغِ جہاں نشو و نما - ہائے
اے منبعِ آں ہست کہ آرائشِ خلد ند — داغم کہ رسن شد بگلوے تو روا - ہائے
بالغ نظرانِ روشِ دینِ نبی حیف — قدسی گہرانِ حرمِ شیرِ خدا - ہائے
ماتم کدہ آں خیمۂ غارت زدگاں حیف — غارت زدہ آں قافلۂ آلِ عبا - ہائے
آں تابشِ خورشید دراں گرم روی حیف — واں طعنۂ کفار و داں شورِ عزا - ہائے
غالبؔ بملائک نتواں گشت ہم آواز — اندازۂ آں کو کہ شوم نوحہ سرا - ہائے

از قصیدۂ ضریحیہ

بیا در کربلا تا آں ستمکش کارواں بینی — کہ در روے آدم آلِ عبا را ساربان بینی
نہ بینی ہیچ بر سر خازنانِ گنجِ عصمت را — مگر در خار بُن ہا تار و پودِ طیلساں[1] بینی
ہمانا سیلِ آتش بُردہ بنگاہِ غریباں را — کہ ہر جا پارۂ از رخت موجے از دخاں بینی
بہ بینی چشمۂ از آب و چوں جوی کنارش را — ز خونِ تشنہ کاماں چشمۂ دیگر رواں بینی
بہ بینی سرخوشِ خوابِ عدم عباسِ غازی را — نہ مشکش در خمِ بازو نہ تیرش در کماں بینی
ہجومِ خستگان و سوز و سازِ نو گرفتاراں — تو آئیں بزم طوے قاسمِ ناشادماں بینی
نمی بینی کہ چوں جاں داد از بیداد بدخواہاں — علی اکبر کہ ہمچوں بختِ بدخواہش جواں بینی
گرفتم کاینہمہ بینی و لے داری و چشمے ہم — بخوں آغشتہ نازک پیکرِ اصغر چساں بینی
چہ دنداں در جگر افسردہ باشی کاندراں وادی — حسین ابن علی را در شمارِ کشتگاں بینی

---

[1] جھاڑیاں ۱۲ - [2] چادر ۱۲ -

نیاری گرد آں کوشی کہ پاسش در رکاب آری
نہ بینی گر خود آں خواہی کہ دستش بر عناں بینی

تنے را کش رگِ گل خار بودے بر زمیں یابی
سرے را کش ز افسر عار بودے بر سناں بینی

ستایشِ روزگار

ہست از تمیز گر بہ ہما استخواں دہد
آئین دہر نیست کہ کس را زیاں دہد

ہر دستمرد - ہر چہ کند بے خطر کند
رادستے راد - ہر چہ دہد رایگاں دہد

گلزار را اگر نہ ثمر - گل بہم نہد
درویش را اگر نہ سحر - شام - ناں دہد

گنجِ سخن نہد بہ نہاں خانۂ ضمیر
وانگہ کلیدِ گنج بدستِ زباں دہد

تا روزِ خاک تیرہ نہ گردد ز رشکِ چرخ
رخشانیِ ستارہ بریگِ رواں دہد

تا آدمی ملال نہ گیرد ز یک ہوا
سرمائے نو بہار و تموز و خزاں دہد

ہم در بہار گل شگفاند چمن چمن
تا راحتِ مشام و نشاطِ رواں دہد

ہم در تموز میوہ فشاند طبق طبق
تا آرزوئے کام و مرادِ دہاں دہد

آں را کہ بخت دسترسِ بذلِ مال نیست
طبعِ سخن رس خردِ خردہ داں دہد

آں را کہ طالعِ کفِ گنجینہ پاش نیست
نعم البدل ز خامۂ پرویں فشاں دہد

دانم کہ آسماں بہ زمیں پیشکار کیست
عکس چہ جلوہ روشنی روشناں دہد

چوں جنبشِ سپہر بفرمانِ داور ست
بیداد نہ بود آنچہ بما آسماں دہد

رنگ از گل ست و سایہ ز نخل و نوا ز مرغ
ہر جا بہار - ہر چہ بود در خور - آں دہد

در نشر نفحۂ قرعہ بنامِ ہوا زند
در نشوِ سبزہ حکم بہ آبِ رواں دہد

مستیز با نسیم اگر بلبلے بہ باغ
جاں در نوردِ خار و خسِ آشیاں دہد

دارو ز بہرِ زندگی آمد - نہ بہرِ مرگ
جرمِ پزشک چیست اگر خستہ جاں دہد

۱؎ میاض ۔ ۲؎ صفت ۔ ۳؎ ہمتار گاں ۔ ۴؎ طبیب

پرویز در یاب شہے بود - ورنہ بخت — آوارہ را براہ ز شیریں نشاں دہد
فرہاد زود میر کسے بود - ورنہ دہر — کامِ دلِ غریب پس از امتحاں دہد
دارم ز روزگار نویدے کہ آں نوید — در پیریم بشارتِ بختِ جواں دہد
از داورِ[1] زمانہ باندیشۂ درست — شادم کہ مزدِ بندگیم ناگہاں دہد
ہر گہ بسر نوشت سر آید شمارِ غم — راہم ببارگاہِ شہ انس و جاں دہد
سلطانِ دیں محمد مہدی کہ رائے او — منشور روشنی بہ شہِ خاوراں دہد

صفتِ سالکانِ طریقت

رہرواں[2] چوں گہر آبلۂ پا بینند — پاے را پایہ فراتر[3] ز ثریا بینند
ہر چہ در دیدہ عیانست بنگاہش[4] دارند — ہر چہ در سینہ نہانست ز سیما بینند
راستی از رقمِ صفحۂ ہستی خوانند — نقشِ کج بر ورقِ صفحۂ عنقا بینند

یہ شعر گویا ماحصل ہے اس قول کا کہ "لَیْسَ فی الامکانِ اَبدَاعُ مِمَّا کَانَ" یعنی جو نظامِ عالم کہ اب موجود ہے اس سے بہتر نظام ناممکن تھا۔

دور بنیانِ ازل - کوریِ چشمِ[5] بدِ من — ہم دریں جا نگرند انچہ در آنجا بینند
راز زیں دیدہ دراں جوے کہ از دیدہ دری — نقطہ گر در نظر آرند سویدا بینند
راہ زیں گرم رواں پرس کہ در گرم روی — جادہ چوں نبضِ تپاں در رگِ صحرا بینند
شررے را کہ بناگاہ بدر خواہد جست — زخمہ کردار بتار رگِ خارا بینند
قطرۂ را کہ ہر آئینہ گہر خواہد[6] بست — صورتِ آبلہ بر چہرۂ دریا بینند
شام در کوکبۂ صبح - نمایاں نگرند — روز در منظرِ خفاش ہویدا بینند
وحشتِ تفرقہ در کاخِ مصوّر سنجید — مجمعِ انس بہ بے لبستِ زلیخا بینند

---

[1] مراد از داور زمانہ خود زمانہ ۱۲ [2] سالکان ۱۲ [3] بالاتر ۱۲ [4] یعنی آ بنظر غور بہ بینند ۱۲ [5] یعنی چشم بد دور ۱۲ [6] یعنی گم خواہد شد ۱۲

کاخ مصوّر وہ محل جسکو زلیخا نے وصالِ یوسف کے لیے آراستہ کیا تھا اور جس میں تمام سامانِ عیش وکامرانی جمع تھا۔ نَے بست وہ جھونپڑا جو یوسفؑ کے قید ہو جانے پر انکی جدائی کے غم میں زلیخا نے اپنے لیے بنایا تھا اور اس میں رہتی تھی۔ کہتا ہے کہ یہ لوگ یعنی اہل اللہ کاخ مصوّر جیسے آراستہ محل میں اس تفرقہ کی وحشت کو دیکھ لیتے ہیں جو یوسفؑ اور زلیخا کے حق میں وہاں سے آخرکار پیدا ہوا اور انس اور ملاپ کو اُس نَے بست میں دیکھ لیتے ہیں جو یوسف اور زلیخا کو اسکے بعد نصیب ہونے والا تھا۔

ہرچہ گوید عجم از خسرو و شیریں شنوند ہرچہ آرد عرب از وامق و عذرا بینند

یعنی خسرو و شیریں کا قصہ جو اہل عجم بیان کرتے ہیں یہ لوگ اُسکو خود خسرو اور شیریں کی زبان سے سن لیتے ہیں اور وامق و عذرا کی روئداد جو عرب والے بیان کرتے ہیں یہ لوگ اُسکو خود وامق و عذرا پر گزرتی دیکھ لیتے ہیں۔

نستوہند اگر ہمرہ مجنوں گردند نخروشند اگر محمل لیلےٰ بینند

خوں خورند و جگر از غصہ بدنداں گیرند خویش را چوں بسرِ مائدہ تنہا بینند

یعنی جب انکے ساتھ کوئی دوسرا دسترخواں پر نہیں ہوتا تو دانت پیستے ہیں یعنی جو فیض انکو پہنچتا ہے اس میں اوروں کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔

سروتن را اگر از در دستوہ انگارند جان و دل را اگر از دوست شکیبا بینند

قطرۂ آب بہ لب بوسۂ نشتر شمرند پارۂ ناں بہ گلو ریزۂ مینا بینند

یہ دونوں شعر دست وگریبان ہیں مطلب یہ ہے کہ درد طلب سے اُکتا جانا اور دوست کے خیال سے فارغ ہونا کبھی نہیں چاہتے۔

قشقہ را رونقِ ہنگامۂ ہندو خوانند بادہ را شمعِ طرب خانۂ ترسا بینند

یعنی ہر ایک شے کو اپنے اپنے محل پر مناسب و موزوں خیال کرتے ہیں اور

کسی چیز سے ازراہِ تعصب ناک نہیں چڑھاتے۔

برسم و زمزمہ و قشقہ و زنار و صلیب — خرقہ و سبحہ و مسواک و مصلّےٰ بینند

برسم و زمزمہ آتش پرستوں کے ساتھ، قشقہ و زنار ہندوؤں کے ساتھ اور صلیب عیسائیوں کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسرے مصرع میں شعائر اسلام کا بیان ہے کہتا ہے کہ وہ لوگ برسم و زمزمہ وغیرہ اور خرقہ و مصلّی وغیرہ میں کچھ فرق نہیں سمجھتے۔

دل نہ بندند بہ نیرنگ درین پردہ رنگ — ہرچہ بینند بہ عنواں تماشا بینند

جام جویند و زرندی نگرایند بہ زہد — سبحۂ انجم اگر ز ور ید بیضا بینند

ہرچہ در شش[1] سو نتواں یافت بہ ہر سو یابند — ہرچہ در جا[2] نتواں دید بہ ہر جا بینند

ہمہ گردند دراں پایہ کہ او را دانند — ہیچ باشند دراں وقت کہ خود را بینند

ایں نظرہائے گرانمایہ[3] فراموش کنند — چوں بہ نیرنگ سخن شعبدۂ ما بینند

(اشعار فخریہ)

نظم را موجۂ سرچشمۂ حیواں فہمند — نثر را نسخۂ اعجاز مسیحا بینند

گہ پئے نقل بصد گونہ تقاضا خواہند — گہ پے فال بصد رنگ تمنّا بینند

برد از یاد کہ دنیاست نمودِ بے بود — ایں دل افروز نمودیکہ ز دنیا بینند

اس مقام پر اس شعر کی خوبی وجدانی ہے بیان میں نہیں آسکتی۔ کہتا ہے کہ دنیا کی یہ دل افروز نمود یعنی ہماری نظم و نثر جب اہل اللہ کی نظر سے گزریگی تو وہ انکے دل سے اس عارفانہ خیال کو فراموش کردے گی کہ دنیا محض ایک نمودِ بے بود ہے۔

صفت موسم بہار

(تشبیب قصیدۂ مدح ملکہ معظمہ)

شکر کہ آشوب برف و باد سر آمد — نامیہ از بندِ زمہریر بر آمد

---

[1] جہت ۱۲ [2] مکان ۱۲ [3] یعنی ایں ملاحظات کہ بالا مذکور شد ۱۲

کسب ہوا نفع آبِ خضر رساند — سبزہ بہاں راہ بہ بیشہ راہبر آمد

یعنی آجکل جنگل کی ہوا کھانے سے وہی فائدہ ہوتا ہے جو آبِ حیات کے پینے سے ہوتا ہے۔ اور جس طرح خضر آبحیات کا رستہ بتاتا ہے اسی طرح سبزہ جنگل کا رستہ بتاتا ہے۔

درچمنستاں کشودہ بار لوا در — باد کہ بازارگاں بحر و بر آمد
آستم انتظارِ گُل بود - ارنہ — دیدہ نرگس ز حدقہ چوں بدر آمد
تا زچہ دانستہ قربِ مقدمِ گُل را — سبزہ بہ باغ از شگوفہ بیشتر آمد

یعنی سبزہ جو شگوفے سے پہلے باغ میں آیا ہے اس نے گل کی آمد آمد کہاں سے سُن لی۔

بیہدہ نبود خروش مرغ سحر خواں — کوکبۂ گل مگر بباغ در آمد
قیس کجا تا کند شمارۂ محمل — از بس ہر غنچہ غنچہ دگر آمد

غنچے کو محمل سے اور گل کو لیلیٰ سے تشبیہ دی ہے کہتا ہے کہ قیس جو ایک کے سوا دوسرا محمل نہیں جانتا وہ آئے اور محملوں کو شمار کرے کیونکہ ہر غنچے کے بعد دوسرا غنچہ اور دوسرے کے بعد تیسرا وعلم جراً نکلتے چلے آتے ہیں۔

کثرتِ انواعِ گلِ نگر کہ ہیولے — رنجہ ز بارِ فزونیِ صُور آمد

یعنی طرح طرح کے پھولوں کی اس قدر کثرت ہے کہ ہیولیٰ بیشمار مختلف صورتوں کی بہتات سے عاجز آگیا ہے اور تھک گیا ہے۔

لالہ بسیچد ز تیغ کوہ گذشتن — دامنش اینک ز زیر سنگ بر آمد

بسیچد یعنی ارادہ کرتا ہے۔ تیغ کوہ قلۂ کوہ۔ دامن از زیر سنگ بر آمدن مصیبت سے نجات پانا۔

لہ آبِ حیوان ۱۲ ؎ نقاش ۱۲ ؎ سوداگر ۱۲ ؎ شدت ۱۲ ؎ ورنہ ۱۲ ؎ چرا ۱۲ ؎ یعنی بیوجہ ۱۲ ؎ سواری ؎ شاید ۱۲

نکہت گل شد وبائے عام جُعَل را — زنجرہ ہر شب نہ ہر زمِ مویہ گر آمد

جعل ایک جانور ہے سیاہ رنگ. جسکو خوشبو راس نہیں اسی لیے موسم بہار میں مرجاتا ہے اور چونکہ گوبر میں پیدا ہوتا ہے اس لیے اسکو ہندی میں گبھریلا کہتے ہیں. زنجرہ جھینگر جو رات کو اکثر بولتا ہے - مویہ گر نالاں وگریاں -

میکدہ خسرو گل ست - رزِستاں — صورتِ مینا ز غورہ در نظر آمد

کہتا ہے کہ رزِستان یعنی انگور کی ٹٹیاں گویا خسروِ گل کا شراب خانہ ہے کیونکہ اس میں نیم خام انگور لگے ہوے ایسے معلوم ہوتے ہیں - جیسے شراب کی بوتلیں

رو غم تو دامنی مخور - کہ جہاں را — موج گل از ہر کرانہ تا کمر آمد

فتوی مے داد ابر و باد ولیکن — شیشہ نہاں بہ کہ ژالہ بدگہر آمد

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں امن ہوجانا اور معافی کا اشتہار جاری ہونا

در روزگار ہا نہ تواند شمار یافت — خود روزگار انچہ دریں روزگار یافت

پرکار تیز گرد فلک درمیاں مبیں — حق داد داد حق کہ بمرکز قرار یافت

در ہائے آسماں بہ زمیں باز کردہ اند — ہر کس ہر انچہ جست بہ ہر روزگار یافت

آمد اگر بفرض ز بالا بلا فرود — بر روی خاک پیچ و خم زلف یار یافت

چوں حسن ماہ یک شبہ بینی. بداں کہ ماہ — پاداش جانگدازی شبہائے تار یافت

چوں رنگ روی گل نگری شاد شو کہ گل — اجر جگر خراشی پیکانِ خار یافت

در خاک و باد آتش و آب آشتی فزود — ایں پرورش کہ خلق ز پروردگار یافت

ناچار جز بہ داد گرایش نہ می کنند — در دہر ہر چہ صورت ازیں ہر چہار یافت

ہر کس بقدر فطرت خویش ارجمند گشت — ہر شے بجنس جوہر خویش اشتہار یافت

گر خواجہ بندہ را خط آزادگی نبشت — ہم بر در سرای خودش بندہ وار یافت

در بندہ خود ز خشم خط بندگی درید — توقیع خوشدلی ز خداوندگار یافت
مہ روشنی و مہر فروزش ز مہر گرفت — لیل و نہار صورت لیل و نہار یافت
بہرام دل بہ بستن تیغ و کمر نہاد — ناہید ذوق ورزش مضراب و تار یافت
نظارہ[1] فتنہ ہاے عیاں از نظر سترد — اندیشہ گنجہای نہاں آشکار یافت
جام از شراب روشنیِ آفتاب داد — بزم از بساط تازگیِ نوبہار یافت
روے سخن صفائی بناگوشِ گل گزید — بانگِ قلم نشاط نواے ہزار[2] یافت
برہم زدند قاعدہ ہاے کہن بہ دہر — ہر کس نشاطِ تازہ ز ہر گونہ کار یافت
فیضِ سحر بہ غالبِ پیمانہ کس رسید — ذوقِ صبوحِ عابدِ شب زندہ دار یافت
رہزن متاعِ خویش براین السبیل ریخت — کودک رضاے لہو ز آموزگار یافت
گر زاہد ست نیز ز من مے بجام برد — ور مجرم ست نیز ز شحنہ زینہار یافت
با فتنہ ہم مضائقہ در خرمی نرفت — خود رخت خوابش از رگِ گل پود و تار یافت
دولت سپند سوخت کہ شد ملک تازہ روے — ملک آفریں سرود کہ دولت مدار یافت
از انتظامِ شاہی و آئینِ سروری — سور و سرور و دانش و داد انتشار یافت
بر خستگانِ ہند بہ بخشود از کرم — وکٹوریا کہ رونق از روزگار یافت

شکوۂ تغافل و عدم توجہ نواب یوسف علیخاں مرحوم رئیس رامپور در زمانۂ سختی و بے مائگی کہ بعد از فتحِ دہلی روزے چند روے دادہ بود۔

چوں نیست مرا شربت آبے ز تو حاصل — دانم کہ تو[3] دریائی و من سبزۂ ساحل
در بادیہ بر گورِ غریباں ز چہ سوزد — آں شمع فروزاں کہ بود در خورِ محفل
زاں خسروِ خوباں چہ قدر چشمِ وفا بود[4] — صد حیف کہ شد نقشِ امیدم ہمہ باطل

[1] یعنے چشم ۔ [2] بلبل ۔ [3] یعنی سرج ۔ [4] نواب یوسف علیخاں مرحوم صاحبزادگی کے زمانے میں جب تحصیل علم (باقی نوٹ صفحہ ۲۹۲)

افسانۂ غم گر بسرائیم نہ بود عیب ‏ ‏ ‏ با دوست کہ پیوستہ ہمی برد غم از دل
میگویم و ہمدم زندم طعنہ کہ تن زن[1] ‏ ‏ ‏ چوں می نہ ہد داد ز فریاد چہ حاصل
از طعنۂ ہمدم خستہ دل و از رده[2] یار ‏ ‏ ‏ دل گفت کہ ہاں شیوۂ عشاق فرو ہل
تا کس نبرد ظن کہ بہ شاہد بودم روے[3] ‏ ‏ ‏ حاشا کہ حکایت کنم از لیلی[4] و محمل
شاہد بود آں دوست کہ اندر غزل اورا ‏ ‏ ‏ خوانند ستمگارۂ خونخوارہ و قاتل
من نالم ازاں دوست کہ در عالم انصاف ‏ ‏ ‏ شایاں بودش گویم اگر خسرو عادل
او خسرو خوباں بود و بندہ گدا ایش ‏ ‏ ‏ او قلزم و عماں بود و من خس ساحل
خود ہر چہ سرودم ہمہ با دوست کزیں پیش ‏ ‏ ‏ امید کہم بود بہ ہر وادی و منزل
یارب چہ شد اینک کہ نگیرد خبر از من ‏ ‏ ‏ بربستہ برویم در ارسال رسائل
اے یوسف ثانی کہ بود در ہمہ عالم ‏ ‏ ‏ مشتاق جمال تو چہ دیوانہ چہ عاقل
تا نزد تو چوں آیم و دور از تو چہ سازم ‏ ‏ ‏ ماندن[5] ز تو دشوار و رسیدن بہ تو مشکل
اے کاش بکوے تو چنیں روے نمودے ‏ ‏ ‏ زینساں کہ فرو رفتہ مرا پای در[6] گل
چوں ست کہ گاہے نکنی روی بدیں سوے ‏ ‏ ‏ از چیست کہ ہرگز نہ دہی دایہ[7] بسائل
گر جاں دہم از غصہ تو دانی کہ بگیتی ‏ ‏ ‏ حرفے غلط از صفحۂ ہستی شدہ زائل
خواہی کہ مرا بنگری؟ از دور بفرماے ‏ ‏ ‏ تا نزد تو آرند یکے طائر بسمل

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۹۱) کے لیے دلی میں آئے تھے اسوقت مرزا صاحب سے بہت ربط تھا مفتی صدرالدین خاں مرحوم سے عربی پڑھتے تھے اور مرزا صاحب سے فارسی۔ مرزا نے اس قصیدے میں اس زمانہ کو یاد دلایا ہے چنانچہ اسی قصیدے پر نواب ممدوح نے سو روپیہ ماہوار مرزا کے لیے مقرر فرمایا تھا جو مرزا کے دم واپسیں تک برابر جاری رہا ۱۲۔

[1] خاموش باش [2] غمخواری [3] یعنی روائے سخن ۱۲

[4] چونکہ تشبیب میں اکثر معشوق کی طرف خطاب ہوتا ہے اسلیئے کہتا ہے کہ میں اس تشبیب میں لیلی و محمل کا ذکر نہیں کرتا یعنی معشوق کی طرف میرا روے سخن نہیں ہے ۱۲

[5] یعنی از لقای تو وا ماندن ۱۲ [6] یعنی در وطن خود ۱۲ [7] دریوزہ ۱۲

از صنعتِ اُستادِ ازل داں کہ زہر سوے — چوں قبلہ نما سوے تو ام ساختہ مائل

غالب بسخن نام من آمد - ازلی[1] آورد — دانی کہ دریں شیوہ نیم عامی و جاہل

در فن سخن دم مزن از عرفی و طالب — ایں آیہ خاص ست کہ بر من شدہ نازل

من گنجم و گردوں نہ گل اندودہ[3] درم را — می بین درِ گنج - ارچہ کشودن شدہ مشکل

خود در خودِ ویرانہ بود - گنج گراں[4] سنگ — غم نیست گر آبادیِ دہلی شدہ زائل

باروت - فسونِ نفسِ گرم چہ داند — اعجاز ز دہلی بود و سحر ز بابل

آں را کہ صریر قلم ہوشش رُباید — دیگر بنرد ذوق ز آواز عنادل

توقیع[5] بریلی بہ تو فرخندہ کہ من نیز — بستم بہ فرخندگی[6] خویش از کرمت دل

حاشا کہ ستانم رقم قاضی[7] و مفتی — حاشا کہ پذیرم عمل شحنہ و عامل

بفرست خردمند کساں را بچکومت — در جیب گدا ریز قلیلے ز مداخل

ہر سال ازاں شہر بمن وایہ[8] رواں دار — کز بہر ہمیں گشتہ در اقطاع[9] تو شامل

امید کہ لب تشنگیِ من نہ پسندی — زاں رشحہ کہ بر صفحہ فشانی ز انامل

زاں رشحہ یعنی مداد - مطلب یہ کہ میرے ساتھ خط کتابت جاری رہے -

امید کہ بپذیری و بر من نہ کنی قہر — نپذیرم اگر معذرت فرط مشاغل

امید کہ آں شیوہ نورزی کہ بگویم — کز درد دلم فارغ و از من شدہ غافل

کیفیت آغاز موسم سرما

عید اضحےٰ بسر آغازِ زمستاں آمد — وقتِ آراستنِ حجرہ و ایواں آمد

گرمی از آب برون رفت و حرارت ز ہوا — تحویل مہر جہاں تاب بہ میزاں آمد

---

[1] یعنے قدیم و ازلی [2] یعنے میرے [3] کو تنہا کر دیا ہے [4] گنج گراں بہا [5] یعنے فرمان الحاق بریلی بہ رامپور [6] اقبال مندی [7] یعنے عہدہ قاضی و مفتی [8] تنخواہم [9] یعنی از محالات بریلی [10] جاگیر

روز می کاہد۔ وشب راست درافزایشِ روی
آذر افروز۔ وخز و اطلس وسیفور۔ بدوز
ہند در فصل خزاں نیز بہارے دارد
دے و بہمن[1] که در اقلیم دگر یخ بندد
نیشکر[2] بسکه صف آراست۔ کدیور[3] به نسیم
نخل نارنج نه بینی که ہم از میوه و شاخ
تا برد داغ غمِ ہجرِ شقائق[4] زدلش
گرنه ایں گرمی ہنگامه تماشا دارد

تشبیب [illegible]

موسم دیر غنودن به شبستاں آمد
مہر مہ۔ میرد واینک مہ آباں آمد
گونه گوں سبزه حُلّی بندِ خیاباں آمد
اندریں ملک گل وسبزه فراواں آمد
گفت جانیست دگر۔ سرزده[5] نتواں آمد
گوی و چوگاں بکف آورد ومیداں آمد
گل صدبرگ بدلجوئی دہقاں آمد
از چه نرگس پے نظاره به بستاں آمد

صفت موسم بہار

سحر که بادِ سحر عرض بوستاں گیرد
برات بر زرِ گل کرده اند۔ پنداری
نگر بگرد گل از ہر پاس حلقه زده است
ستاده سرو بداں اہتمام بر درِ باغ
زژاله غنچه به سرمست شاہدے نامد
چمن زعکسِ شفق ساتگینِ مُل گردد
زنند گر ہمه آتش به خار۔ گل بالد
زانبساطِ ہوا بعد ازیں عجب دارم
زگل نگه نتواں داشت دل بحیلهٔ عشق
چناں بگنج چمن یافت ذوقِ طاعتِ حق

تشبیب [illegible]

دہد به نکہتِ گل حکم تا جہاں گیرد
که غنچه را سپه سبزه درمیاں گیرد
که ژاله راز ہوا سبزه بر ستاں گیرد
که تا بہارِ دگر راه بر خزاں[6] گیرد
که بعد باده شکر ریزه در دہاں گیرد
سمن زجوشِ طرب رنگِ ارغواں گیرد
کشند گر ہمه پیکر زسنگ جاں گیرد
که مرغ قبله نما جا در آشیاں[9] گیرد
اگر زمانتواند زدل ستاں گیرد
که شیخ شہر چو مارِ تکِ خان و ماں گیرد

---

[1] یعنی در دے بہمن ۱۲ [2] باغباں وکاشتکار ۱۲ [3] یعنی درآتا یا منه اٹھائے ۱۲ [4] لاله ۱۲ [5] گیندا ۱۲ [6] شخوده کی چھی ۱۲
[7] محل غفلت ۱۲ [8] مسدود سازد ۱۲ [9] یعنی از آشیاں پرواز خواہد گیرد ۱۲

حریص جلوہ بنگہ در ہجوم لالہ و گل — چو آں گدائے کہ دنبالِ کارواں گیرد
چنیں کہ شاخ ہمی سینہ بر زمیں مالد — چرا کسے ثمر از دستِ باغباں گیرد

کیفیت صبح

تشبیب قصیدہ در منقبت حضرت امیر علیہ السلام

صبحے کہ در ہوائے پرستاری وثن[1] — جنبد کلید بتکدہ در دستِ برہمن
در رُفت و روب دیر۔ دم گرم راہباں — آرد بروں گداختۂ شمع از لگن
خیزند دستہ دستہ[2] مغاں نشستہ روے — در آرزوی چیدنِ برسم[3] زنار دن
از شور دیریاں بگمانِ خروشِ صور — اموات راز رقص بہ تن پر درد[4] کفن
زخشد ستارہ از رخِ ناشستۂ صنم — بالد بنفشہ از قدِ خم گشتۂ شمن[5]
بر روے خاک جلوہ کند سایہ درنظر — بر بوے دوست حلقہ زند مرغ در چمن
خوابد چراغ کشتہ چو شخص بُریدہ سر — خیزد گل شگفتہ چو رنجور خستہ تن
بر جام مل زدیدۂ شبنم چکد نگاہ — بر روی گل زطرۂ سنبل دود شکن
غوغاے روز پردہ کشاید ز خوب و زشت — آوائے کوس خواب رُباید ز مرد و زن

فخر و خود ستائی باشکوۂ بخت و گردوں

اس مضمون کے کچھ متفرق اشعار ہم مرزا کے ایک ترکیب بند میں سے جو جناب امیر کی منقبت میں لکھا گیا ہے نقل کرتے ہیں چونکہ یہ نظم ایک خاص انداز کی منقبت اور خاص طرز کی شاعری پر مبنی ہے جس سے زمانۂ حال کے عام مذاق ناآشنا ہیں مگر باوجود اسکے مرزا کے کلام میں شاعری کی حیثیت سے

---

[1] بت ۱۲ [2] گروہ گروہ ۱۲ [3] برسم جھاؤ یا انار وغیرہ کی پتلی پتلی بالشت بھر کی شاخیں جنکو آتش پرست عبادت غسل یا طعام کے وقت ہاتھ میں رکھتے ہیں [4] یعنی زندہ شود ۱۲ [5] شمن بت ۱۲

نہایت ممتاز درجہ رکھتی ہے اسلئے نہ اسکو اس موقع پر بالکل قلم انداز کیا جاسکتا ہے. اور نہ وہ اوّل سے آخر تک نقل کیجا سکتی ہے۔ لہذا متعدد بندوں میں سے جستہ جستہ اشعار مندرجۂ عنوان انتخاب کر کے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں اور جہاں جہاں ضرورت ہوگی مشکل مقامات کی شرح بھی کیجائے گی۔

بند اوّل

آں سحر خیزم کہ مہ را در شبستاں دیدہ ام
شب نشیناں را دریں گردندہ ایواں دیدہ ام

اس تمام بند میں مرزا نے اپنی سحر خیزی اور جو کچھ اُس نور ظہور کے وقت آسمان پر یا زمین پر نظر آیا ہے اسکو بلیغ و جزیل اشعار میں بیان کیا ہے اور آخر کو اُس سے ایک لطیف نتیجہ نکالکر شکایت آمیز فخر پر بند کو ختم کیا ہے کہ شعر مذکور کا مطلب یہ ہے کہ میں سحر خیز ہوں کہ میں نے چاند کو اُسکی خوابگاہ میں دیکھا ہے اور شب بیداروں یعنی کواکب یا ملائک کو اس گردندہ ایوان (یعنی آسمان) میں مشاہدہ کیا ہے۔

اینت خلوتخانۂ روحانیاں! کانجا ز دور
زہرہ را اندر ردائے نورِ عریاں دیدہ ام

اینت کلمۂ تحسین و تعجب ہے بمعنی زہے و خہے۔ روحانیاں فرشتے۔ آسمان کو کہتا ہے کہ کیا عمدہ خلوتخانہ روحانیوں کا ہے۔ جہاں میں نے دور سے یعنی زمین پر سے زہرہ کو چادرِ نور میں عریاں یعنی بغیر کسی حجاب کے دیکھا ہے

ہر یکے فارغ ز غیر و ہر یکے نازاں بخویش
نو بیے را در دو عشر تکدہ دو مہماں دیدہ ام

ہر گز اسے ناداں برسوائی نہ بندی دل کہ من
ماہ را در ثور و کیواں را بمیزاں دیدہ ام

ان دونوں شعروں کا سمجھنا کسی قدر نجوم کی اصطلاحات جاننے پر موقوف ہے. منجموں نے دور فلک کو بارہ حصّوں میں تقسیم کیا ہے جن میں سے ہر ایک حصّے کو بُرج کہتے ہیں اور انکے نام یہ ہیں۔ حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ،

میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو، حوت - ان میں سے ہر ایک برج کسی نہ کسی سیارے کا خانہ کہلاتا ہے یا وبال - مثلاً جدی و دلو زحل کے خانے اور شمس و قمر کے وبال ہیں اور برعکس اسکے اسد و سرطان شمس و قمر کے خانے اور زحل کے وبال ہیں اسی طرح ہر برج ایک سیارے کا خانہ اور دوسرے کا وبال ہے ثور اور میزان جنکا دوسرے شعر میں نام آیا ہے یہ دونوں زہرہ کے خانے ہیں اور ثور کے تین درجے چاند کے شرف اور میزان کے اکیس ۲۱ درجے زحل کے شرف کے مقام ہیں - شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے چاند کو اسکے شرف کے مقام (یعنی ثور) دیکھا اور زحل کو اسکے شرف کے مقام (یعنی میزان) میں دیکھا اور چونکہ ثور اور میزان زہرہ کے خانے ہیں اسلیے اس مطلب کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ میں نے ایک لولی (رنڈی) یعنی زہرہ کی دو عشرتگاہوں یعنی ثور و میزان میں دو ایسے مہمان دیکھے ہیں کہ ہر ایک دوسرے کے حال سے بیخبر اور ہر ایک اپنے حال میں خوش ہیں کہ میرے سوا کوئی دوسرا زہرہ کی عشرت گاہ میں نہیں ہے پھر دوسرے شعر میں دفع دخل مقدر کرتا ہے اور کہتا ہے اس بیان کو کسی بڑے معنی پر محمول نہ کرنا چاہیے بلکہ صرف مطلب یہ ہے کہ میں نے ماہ کو ثور میں اور زحل کو میزان میں دیکھا ہے -

رفتہ ام زاں پیش بسیر باغ و مرغاں را باغ   سر برسم خواب زیر بال پنہاں دیدہ ام

برسم خواب - یعنی جیسا کہ پرندوں کے سونے کا دستور ہے - سر زیر بال پنہاں یعنی بازو تلے سر گھسائے ہوئے -

کلک موج نکہت گل دم ز گردش تازدہ   نامۂ فیض سحر نانوشتہ عنواں دیدہ ام

موج نکہت گل کو کلک یعنی قلم قرار دیا ہے اور فیض سحر کو نامہ یعنی خط ٹھیرایا ہے کہتا ہے کہ ایسا سویرا تھا کہ پھولوں کی خوشبو کا قلم ابھی گردش میں نہیں آیا تھا

کہ میں نے فیض سحر کا مکتوب جبکہ اُسکا سرنامہ نہیں لکھا گیا تھا دیکھا۔ مطلب یہ کہ فیض سحر ابھی عام نہ ہوا تھا اور پھولوں کی خوشبو سے باغ مہکنے نہیں پایا تھا

شانۂ بادِ سحرگاہی بہ جنبش نامدہ		طرۂ سنبل ببالیں بر-پریشاں دیدہ ام

اس بیت میں بادِ سحرگاہی کو کنگھی فرض کیا ہے جسکے ملائم جھوکوں سے گویا سنبل کی زلف سلجھ جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ابھی شانۂ نسیم صبح کو جنبش نہیں ہوئی تھی اور طرہ سنبل بالین راحت پر پریشاں پڑا ہوا تھا۔

بادہ سرمستانہ می جنبید و شبنم می چکید		غنچہ را در رختِ خواب آلودہ داماں دیدہ ام

یہ اس حالت کے بعد کا بیان ہے جو پہلے دو شعروں میں بیان ہوئی ہے۔ کہتا ہے کہ ہوا رساں رساں چل رہی تھی اور شبنم ٹپک رہی تھی جسکی وجہ سے میں نے غنچے کو رختِ خواب میں آلودہ داماں دیکھا یعنی اگرچہ غنچہ ابھی دوشیزگی کی حالت میں معلوم ہوتا تھا مگر چونکہ وہ عنقریب کھلنے والا تھا اسلیئے وہ گویا اپنے رختِ خواب میں آلودہ دامن ہو چکا تھا۔

صبحِ اوّل گو بروے کس نیاورد از حیا		صبحِ ثانی را بریں ہنگامہ خنداں دیدہ ام

اب ان تمام عجائبات کی جو آخرِ شب اسکو نظر آے اُنکی قلعی کھولتا ہے اور کہتا ہے کہ صبحِ اوّل (یعنی صبح کاذب جو گویا کہ شرم و حجاب سے ایک جھلکی دکھا کر غائب ہو جاتی ہے) اگرچہ وہ حیا سے اصل بھید منہ پر نہیں لاتی مگر صبح ثانی یعنی صبح صادق کو میں نے اس تمام ہنگامے پر خندہ زن دیکھا۔ مطلب یہ کہ یہ تمام نظر فریب سیمیائی جلوے تھے جنکو محض وہم نے اختراع کیا تھا اور اسی لیے صبح صادق اُن پر خندہ زن تھی۔ اسکے بعد بند کو اس گرہ کے شعر پر ختم کرتا ہے اور کہتا ہے۔

محرمِ رازِ نہانِ روزگارم کردہ اند		تا بجز فہم گوش ننہد خلق خوارم کردہ اند

کہتا ہے کہ اگرچہ مجھکو زمانے کے پوشیدہ اسرار کا محرم بنایا ہے، مگر اسلیے کہ کوئی میری بات نہ سنے اور پوشیدہ راز ظاہر نہ ہونے پائیں مجھکو دنیا میں ذلیل و خوار کر دیا ہے

از بند سوم

روشناس چرخ در جمع اسیرانش منم   نور چشم روزن دیوار زندانش منم

کہتا ہے کہ آسمان کے مظلوم اسیروں میں اُسکا روشناس اور پہچاننے والا میں ہوں، گویا میں اُس زندان کے روزنِ دیوار کی۔ جس میں آسمان کے مظلوم قیدی اسیر ہیں۔ آنکھ کا نور ہوں

ثابت و سیار گردوں را رصد بستم بہ علم   رشتۂ تسبیح گوہر ہاے غلطانش منم

چونکہ رصد باندھنے سے اکثر ستارے منتظم ہو جاتے ہیں اسیلیے کہتا ہے کہ میں نے جو آسمان کے ثوابت و سیارات کی رصد باندھی ہے تو گویا میں اسکے گوہرہاے غلطاں (یعنی کواکب) کی تسبیح کا ڈورا ہوں جسکے سبب سے تمام ستارے مثل دانہاے تسبیح کے منتظم ہو گئے ہیں۔

نے زدانش کامیاب و نے بہ سختی تنگدل   شرمسارِ کوشش برجیس و کیوانش منم

اہل نجوم کے نزدیک برجیس یعنی مشتری علم کا افاضہ کرنے والا ہے اور کیواں یعنی زحل سختی اور مصیبت کا بھیجنے والا ہے۔ کہتا ہے کہ نہ میں علم سے کامیاب ہوں اور نہ سختی و مصیبت سے گھبرانے والا ہوں تو گویا مشتری اور زحل دونوں کی کوششیں میرے باب میں رائگاں جاتی ہیں اور اسیلیے میں ان دونوں سے شرمندہ ہوں۔

در لئیمی شہرۂ دہر از تہیدستیست چرخ   رفتہ مسکیں راز یاد و گنج پنہانش منم

کہتا ہے کہ آسمان جو لئیمی اور بخل میں مشہور ہے یہ اُسکی تہیدستی کا نتیجہ ہے کیونکہ اُسکے پاس دینے کو کچھ باقی نہیں وجہ یہ کہ اُسکا گنجینہ پنہاں میں تھا

سو وہ اپنے خزانے کو یعنی مجھکو بھول گیا ہے۔ مسکین سے مراد خود آسمان ہے جیسے اُردو میں کہتے ہیں کہ غریب اپنا خزانہ کہیں رکھکر بھول گیا۔

در غریبی خویشتن را از غصہ در دل می خلم   خوردہ ام از شستِ غم تیر کہ پیکانش منم

یعنی عالم غربت میں بسبب غم کے مَیں خود اپنے دل میں چبھتا ہوں گویا غم کی چٹکی سے وہ تیر میرے آکر لگا ہے کہ خود میں ہی اس تیر کی بھال ہوں۔

ماندہ ام تنہا بکنج از دورباشِ پاسِ وضع   خانۂ دارم کہ پندارند دربانش منم

دورباش۔ ہٹو بڑھو کی آواز کو کہتے ہیں جو نقیب امراو سلاطین کی سواری کے آگے آگے پکارتے جاتے ہیں۔ مگر شعرا اسکو اکثر مطلق روک ٹوک اور ممانعت ومزاحمت کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ کہتا ہے کہ پاس وضع مجھکو گھر کے کونے سے کہیں باہر نہیں جانے دیتا۔ پس میری اپنے گھر پر ایسی مثال ہے کہ گویا اسکا دربان میں ہی ہوں۔

پایۂ من جز بہ چشمِ من نیاید در نظر   از بلندی اخترم روشن نیاید در نظر

از بند چہارم

چوں بغیر از عمر کاں مفت است ہیچم مایہ نیست   بنو دم ہم زیاں گر چرخ کج بازد بمن

بر منش دستے تواند بود۔ زاں بالاترم   دل نبازم شیر گردوں پنجہ گر بازد بمن۔

پہلے مصرع کی تقدیر عبارت یہ ہے "من ازاں بالاترم کہ فلک را بر من دستے تواند بود" شیر گردوں سے مراد خود گردوں یا برج اسد یا مریخ۔ پنجہ یازیدن دست دراز کردن وحملہ نمودن - دل باختن بدحواس شدن۔

ہر کرا گردوں بلند آوازہ تر خواہد بدہر   نوبت شاہی دہد وانگاہ بنواز د بمن

بنوازد بمن۔ یعنی اُسکو میرے ذریعہ سے معزز کرتا ہے دوسرے شعر میں اُسکی تشریح ہے۔

پادشاہاں را سخن گفتن نہ کارِ ہر کس ست ۔۔۔ دیدہ ور شاہے کہ کارِ گفتن انداز د بمن

ور تو گوئی پادشہ را مایہ نبود ۔ بیم نیست ۔۔۔ خود بہ شاہاں مایہ بخشم گر بپرداز د بمن

آنکہ چون در ملکِ ہستی سکۂ شاہی زند ۔۔۔ سکۂ شاہی بطغرائے ید اللّٰہی زند

قولہٗ "پادشہ را مایہ نبود" اس سے یا تو یہ مراد ہے کہ سلاطینِ عہد اسقدر مایہ نہیں رکھتے کہ میرے کمال کے موافق میری قدر کریں، اور یا یہ مطلب ہے کہ بہادر شاہ مرحوم جو اُس زمانے میں مرزا کے ممدوح اور پادشاہ کے لقب سے ملقب تھے وہ گردش روزگار سے بے مایہ ہیں۔ قولہٗ "گر بپرداز د بمن" بپرداز د کا فاعل دوسری بیت میں واقع ہوا ہے یعنی آنکہ چوں در ملکِ ہستی الخ" مراد اس سے حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ ہیں جنکی منقبت میں مرزا نے یہ ترکیب بند لکھا ہے۔

قطعات

ہزار معنیِ سرجوش۔ خاص نطق من ست ۔۔۔ کز اہلِ ذوق دل۔ وگوی از عسس بردست

زر فسگان بہ یکے گر تو آوردم ر و داد ۔۔۔ مداں کہ خوبیِ آرایشِ غزل بردست

مراست ننگ و لے فخر اوست کاں بسخن ۔۔۔ بسعیِ فکرِ رسا۔ جابذاں محل بردست

مبر گمانِ توارد۔ یقین شناس کہ دُزد ۔۔۔ متاعِ من زنہاں خانۂ ازل بردست

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار ۔۔۔ ساقی و مغنی و شرابے و سرودے

زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند ۔۔۔ حق را بہ سجودے۔ و نبی را بہ درودے

اے کہ خواہی کہ بعد ازیں باشم ۔۔۔ مخلص صادق الولائے تو من

گر ترا شیوہ شاہدی بودے ۔۔۔ کردمے جان و دل فدائے تو من

خطاب بہ یکے از فلاناں فخر

ورترا پیشہ شاعری بودے — سودمے چشم دہر بہ پائے تو من
ورترا پایہ خسروی بودے — سفتمے گوہر ثنائے تو من
چوں ازیں ہانۂ۔ مرا چہ ضرور — کہ شوم ہرزہ مبتلائے تو من
است گویم۔ بہانہ چند آرم — ناصحِ مشفقم برائے تو من
بسکہ بر مال وجاہ مغروری — نیستم خوش ازیں ادائے تو من
چکنی؟ کایں فساد سیم وزر ست — وائے من! اگر بوم بجائے تو من
بتو ہرگز ندادمے زر و سیم — خواجہ! اگر بودمے خدائے تو من

خطاب بیکے از زہاد

دیدی آں بدگہر۔ و مہر دلائش بہ یزید — کہ بہ خشم آید۔ اگر زشت و پلیدش گویند
زانکہ او خود بسر ابنِ علی تیغ نہ راند — خواجہ از ننگ نخواہد کہ یزیدش گویند
گفتم البتہ کہ شبیر بداں می ارزد — کہ شہیدش نپسند و سعیدش گویند
گفت زاں رو کہ عزیزاں ہمہ مسلم بودند — نتواں کرد گوارا کہ شہیدش گویند

خطاب بیکے از فلاناں ہم

کردۂ جہدے کہ در ویرانیِ کاشانہ ام — چرخ در آرایشِ ہنگامۂ عالم نہ کرد
گر بہ ہجوت راندہ باشم نکتہ ہا بر خود مپیچ — زانکہ حرفے۔ زانچہ گفتم۔ خاطر خرم نہ کرد
بیتے از استاد دیدم ذوقِ بخشید لیک — ہیچ در تسکیں نیفزود و ز وحشت کم نہ کرد
ہجو تو نا قابلے در صلبِ آدم دیدہ بود — زاں سبب ابلیسِ ملعوں سجدہ بر آدم نہ کرد
حاش للہ! بودنت در صلبِ آدم تہمت است — پیش ہر کس گفتم ایں اندیشہ باور ہم نہ کرد

آیا زیاں زدہ غالب کہ از حدیقۂ بخت (شوخی) — نمی رسد ز تو خار و خسے ز ہیچ سبیل
چو لازم ست کہ پروردگار تا دمِ مرگ — بود بہ رزق ضروریہ عباد کفیل

چراست اینکہ نداری زراز سیاہ و سفید — چراست اینکہ نیابی براز کثیر و قلیل
فتادہ در سرایں رشتہ عقدۂ - ورنہ — نہ مردۂ تو - و نے رازق العباد بخیل
زچند سال بمرگِ تو و تباہیِ رزق — شدست حکم - خود از پیشگاہِ رب جلیل
فرشتہ کہ وکیل ست بر خزائنِ رزق — نکرد ہیچ توقف[1] بہ رزق در تعطیل
دوم فرشتہ[2] کہ یادش بخیر مقروں باد — روا نداشت در اہلاک شیوۂ تعجیل
لطیفۂ کنم از قول شاعرے تضمین — کہ در لطیفہ مراد را کسے نبودہ عدیل
اگر خدائے بداند کہ زندۂ تو ہنوز — ہزار مشت زند بر دہان عزرائیل

بہ آدم زن - بشیطاں طوق لعنت — سپردند از رہِ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوقِ آدم — گراں تر آمد از طوق عزازیل

اب ہم مرزا کی ایک نظم کا مقابلہ دورۂ اکبری کے ایک نہایت ممتاز اور نامور شاعر کے کلام کے ساتھ کرتے ہیں - مرزا کے قصائد و قطعات و مسمطات وغیرہ میں صرف ایک نظم ایسی ملی ہے جسکا مولانا نظیریِ نیشاپوری کی نظم سے بخوبی مقابلہ کیا جاسکتا ہے - نظیری نے جلال الدین اکبر کے بیٹے سلطان مراد کا جو عنفوان شباب میں گزر گیا تھا ایک مرثیہ ترکیب بند میں لکھا ہے جو اسکے کلیات میں موجود ہے اور چونکہ نظیری کو اسکے ساتھ نہایت خصوصیت تھی اور اُسکی شان میں نظیری نے متعدد قصیدے لکھے ہیں اور گراں بہا صلے انکے جلدو میں پائے ہیں اسلیے معلوم ہوتا ہے کہ نظیری نے اُسکا مرثیہ کمال صدق دل سے لکھا ہے -

مرزا نے بھی مرحوم بہادر شاہ کے بیٹے فرخندہ شاہ کا - جو عین نشو و نما کے

---

[1] یعنے در تعطیل بر رزق توقف نکرد ۱۲ [2] یعنی ملک الموت ۱۲

زمانے میں فوت ہوگیا تھا۔ مرثیہ اسی بحر کے ترکیب بند میں لکھا ہے جو مرزا کے کلیات میں موجود ہے۔ چونکہ دونوں ترکیب بند تیموری شہزادوں کے مرثیے میں لکھے گئے ہیں اور دونوں کا وزن متحد ہے اور ہر ایک میں سات سات بند اور ہر ایک بند آٹھ آٹھ بیت کا ہے۔ اسلیے ہم یہ دونوں نظمیں مقابل میں دیتے ہیں تاکہ ہر شخص جو فارسی شاعری کا مذاق صحیح رکھتا ہے دونوں میں بآسانی موازنہ کر سکے۔ مگر افسوس کہ کلیات نظیری کا کوئی صحیح نسخہ ہمکو دستیاب نہیں ہوا۔ لہذا جیسا کچھ لکھا ہوا پایا نقل کر دیا گیا ہے چنانچہ پہلے بند کے بعض شعر بالکل سمجھ میں نہیں آئے جن کی نسبت ظن غالب یہ ہے کہ اُن میں کتابت کی غلطی رہ گئی ہے۔

غالب	نظیری
اے دل بچشم زخم حوادث نگار شو	لب خوش نگشتہ خندہ رہ چنگ میزند
اے چشم از تراوش دل اشکبار شو	در بزم مرگ خندہ بر آہنگ میزند
اے خوں بدیدہ در دگداز جگر فرست	ہرگز زمانہ جامۂ ماتم بروں نکرد
اے دم بسینہ دود چراغِ مزار شو	تا رفتہ شب بدامنِ شب چنگ میزند
اے لب بنوحہ نالۂ جانکاہ ساز دہ	وقتِ گزشتہ را بہ تاسف زپے مرو
اے سر بغصہ خاکِ سرِ رہگذار شو	کاینجا نشاطِ گامِ بفرسنگ میزند
اے خاک اچرخ گر نتواں زد۔ زجا در آے	ایں دہر روز کور۔ کش ایام خصم باد
اے چرخ اخاک گر نتواں شد۔ غبار شو	دستِ طمع بہ گیسوے شبرنگ میزند
اے نو بہار چوں تنِ بسمل بخوں بغلط	دستِ اجل بہ تیغِ سیاست بریدہ باد
اے روزگار چوں شبِ بے ماہ تار شو	از خاک مہر بر دہنِ تنگ میزند
اے ماہتاب روی بہ سیلی کبود کن	آرائشِ جنازۂ و دستار میکند

اے آفتاب داغِ دلِ روزگار شو
اے فتنہ بادِ صبح وزید اینقدر مخسپ
اے رستخیز وقت رسید آشکار شو
آہ این چہ سیل بود کہ مارا ز سر گذشت
تنہا ز سر نگو کہ ز دیوار و در گذشت

گوئی کہ گل برافسرد او رنگ میزند
ایں چرخ شوخ دیدہ عجب بے عدالت ست
بربامِ عشرت کہ ؟ بہ بیں سنگ میزند
فرزند شاہ **اکبر** والا نژاد مرد
شیون برآورید کہ سلطاں مراد مرد

مرزا کے بند میں الفاظ بہت پرشوکت وشاندار واقع ہوے ہیں اور کوئی شعر صنعت شاعری اور شاعرانہ نزاکت سے خالی نہیں ہے مگر واقع کی عظمت جسقدر کہ بیان ہونی چاہیے تھی اس سے بمراتب زیادہ ظاہر کی گئی ہے بخلاف **نظیری** کے کہ اسکا بیان اگرچہ روکھا پھیکا معلوم ہوتا ہے مگر متانت اور اعتدال کا سررشتہ اُس نے کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

بند دوم

غالب

بگذر کہ بر من وتو جفا کرد روزگار
با پادشاہ عہد جفا کرد روزگار
شاہِ سخن سرائے سخنور نواز را
در بزمِ عیش نوحہ سرا کرد روزگار
شاخے کہ بود موسمِ آتش کہ بر دہد
از نخلِ عمرِ شاہ جدا کرد روزگار
مرگ اینچنیں رُخ و تنِ نازک ندیدہ بود
کامِ اجل بہ ہدیہ روا کرد روزگار
شہزادہ خردسال و بود روزگار پیر

نظیری

آفاق پر دریغ وجہاں پر ندامت ست
ایں روزِ مرگ نیست کہ روزِ قیامت ست
حلقے پر اضطراب - چہ جائے تمکن ست
دہرے پر انقلاب چہ جای اقامت ست
ایں ماتمِ کسے ست کہ از گریہ تا بہ حشر
بر جیبِ صبح و دامنِ شبہا علامت ست
خوں میکند بجلوہ دل خلق - گوئیا
نخلِ جنازہ رستہ ازاں نخلِ قامت ست
ہر کس[1] چنیں جمال در آرد بحشر گاہ

---

[1] مبتدا۔

شوخی بشاہزادہ چسرا کرد روزگار
فرزندِ پادشہ نشناسد معانقہ[عه]
آغوشِ گور بہرچہ واکرد روزگار
اے آں کساں کہ خاکِ رہِ شہریار را
توجیہ آبروے شما کرد روزگار
ہرچند بے اجل نتواں ہیچ گاہ مُرد
آتش بخود زنید کہ فرخندہ شاہ مُرد

رضواں گرش بہشت دہد۔ درغرامت ست[له]
دل از نوید صحبت او بزمِ سور بود
اکنوں سراے ماتم وکوی ملامت ست
یاراں! عجب شکاری کہ از دست دادہ ایم
بر سر زنید دست کہ وقتِ ندامت ست
شہباز ما پریدہ رہ آسماں گرفت
مرغے نرفتہ است کہ دیگر تواں گرفت

یہ دونوں بند سادگی اور مرثیت میں تقریباً برابر سرابر ہیں۔ البتہ نظیری کے بند کا چوتھا شعر جس رتبہ کا ہے ایسا کوئی شعر غالب کے بند میں نہیں ہے۔

بند سوم

غالب

اے قوم! خویش را بشکیب امتحاں کنید
ایں کار را بشیوۂ کار آگہاں کنید
طفل ست شاہزادہ ودر رہ خطر بسی ست
منعش ز عزمِ رہروِی آنجہاں کنید
از میوہ وگل انچہ دلش خواہد آں دہید
از حیلہ انچہ رای شما باشد آں کنید
ہر حرف دلنشیں کہ بگوئید و نشنود
آں گفتہ را بعربدہ خاطر نشاں کنید
در خود ز رفتنش نتوانید باز داشت

نظیری

اے بزم تیرہ! ارخ چوں ارغواں کجاست
وے رزم درہمی! شہِ گیتی ستاں کجاست
شوق سجود وحرمتِ تعظیم کمتر ست
آں ناز صدر وسرکشیِ آستاں کجاست
امروز غم بمسند شاہی نشستہ است
پہلونشین خسروِ ہندوستاں کجاست
آں حکمہا کہ بود از و آب کار کو؟
واں کارہا کہ آمد از وبوی جاں کجاست
دلہا پر از غم ست۔ عزیزاں! چہ واقع ست

له خبر، عه یہ اشارہ ہے اس دستور کی طرف کہ خاندان تیموریہ کے سلاطین اور شاہزادے کسی سے معانقہ نہیں کرتے تھے۔

بیخود شوید جامہ درید و فغاں کنید
گیرید دشنہ در کف و ہم برجگر زنید
تا سینہ راز دیدہ فزوں خونچکاں کنید
زنہار پیش شاہ نگوئید و بیخبر
تابوت را بجانبِ مرقد رواں کنید
اے اہل شہر مدفنِ ایں دودماں کجاست؟
حاکم بفرق۔ خوابگہِ خسرواں کجاست؟

یک دل شگفتہ نیست۔ خوشی درجہاں کجاست
ہرجا بسوگ مرگ گروہے نشستہ اند
زیں غم کہ عام گشت ندانم اماں کجاست
برگ و شگوفہ ریخت۔ ثمر از کجا خورم
بشکست شاخ و برگ۔ مرا آشیاں کجاست
کس را سرودِ در خور ایں تعزیت نہ بود
پیدا کنید کاوّلِ ایں داستاں کجاست
خلقے بشیون اند و نگویند جاں چیست
صبر سخن شنیدن و تابِ بیاں کجاست
آفاق در مصیبتِ او ممتحن شدہ
ایں مرگ باعث الم مرد و زن شدہ

اس بند میں نظیری نے برخلاف پہلے بندوں کے دو شعر زیادہ کردیے ہیں۔ نظیری کا بند بلاغت میں شاید مرزا کے بند سے کسی قدر فائق ہو مگر مرزا کے بین نہایت دلخراش ہیں۔ متوفی کی نسبت یہ کہنا کہ وہ کم عمر اور ناتجربہ کار لڑکا ہے اور راہ میں بہت خطرے ہیں اسکو جانے سے روکو اور وہ جو کچھ مانگے اسکو دو اور جو بہانہ مناسب سمجھو وہ کرو اور اگر سیدھی طرح کہنا نہ مانے تو اسکو سختی سے سمجھاؤ اور اگر یوں بھی کام نہ نکلے تو روؤ اور پیٹو اور کپڑے پھاڑو اور چناں کرو اور چنیں کرو اور بادشاہ کو اطلاع کیے بغیر تابوت مرقد میں لیجاؤ یہ تمام پیرائے بیان کے نہایت موثر اور دلخراش ہیں اور گرہ کا شعر سارے بند کا نچوڑ ہے۔

بند چہارم

غالب	نظیری
زاں سبزہ خط کہ بر رخِ او نادمیدہ ماند	غم خاست - در پیالہ مے از ساغر افگنید
گردے بدل نشست و غبارے بدیدہ ماند	شد بزم تیرہ - پردہ ازاں رخ برافگنید
بستانیاں بماتمِ شہزادہ بیخود اند	شمعے کہ دہر روشن ازو بود - مردہ است
زیں رو بود کہ پیرہنِ گل دریدہ ماند	پروانہ را بریدہ بہ خاکستر افگنید
خوں گشت در دل و جگر دوستاں فتاد	در خانہ اش زحلقۂ ماتم خرام نیست
آں بادہ ہائے ناب کزو ناکشیدہ ماند	ایں حلقہ را زصحنِ سرا بر در افگنید
در مدحِ شاہزادہ سخن ہائے دلپذیر	ریحانِ جلوہ یاسمنِ عشوہ ریختہ
دردا کہ ہم نگفتہ و ہم ناشنیدہ ماند	چینند و ہم بر آں قدِ جاں پرور افگنید
در وادیِ عدم نہ تواں رفت باحشم	بالیں زتابِ کاکلش آشفتگی کشید
ماند انچہ بود و صاحبِ عالم جریدہ ماند	کوتہ کنید عربدہ در کشور افگنید
زاں گلبنے کہ صرصرِ مرگش زپا فگند	رفت آں سرے کہ تاج باو سرفراز بود
خارے بیادگار بدلہا خلیدہ ماند	بر سر کنید خاک و کلاہ از سر افگنید
اخلاقِ شاہزادہ بود دلنشین خلق	پوشیدہ چند جامۂ نیلی زجورِ چرخ
بوے ازاں شگفتہ گلِ نو رسیدہ ماند	بر آفتاب جامۂ نیلوفر افگنید
آں سرو سایہ دار کہ بارش نبود - کو؟	خیزند تا باں سرِ تابوت دم زنیم
واں نو گلِ شگفتہ کہ خارش نبود - کو؟	عرضے کنیم و کار و داعش بہم زنیم

اس بند میں مرزا کا بیان صفائی اور سادگی اور لطافت میں نظیری کے بیان سے سبقت لے گیا ہے جیساکہ اصحاب ذوق پر پوشیدہ نہیں ہے۔

بند پنجم

غالب

دستے ست ای سپہر ترا در ستمگری
بارے بزم زجور تو پیش کہ داوری
نیرنگ ساز چرخ کہ بیداد خوی اوست
با گل کند سمومی و با شاخ صرصری
وا غم ز روزگار کہ شہزادہ بر نخورد
از خوبی و جوانی و فرخندہ گوہری
حیف ست مردنش کہ در ایامِ کودکی
بود اوستادِ قاعدۂ بندہ پروری
شہ در دہ و دو سالگیش کردہ کد خدا
با فرِ خسروانی و فرتابِ قیصری
ناگاہ روزنامۂ عمرش دریدہ شد
امضا پذیر ناشدہ توقیع شوہری
جز نو عروس صاحبِ عالم نیا فتند
دوشیزۂ کہ بیوہ کنندش بد ختری
زیبائی و جوانیِ فرخندہ شاہ حیف
آں نونہال سرو قدِ کجکلاہ حیف

نظیری

رفتی و کارہا ہمہ درہم گذاشتی
آشفتگی بہ مردم عالم گذاشتی
جانہائے غم رسیدہ و دلہائے بیقرار
در پیچ و تاب طرۂ پرخم گذاشتی
از تو غبار بر دل بیگانۂ نہ بود
بہر چہ بر دلِ پدر ایں غم گزاشتی
روز و شبت برسم جنیبت ستادہ بود
در زینِ خویش اشہب وادہم گذاشتی
شمع مزار و خشتِ لحد ساختی قبول
رخسارِ تخت و طرۂ پرچم گذاشتی
ہمت ترا بہ ملک نیا ورد سر فرو
عالم بہر کہ خواستے مسلّم گذاشتی
حرمت نگاہداشتی و جائے خویش را
بہر برادرانِ مقدّم گذاشتی
خوں ست بے تو گرہمہ دل چوں دلِ من ست
ہر دل کہ بے تو خوں نشود سنگ و آہن ست

اگرچہ یہ دونوں بند اپنی اپنی جگہ نہایت بلیغ ہیں مگر متانت وجزالت کے لحاظ سے نظیری کا پلہ غالب معلوم ہوتا ہے

؎ علم ۱۲ ؎ یعنی بجہانگیر ۱۲

بند ششم

غالب

اے رہ نوردِ عالمِ بالا چگونۂ
ما بے تو در ہمیم تو بے ما چگونۂ
از سایہ در غمِ تو سیہ پوش شد ہما
اے خفتہ در نشیمن عنقا چگونۂ
زاں پس کہ با تو آب و ہوای جہاں نساخت
در روضۂ جناں بہ تماشا چگونۂ
با گلرخانِ دہر وفائے نداشتی
با حوریانِ آئنہ سیما چگونۂ
ما بیخوداں بحلقۂ ماتم نشستہ ایم
از خویشتن بگوے کہ تنہا چگونۂ
بے مطرب و ندیم و غلامانِ خرد سال
بے باغ و قلعۂ ولب دریا چگونۂ
بعد از تو شاہ خیل ترا برقرار داشت
اینجا[1] عزیز بودۂ آنجا چگونۂ
اے بعد مرگ راتبہ خوارِ تو عالمے
پروانۂ چراغِ مزارِ تو عالمے

نظیری

اے شاہِ مصر دور ز کنعاں چگونۂ
اے یوسف از جدائی اخواں چگونۂ
ہرگاہ جلوہ کردہ تقاضا چہ می کنی
با حسن شوخ در تہِ زنداں چگونۂ
اسکندر از غمِ تو بظلمت نشستہ است
در زیرِ گِل تو چشمۂ حیواں چگونۂ
اے پارۂ زجاں و جگر گوشۂ پدر
گشتہ جدا ز دیدۂ وداماں چگونۂ
ما بارے از فراقِ تو در خون دیدہ ایم
تو درمیان روضۂ رضواں چگونۂ
آواز نوحہ طبع و دل آشفتہ می کند
اے بخت خوش بخواب پریشاں چگونۂ
اینجات کار دفتر و دیواں حوالہ بود
آنجا بگو ز پرسشِ دیواں چگونۂ
قلزم سبک ثبات ترا آنجا ز شبنم ست
در بحرِ کل تو قطرۂ باراں چگونۂ
بشنو کہ بانگ بہرِ تو بر حشر می زنند
تا بنگریم در صفِ دوراں چگونۂ

---

[1] خاندان تیموریہ میں دستور تھا کہ خاص بادشاہ کی اولاد میں سے جب کوئی شہزادہ مرجاتا تھا تو اسکی تنخواہ اور نوکر چاکر اور اسکی سرکار بدستور بنی رہتی تھی؟

نظیری

چوں کار رفتگانِ دگر نیست کار تو
محشر شتاب میکند از انتظار تو

اس بند میں نظیری کے ہاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ہیں نظیری کا یہ بند اُسکے تمام ترکیب بند کی جان ہے اگرچہ مرزا کے یہاں اس بند میں نظیری کے برابر بلند شعر نہیں ہیں مگر مرثیت کا رنگ نظیری سے بڑھکر پایا جاتا ہے

بند ہفتم

غالب

گفتار را بنوحہ گری چیدہ ام اساس
در نوحہ شاعری مکنید از من التماس
در پردہ سنجی از دم خویشم رسد گزند
در رہروی ز سایۂ خویشم بود ہراس
من میہمان و چرخ سیہ کاسہ میزبان
دُردی خورِ بلا کم و تلخابہ نوشِ یاس
باقی نماندہ اشک چہ گریم بہ ہای ہای
از کار رفتہ دست۔ چہ برتن درم لباس
سر حلقۂ پلاس نشینان ماتمم
اندوہ ہمدمان شہ از خود کنم قیاس
چوں بود بزم ماتم شہزادہ بے خروش
من دم زدم زتلخ نوائی بریں پلاس
از نوحہ عرضِ لطفِ سخن میتواں گرفت

نظیری

فردا کلاہِ بادشہی بر سرِ تو باد
رسم العمل بروز جزا دفترِ تو باد
فردا کہ روز حشر برانگیزی از زمین
دوش و کنارِ حور و پری محشرِ تو باد
روزی کہ کارہا ہمہ موقوفِ حق شود
جبریل کارساز و خدا یاورِ تو باد
وقت سوال گوش ولب منکر و نکیر
پُر از قبول نکتۂ جاں پرورِ تو باد
آں حلہ کہ آدم از ذل وقدر یافت
گر رحمتِ ذوکون بود در برِ تو باد
مجموعۂ عمل چو بہ محشر در آورے
کارِ تو راست ہمچو خطِ مسطرِ تو باد
مغز از بخور روی مزارت معطر ست

غالب سخن سرای شہنشہ سخن شناس
یارب جہاں ز فیض تو با برگ و ساز باد
عمر ابوظفر شہ غازی دراز باد

بوے بہشت ہم نفس مجمر تو باد
آدم بہاے تو نشناسد دریں جہاں
تسبیح قدس در دل کان گوہر تو باد
نخل ریاض ملک کہ باب[1] عزیز تست
سرسبز از دعاے ثناگستر تو باد
کارش بہ حسن شاہد فرخندگی بود
ہر چند بر تو مرگ - برد زندگی بود

اس بند میں بھی نظیری کے ہاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ہیں افسوس ہے کہ اسوقت کتاب کے چھپنے کی جلدی ہیں ہمکو اس قدر مہلت نہیں ملی کہ کلیات نظیری کے صحیح نسخے کے ملنے کا انتظار کیا جاتا اور بعد کامل اطمینان کے اُسکے ترکیب بند میں جو اشعار حل طلب تھے اُنکی شرح کیجاتی جس سے ناظرین کو ترکیب بندوں میں موازنہ کرنے کا زیادہ موقع ملتا - لیکن ہمارا ارادہ ہے کہ اس کتاب کے دوبارہ چھپنے کی نوبت آئی تو بشرط زندگی اس نقصان کی تلافی کیجائیگی -

اب ہمکو مرزا کی کلیات نظم فارسی میں سے صرف مثنوی کا نمونہ دکھانا باقی رہ گیا ہے - اگرچہ پہلے حصے میں کہیں کہیں مختلف مثنویوں کے کچھ کچھ اشعار مقتضاے مقام کے موافق نقل ہو چکے ہیں مگر نمونے کے طور پر یہاں بھی ایک دو مقام کسی مثنوی کا دکھانا مناسب معلوم ہوتا ہے -

مرزا نے کوئی مبسوط مثنوی نہیں لکھی، اُنکے کلیات میں گیارہ مثنویاں ہیں جن میں سب سے بڑی مثنوی ۹۲۸ بیت کی ہے اس مثنوی میں جسکا نام مرزا

---

[1] یعنی نور عزیز تست

نے ابرِ گہربار رکھا تھا۔ انکا ارادہ آنحضرت صلعم کے غزوات بیان کرنے کا تھا مگر چونکہ یہ انکی آخری تصنیف تھی اور اخیر عمر میں طرح طرح کے عوائق اور موانع پیش آئے اس وجہ سے غزوات کے شروع کرنے کی نوبت نہیں پہنچی صرف دیباچے کے چند عنوان لکھنے پائے تھے کہ مکروہات روزگار نے گھیر لیا۔ مگر یہ مثنوی انکی تمام مثنویوں میں ممتاز ہے اور ہم اسی مثنوی کے کچھ اشعار توحید میں سے اور کچھ اشعار مناجات میں سے جو نہایت آزادانہ اور رندانہ طور پر لکھی ہے اور کچھ نعت میں سے اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

از توحید

سپاسے کزو نامہ نامی شود	سخن در گزارش گرامی شود
سپاسے کہ شوریدگانِ الست	دہندش بہ بانگِ قلم دل ز دست
سپاسے بہ پوزش در آمیختہ	ز دل جستہ و با دل آویختہ
سپاسے دو لی سوز کثرت رُبائے	سپاسے دل افروز بینش فزائے
خدا را سزد کز درول پروری	بدیں شیوہ بخشد شناساوری
خدائے کہ زاں گونہ روزی دہد	کہ ہم روزی و ہم دو روزی دہد

❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊

رضا جوئے ہر دل کہ درویش ہست	ہوا خواہ ہر رخ کہ گردیش ہست
نرنجد ز انبوہ خواہندگان	نیاید ستوہ از پناہندگان
خرد جنس ہستی فروشندگاں	دہد مزد بیہودہ کوشندگان
رُباید دل اما ز دل دادگان	کشد ناز لیکن ز افتادگان
زبادے کہ بر دل وزد در نہفت	زباں را بہ پیدا در آرد بگفت
نگہ را کہ بیروں نباشد ز چشم	دہد بال پیدائی مہر و خشم

دل و دست با ہمد گر دوختہ　　　دریں کیسہ کردار اندوختہ
یعنی درکیسہ کہ از ہم دوختنِ دل دوست بہم رسیدہ۔ کردارِ مردم اندوختہ است۔
روان و خرد با ہم آمیختہ　　　ازیں پردہ گفتار انگیختہ
نہ زیں سوگہر ہا شمردن تواں　　　نہ راہ اندریں پردہ بردن تواں
بہ نیروے نہ چرخ برہم زدن　　　نشاید زدانست او دم زدن
یعنی بقوتے کہ ازاں نہ چرخ را برہم ملیتواں زد از معرفت آلہی دم نہ می تواں زد
گروہے بہ بندِ گہر یافتن　　　فرو بستہ دل در زمیں کافتن
یکے را دم تیشہ بر کان نخورد　　　یکے رہ بہ نایاب گوہر نہ برد
خرد کز جہانے ست پیشش خبر　　　نباشد ز عنوان خویشش خبر
نہ بیند جز ایں ہیچ بینندۂ　　　کہ مارا بود آفرینندۂ
نگارندۂ پیکر آب و گل　　　شمارندۂ گوہر جان و دل
بگردش در آرندۂ نہ سپہر　　　بہ گردوں بر آرندہ ماہ و مہر
رواں را بدانست سرمایہ ساز　　　زباں را بگفتار پیرایہ ساز
بہ شاہی نشانندۂ خسرواں　　　ز رہزن رہانندۂ رہرواں
بدانش بہ اندیش فرزانگاں　　　بہ مستی نگہدارِ دیوانگاں
جگر را زخونابہ آشام دہ　　　نفس را بہ بیتابی آرام دہ
شناسندگاں را بخود رہنماے　　　ہراسندگاں را غم از دل رباے
نفسہا بسوداے او نالہ خیز　　　جگرہا بہ صحراے او ریز ریز
رگِ ابر را اشکباری از وست　　　دمِ برق را بیقراری از وست
زباںہاے خاموش گویاے او　　　نہاں ہاے اندیشہ پیداے او
خرد را کہ جوید شناسائیش　　　نگہ خیرہ در برق پیدائیش

دوئی بے کفن مردۂ در رہش　　خودی داد گر شحنۂ درگہش

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

زہے ہستی محض و عینِ وجود　　کہ نازد بہ یکتائیش ہست و بود
زشاخابہ کز قلزمے سر دہد　　بہر تشنہ آشامِ دیگر دہد
بیک بادہ بخشد زپیمانۂ　　بہر ذرّہ رقصے جدا گانۂ
جہانے زطوفان بغرقاب در　　ہنوزش ہماں چین بگرداب در
گروہے زمستی بہ غوغا دروں　　ہنوزش ہماں می بہ مینا دروں
اسیرش زبندے کہ برپای اوست　　شناسد کہ بر تختہ چیں جای اوست
شہیدش بخویش از طرب بہرہ مند　　بجز چشم زخمش نباشد گزند

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

بہر لب کہ جوئی نوائے از وست　　بہر سر کہ بینی ہوائے از وست
اگر دیو سار[1] یست بیہوش و ہنگ　　، کہ ہموارہ پیکر تراشد ز سنگ
بہ بت سجدہ زاں رو روا داشتہ　　کہ بت را خداوند پنداشتہ
دگر خیرہ چشمے بت نیر[2] پرست　　بہ دُردے از جام اندیشہ مست
بمہرش ازاں راہ جنبیدہ مہر　　گزیں روزنش دوست بنمودہ چہر
زتاری درونانِ اہر یمنی　　گروہے بود کز خرد دشمنی
زبس دادِ ناآشنائی دہند　　بہ آتش نشان خدائی دہند
بہ تن ہا بر آذر گرایش کناں　　بدلہا خدا را نیایش کناں
گروہے سراسیمہ در دشت و کوئی　　خداوند جوے و خداوند گوی
زرہے کہ خود را براں بستہ اند　　بیزداں پرستی میاں بستہ اند

---

[1] دیو سار یعنی گمراہ ۱۲　[2] یعنی بخورشید ۱۲

زمهرے کہ نیچو است در دل بود
پرستند حق گر بہ باطل بود

نظرگاهِ جمعے پریشاں یکے ست
پرستندہ انبوه و یزداں یکی ست

کدامی کشش کاں ازاں سوی نیست
بد و نیک را جز بوے روی نیست

جہاں چیست؟ آئینۂ آگہی
قضاے نظرگاهِ وجہ اللّٰہی

بہر سو کہ رو آوری سوی اوست؟
خود آں رو کہ آوردۂ روی اوست

از مناجات

بروزے کہ مردم شوند انجمن
شود تازه پیوند جانہا بہ تن

رواں را بہ نیکی نوازندگان
بہ سرمایۂ خویش نازندگاں

گہرہاے شہوارِ پیش آورند
فرو ہید کردارِ پیش آورند

زنور یکه ریزند خرمن کنند
جہاں را بخود چشم روشن کنند

بہ ہنگامہ با ایں جگر گوشگاں
در آیند مشتے جگر توشگاں

زحسرت بدل برده دنداں فرو
زخجلت سر اندر گریباں فرو

دراں حلقہ من باشم و سینۂ
زغم ہاے ایامِ گنجینۂ

در آب و در آتش بسر بردۂ
زدشواریِ زیستن مردۂ

تن از سایۂ خود بہ بیم اندروں
دل از غم بہ پہلو و نیم اندروں

زناسازی و ناتوانی بہم
دم اندر کشاکش زپیوندِ دم

زبس تیرگیہاے روزِ سیاه
نگہ خورده آسیب دوش از نگاه

بنجشاے بر ناکسی ہاے من
تہیدست درمانده ام واے من

بدوشِ ترازو منہ بارِ من
نسنجیده بگذار کردارِ من

بکردار سنجی بیفزاے رنج
گراں باری درد عمرم بسنج

١ پستہ یده ۱۲ ٢ یعنی عزیزاں ۱۲ ٣ یعنی گرده ازجگر خوراگاں ۱۲ ٤ میزان اعمال ۱۲

که من با خود از هرچه سنجد خیال　　ندارم بغیر از نشانِ جلال
اگر دیگراں را بود گفت و کرد　　مرا مایۂ عمر رنج ست و درد
چه پرسی چو آں رنج و درد از تو بود　　غمے تازه در بهر نور و از تو بود
فرو هل که حسرت خمیرِ من ست　　دم سرد من زمهریرِ من ست
مبادا به گیتی چو من هیچ کس　　جحیمی دل زمهریری نفس
به پرسش مرا در رهم افسرده گیر　　پرِ کاه را صرصرے بُرده گیر
پس آنگه بدوزخ فرستاده داں　　در آتش خس از باد افتاده داں

پرسش سے مراد باز پرسِ قیامت ہے کہتا ہے کہ مجھے باز پرس سے مستثنیٰ رکھ اور یہ سمجھ لے کہ مجھ سے باز پرس ہو چکی اور ایک پرِ کاہ کو بادِ صرصر اُڑا لے گئی اور یہ فرض کر لے کہ مَیں دوزخ میں بھیجا جا چکا اور ہوا سے ایک تنکا دہکتی آگ میں گر چکا۔

وگر همچنیں ست فرجام کار　　کہ می باید از کرده راندن شمار

یعنی اگر انجام کار یہی ہے کہ اعمال کی باز پرس ہونی ضرور ہے تو

مرا نیز یارائے گفتار ده　　چو گویم بداں گفته زنهار[1] ده
دریں خستگی پوزش از من مجوی　　بود بندهٔ خسته گستاخ گوے

یعنی اس خستگی اور مصیبت کی حالت میں جو کچھ میری زبان سے نکل جائے اُس پر مجھ سے معذرت چاہنا کیونکہ خستہ و مصیبت زدہ غلام گستاخ گو اور بیباک ہوتا ہے۔

دل از غصه خوں شد نهفتن چه سود　　چو ناگفته دانی نه گفتن چه سود
زباں گرچه من دارم اما ز تست　　بتست ارچه گفتارم اما ز تست

---

[1] پناہ ۱۲

ہمانا توانی کہ کافر نیم — پرستار خورشید و آذر نیم
نکشتم کسے را بہ اہریمنی — نبردم زکس مایہ در رہزنی
مگر مے کہ آتش بگورم از وست — بہنگامہ پرواز مورم از وست

یعنی صرف مجھ میں ایک عیب ہے کہ میں شراب پیتا ہوں اور اُسی سے میری زندگی ہے اس مطلب کو اس طرح ادا کرنا کہ "آتش بگورم از وست" اور "پرواز مورم از وست" منتہائے بلاغت ہے نشۂ شراب سے جو عارضی نشاط اور اُمنگ پیدا ہو جاتی ہے اُسکو پرواز مور سے بہتر کسی استعارے میں ادا نہیں کیا جا سکتا - کیونکہ جس طرح چیونٹی کی پرواز اسکی موت کی علامت ہے اسی طرح نشہ شراب کا عارضی نشاط آخر کار مورثِ ہلاکت ہوتا ہے۔

من اندوہگین و مے اندہ رُبا — چہ می کردم اے بندہ پرور خدا
حساب مے و رامش[1] و رنگ و بوے — زجمشید و بہرام و پرویز جوے
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند — دلِ دشمن و چشم بد سوختند
نہ از من کہ از تاب من گاہ گاہ — بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستاں سرائے نہ میخانۂ — نہ دستاں[2] سرائے نہ جانانۂ
نہ رقص پری پیکراں بر بساط — نہ غوغائے رامشگراں[3] در بساط
بسا روزگاراں بہ دلدادگی — بسا نو بہاراں بہ بے بادگی
بسا روز باراں و شبہائے ماہ — کہ بودہ است بے مے بچشم سیاہ
افق ہا پُر از ابرِ بہمن تہی — سفالینہ جام من از مے تہی
بہاراں! و من در غمِ برگ و ساز — در خانہ از بے نوائی[4] فراز
جہاں از گل و لالہ پُر بوی و رنگ — من و حجرۂ و دامنی زیر سنگ

---

[1] نغمہ ۱۲ [2] مطرب ۱۲ [3] مطرباں ۱۲ [4] بند ۱۲۔

دمِ عیش جز رقصِ بسمل نہ بود
بہ اندازۂ خواہشِ دل نہ بود

اگر تافتم رشتہ - گوہر شکست
وگر یافتم بادہ - ساغر شکست

چہ خواہی ز ذوقِ مے آلودِ من
ببیں جسم خمیازہ فرسودِ من

بنا سازگاری ز ہمسائیگاں
بہ سرمایہ جوئی ز بے مائیگاں

سر از منتِ ناکساں زیر خاک
لب از خاکبوسِ خساں چاک چاک

بہ گیتی درم بینوا داشتی
دلم را اسیرِ ہوا داشتی

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد
بہر بار زر پیل بارم دہد

کہ چوں پیل زانجا بر انگیزمے
زرش بر گدایاں فرو ریزمے

ز نازک نگارے کہ نازش کشم
بہر بوسہ زلفِ درازش کشم

بدیں عمرِ ناخوش کہ من داشتم
ز جاں خار در پیرہن داشتم

چو دل زیں ہوسہا بجوش آیدے
ز دل بانگِ خونم بگوش آیدے

ہنوزم ہماں دل بجوش اندر است
ز دل بانگِ خونم بگوش اندر است

چو آں نامرادی بہ یاد آیدم
بہ فردوس ہم دل نیاسایدم

دلے را کہ کمتر شکیبد بہ باغ
در آتش چہ سوزی بسوزندہ داغ

صبوحی خورم گر شرابِ طہور
کجا زہرۂ صبح و جامِ بلور

دمِ شب رویہائے مستانہ کو
بہنگامہ غوغائے مستانہ کو

دراں پاک میخانۂ بے خروش
چہ گنجائی شورشِ نای و نوش

سیہ مستیِ ابر و باراں کجا
خزاں چوں نباشد بہاراں کجا

اگر حور در دل خیالش کہ چہ
غمِ ہجر ذوقِ وصالش کہ چہ

چہ منت نہد ناشناسا زگار
چہ لذت دہد وصلِ بے انتظار

گریزد دمِ بوسہ - انیش کجا
فریبد بہ سوگند - دینش کجا

بُرد حکم ونبود لبش تلخ گوے — دہد کام ونبود دلش کام جوے
نظر بازی وذوق دیدار کو — بہ فردوس روزن بدیوار کو
نہ چشم آرزومند دلالۂ — نہ دل تشنۂ ماہ پر کالۂ
ازینہا کہ پیوستہ میخواست دل — ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل
چو پرسش رگے را بکاود زدل — دو صد دجلہ خونم تراود زدل
بہر جرم کز روے دفتر رسد — زمن حسرتے در برابر رسد
بفرماے کایں داوری چوں بود — کہ از جرم من حسرت افزوں بود
ہر آئینہ ہمچوں منے را بہ بند — تلافی فراخور بود نے گزند
بدیں مویہ در روز امید وبیم — بگریم بدانساں کہ عرش عظیم
شود از تو سیلاب را چارہ جوے — تو بخشی بداں گریہ ام آبروے
وگر خونِ حسرت ہدر کردۂ — زپاداش قطع نظر کردۂ
گزشتم زحسرت۔ امیدیم ہست — سپید آب روی سپیدیم ہست
کہ البتہ ایں رند ناپارسا — کج اندیشہ گبر مسلماں نما
پرستارِ فرخندہ منشورِ[1] تست — ہوادارِ فرزانہ دخشورِ[2] تست
بہ بندِ امید استواری فرست — بہ غالب خطِ رستگاری فرست

محمد کز ائینۂ روے دوست — جز انیش ندانست دانا کہ اوست
زہے روشن آئینۂ ایزدی — کہ در وے نہ گنجیدہ رنگ خودی
زرازِ نہاں پردۂ بر زدہ — زذاتِ خدا معجزے سر زدہ
تمناے دیرینۂ کردگار — بوے ایزد از خویش امیدوار

---

[1] یعنی قرآن ۱۲ [2] نبی ۱۲

تن از نور پالودہ سر چشمۂ — ولے ہمچو مہتاب در چشمۂ
بہر جام از دولتش جرعہ خواہ — بہر گام از معجزے سر براہ
کلامش بدل - در فرود آمدن — زدم جستہ پیشی بزود آمدن
خرامش بسنگ از قدم نقش بند — برنگے کہ نادیدہ پایش گزند
بہ دستش گشاد[1] قلم نارسا — بکلکش سوادِ رقم نارسا
دل امیدجای زیاں دیدگاں — نظر قبلہ گاہِ جہاں دیدگاں
برفتار صحرا گلستاں کنے — بگفتار کافر مسلماں کنے
بدنیا ز دیں روشنائی دہی — بعقبیٰ ز آتش رہائی دہی
بخوے خوش اندوہ کاہِ ہمہ — بآمرزشش امید گاہِ ہمہ
زبس محرم پردۂ راز بود — بنزدیکیِ حق سرافراز بود
ز رازے کہ باوے سرودے سروش — صدائیش بودے ز راہِ دل بگوش
خہے قبلۂ آدمی زادگاں — نظر گاہِ پیشیں فرستادگاں
کسائی دہ نسل آدم بخویش — روائی دہ نقد عالم بخویش
بلندی دہ کعبہ بالاے او — گرامی کن سجدہ سیماے او
یمن روشن از پرتو روے او — ختن بستۂ چین گیسوے او
ز بت بندگی - مردم آزاد کن — جہانے بیک خانہ آباد کن
بمحراب مسجد رخ آراے دیر — بہ اندیشِ خویش[2] ودعا گوے خیر
تو گوئی - ز بس دل زد شمن ز بست — کہ سنگِ درش سنگ ز آہن ربات

نثر فارسی | مرزا کی فارسی نثر کو جو مقدار میں فارسی نظم سے بہت زیادہ ہے اس بنا پر کہ وہ وزن سے معرا ہے صرف ایشیائی اصطلاح کے موافق نثر کہا جا سکتا ہے،

---

[1] کنایہ از گرامی بودن ۔ [2] یعنی خویشاوند۔

ورنہ اگر وزن سے قطع نظر کیجائے تو مرزا کی نثر میں شاعری کا عنصر نظم سے بھی غالب تر معلوم ہوتا ہے خصوصاً کلیاتِ نظم کا دیباچہ اور خاتمہ، مہر نیمروز کے ابتدائی عنوان، تمام تقریظیں اور دیباچے جو لوگوں کی کتابوں پر مرزا نے لکھے ہیں اور مکاتبات کا ایک معتدبہ حصہ سراسر شاعرانہ خیالات اور پولٹیکل نظم ونسق پر مبنی ہے۔

متاخرین میں ابوالفضل، ظہوری، طاہر وحید، اور جلالائے طباطبا بڑے نثار مانے جاتے ہیں۔ مرزا بیدل کی نثر اگرچہ اُنکی نظم کی طرح ایک دوسرا عالم رکھتی ہے مگر وہ بھی اپنی شان اور آن وبان میں بینظیر ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کرلیجائے (اور ضرور تسلیم کرنی چاہیے) کہ مرزا نے متاخرین کی طرز انشاپردازی سے استفادہ حاصل کیا ہے تو بھی متاخرین کی نثروں میں مرزا کی طرز کا سراغ لگانا ایسا ہی ہے جیسا تخمی آم میں پیوندی آم کا مزا ڈھونڈھنا۔ تقریباً ساٹھ برس گزرے کہ لکھنؤ کے ایک نہایت لائق آدمی نے مرزا کی نثر کی نسبت یہ بات کہی تھی کہ شیخ ابوالفضل اور مرزا بیدل دونوں کے مختلف اسٹائلوں سے کچھ کچھ مختلف باتیں اخذ کرکے ایک جدا اسٹائل پیدا کیا گیا ہے لیکن جب مرزا کی نثر کا اُن دونوں کی نثروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو مرزا کی کوئی ادا اُنکی طرز ادا سے میل نہیں کھاتی۔

اگرچہ مقتضائے مقام یہ تھا کہ مرزا کی نثر میں جو خصوصیتیں ہم کو معلوم ہوتی ہیں اُنکو یہاں مفصل طور پر بیان کیا جاتا اور ہر ایک خصوصیت مثالوں کے ذریعے سے ناظرین کے ذہن نشین کیجاتی لیکن چونکہ لوگوں کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دل بستگی نہیں ہے اسلیے ہم اس بحث سے قطع نظر کرکے حسب وعدہ اُن اصحاب کی ضیافت طبع کے لیے جن کو فارسی

زبان کے ساتھ باوجود اُسکی کساد بازاری کے ابتک کچھ نہ کچھ لگاوُ چلا جاتا ہے مرزا کی نثروں میں سے بطور نمونے کے کچھ کچھ التقاط کرتے ہیں اور ہم کو اُمید ہے کہ یہ نمونہ اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ووافی ہوگا کہ مرزا نے نثر فارسی میں بھی اسی قدر بلند پایہ بہم پہنچایا تھا جیساکہ نظم فارسی میں انکو حاصل تھا۔

اگرچہ مرزا کی نثر کو اگلے نامور انشاپردازوں کی نثر پر ترجیح دینا تاوقتیکہ اُسکو دلیل و برہان سے ثابت نہ کیا جائے ایک بےمعنی بات ہے لیکن ہم کو اُن لوگوں سے جو وجدان صحیح اور ذوق سلیم رکھتے ہیں اُمید ہے کہ وہ مرزا کی نثر میں ایک عجیب طرح کی لذت اور شوخی اور ایک نئی طرح کا بانکپن دیکھیں گے جس سے تمام متاخرین کی نثریں بالکل معرّا ہیں۔

چونکہ مرزا کی طرزِ انشاپردازی سے اکثر لوگ ناآشنا ہیں اسلیے جہاں تک ممکن ہوگا ہم انکی نثر میں سے ایسے مقامات اخذ کرینگے جو صاف اور سلیس ہوں اور باایںہمہ جہاں ضرورت ہوگی کہیں بین السطور میں کہیں بریکٹ میں اور کہیں فٹ نوٹ میں حل طلب مقامات کی شرح بھی کرتے جائینگے۔

مرزا کے تمام فارسی کلام کی املا میں ایک خصوصیت ہے جس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں وہ بعض الفاظ کو تمام اہل زبان اور زباندانوں کے برخلاف دوسری صورت سے لکھتے ہیں۔ مثلاً صد کو سد، شصت کو شست غلطیدن اور طپیدن کو غلتیدن اور تپیدن گذشتن اور گذاشتن کو گزشتن اور گزاشتن، آذر اور تذرو کو آزر اور تدرو وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ یہ املا ناظرین کے تردد کا باعث تھی اور نیز ہم اس املا کو صحیح نہیں سمجھتے

اسلیے اس کتاب میں جہاں کہیں مرزا کا کلام نقل کیا گیا ہے وہاں الفاظ مذکورہ قدیم معمولی طریقہ کے موافق لکھے گئے ہیں۔

نثر فارسی کے نمونے

از مہر نیمروز

خطاب زمین بوس مہر نیمروز کے دیباچے میں حمد اور نعت اور مدح بادشاہ کے بعد ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ مرحوم کی طرف خطاب کر کے اپنا درد دل بیان کیا ہے اور اس خطاب کا نام خطاب زمین بوس رکھا ہے۔ اسکو کسی قدر حذف و اسقاط کے بعد ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"تا آن شیوهٔ خاقانا او خواقین خدائیگانه ا رو ی آوردن من از عدم بوجود بسوداے گہرسنجی و گہرفروشی بود، کالاے بیش بہاے من درین چارسو روی روائی ندید، و متاع گرانمایهٔ مرا درین بازار ارزانی نه شد، ناچار ہرچه با خویش آورده ام۔ چون گویم که با خویش می برم۔ لختے در سفینه ہا، و پارهٔ در سینه ہا میگذارم۔ پس از من آن گنج شایگان را گر ہمه بادِ ببرد و اگر ہمه خاک بخورد گو بخور۔ سینه آرزو ہاے جوان میرزا مدفن ست المعۂ نگاه گرم چراغ گور غریبان باد۔

نیاگان نامه نگار از تخمهٔ افراسیاب و پشنگ بوده اند، و فرماندہان با فرو فرہنگ۔ فرد مُردن چراغ ہستی نوردیدهٔ تو به بادِ آستین کینهٔ کیخسرو پشنگیان

ے مرزا اکثر بلکہ تقریباً ہمیشہ ان لفظوں کے بعد جنکے آخر میں واو یا الف ہوتا ہے بغیر اضافت کے بھی قدما کی طرز پر یای زائد لاتے ہیں۔ مثلاً رو یا سو یا پا اور جا کی جگہ روے سوے پاے اور جاے لکھتے ہیں۔

روز سیاه پیش آورد خداوندانِ اورنگ و دیهیم را از آں برگ و ساز ها جز تیغ گند ناگوں بکف نماند - بمرز و بوم بیگانه روی آوردند، و بدست مزد تیغ زدن ناں خوردند - هم ازیں نیشاں ایواناں کهسار نشیمن سلجوقیاں دگر باره سر بافسر و افسر بگوهر آراستند - چرخ گردنده چنانکه خوی اوست ایں نامداران کاوس کوس را نیز از پای افگند -

در مشربِ ما خواهش فردوس بجوئی در مجمع ما طالع مسعود نیابی
در بادهٔ اندیشهٔ ما دُرد نه بینی در آتش هنگامهٔ ما دود نیابی

از والپسیان ایں قافله نیای من - که قلمرو ماوراءالنهر، سمرقند شهر مسقط الراس وی بود چوں سیل - که از بالا به پستی آید - از سمرقند بهند آمد - در دفتر سپهبد شاهِ نشان ذوالفقار الدوله میرزا نجف خاں توقیع نوکری شاهیش نوشتند، و پرگنه پهاسو برات روزی وی و سپاهش نوشتند - پدرم پیشهٔ پدر خویش داشت، و هم در کارزار جامه گذاشت - همانا گابمِن ثنای ترا نوآئیں نوا بلبلی همی بایست که مرا زمزمه سنج و دستانسرای آفریدند -

رباعی

غالب بگهر زدودهٔ زادشم زاں رو بصفای دم تیغست دم
چوں رفت سپهبدی رم چنگ اشعر شد تیر شکستهٔ نیاگاں قلم

خاکم بسر که بفریب پندارِ آزاده روی بسخن لا اُبالیانه پرداختم، و اندازهٔ ارزش سخن و پایه و لآلی گوهر خویش نشناختم - سینهٔ من نفسی داشت بروان آسائی نسیمی که از نسترن زار وزد، زیاں زده - من که دم جز به نابایست نزدم دنبان مرا قلمی بود به دجله باری ابری که از قبله خیزد بیهده کوش - من که

له اس در سے میاں کالے صاحب کا دروازہ مراد ہے جو بہادر شاہ کے پیر تھے اور مرزا انکے مکان میں رہتے تھے۔

باراں بشورہ زار فرو ریختم۔

با ایں فروغ گوہر درخشانی نہاد — زیں ساں سیاہ روز کرا کرد روزگار

بافرو فرہنگ بیگانہ، و با نام و ننگ دشمن بافرومایگاں ہمنشیں، و با او باشش ہم رنگ، پائے بیراہہ پوے وزبانِ ہیحرفہ گوے، در شکستِ خویش گردوں را دستیار، و در آزار خویش دشمن را آموزگار، دل پر از خار خار، و دیدہ نشتر زار، نہ دستگاہ خود نمایانہ آرایشے، و نہ سرو برگ آزادانہ آسایشے۔ سرگزشت ہر کس ہماں فرماں ہائے امضا پذیرفتۂ سرنوشتِ اوست، در آنچہ بر من رفت دوستاں را با من چہ جای سرزنش، و مرا با دشمناں چہ گنجائی پرخاش

لنگر گسست صرصر و کشتی شکست موج — دانا خورد دریغ کہ ناداں چہ کار کرد

پس از پنجاہ سالہ آوارگی کہ تیز رفتارِ من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت، و خانقاہ و میکدہ را بیگدگر زد، بفروغ آں فرۂ ایزدی کہ فریدوں را بہ فرتاب داوگری دل افروخت، و مرا فرہنگ سخن گستری آموخت، بداں در[۵] فرودم آوردند کہ تو نیز چوں حلقہ چشمے بداں در داری، و نتوانی کہ دیدہ برداری +++ تا ہمسایۂ اویم سپہریاں در سایۂ من اند و تا خاک نشین آں درم فرشتگاں در رشک پایۂ من اند در دل و دیدۂ روشناں جاے من ست، و بر سر ماہ و ستارہ پاے من۔ دریں گوشہ گزینی و خوشہ چینی نخست آیۂ رحمتے کہ بر از بالا فرود آمد۔ روداد ن خجستگی زمیں بوس گیہاں خدیو خدا داں بود۔ دولت رو آورد، بخت از خواب جست، نور چشم روشنی گفت رضواں بہ رضا جوے آمد۔ چرخ از رفتہ عذر خواست، روزگار از گذشتہ بجلی طلبید۔

---

[۵] اس در سے میاں کالے صاحب کا دروازہ مراد ہے جو بہادر شاہ کے پیر تھے اور مرزا انکے مکان میں رہتے تھے

نومیدی از تو کفر و تو راضی نہ بکفر   نومیدیم دگر بہ تو امیدوار کرد

کالبد خاکی مرا چوں پیکر گرد باد جانے درمیان نیست، ہمیں یک دو مرتبہ سرگشتگی تماشا دارد مگر عندلیب گلشن تصویرم کہ بہ بوے گل زمزمہ از وے نتواند دمید، یا سبزۂ جوہر شمشیرم کہ بوزیدن باز مستا   نیارد چمید گسستگی پیوند نشاط کہن شد، و خون از دل ہمچناں در چکیدن ست تا پیوند چہ قدر استوار بود؟ و چہ مایہ بہ زور گسستہ اند۔

شبے با دل دیوانہ کہ لختے (کسی قدر) از من ہوشمند تر ست۔ گفتم کہ اگر بگفتار (یعنی اگر طاقت گفتار دہی) نیرو دہی بشاہ ارم کارگاہ بارگاہ عرضہ دارم کہ آئینہ رازم۔ مرا می تواں زدود و بندہ سخن طرازم۔ مرا می تواں پرورد گفت اے ناداں این سخن از جاے دگر بود و ہنگام آں گذشت، اکنوں اگر ہمی توانی گفت بگوے! کہ خستہ ام۔ مرہم می تواں نہاد، و مردہ ام۔ جاں می تواں بخشید۔

رباعی

شاہا ہر چند دایہ جوے آمدہ ام   دانی کہ چہ مایہ نغز گوے آمدہ ام
آبم کہ محیط را (دریا کو) بجوے آمدہ ام   رنگم کہ بہار را بروے آمدہ ام

اگر چنانکہ بدوراں توام۔ بروزگار فرزانہ جمشید بودمے۔ جمشید روزگار را آفریں گفتمے، و اگر بد انساں کہ ثنا خوان شہریارم۔ فرخ فریدوں را ستودمے۔ فریدوں چرخ و ستارہ را گرد سر گشتمے۔ دراں انجمن کہ زردشت آتش افروخت، و ژند آور اگر من بدیں دم آذر فشاں جا داشتمے۔ آذر از بیم من زبانہ (شعلہ) نہ زدے، و از دلفریبی بیان من کس بشنیدن ژند نپرداختے من بدیں فرخی بخت کہ چوں تو خداوندگار فرمائے دارم۔ ہر قدر بر خویشتن بنازم جا دارد، ہرت گردم! تو نیز بدیں گرمی ہنگامہ بناز۔ کہ ہمچو غالب بندۂ آتشیں نواے داری، اگر بہ انداز ہنر داد التفات میدہی۔ جاے مردمک دیدہ بمن باز گزار، و در دل بروی من بکشای۔

گویند در عہد جہانبانی حضرت صاحبقران ثانی (یعنی شاہجہان) بفرمان آں خسرو دریادل کلیم را صدرہ بسیم و زر لعل و گہر سنجیدہ اند (سنجیدہ اند)۔ من آں خواہم دیدہ وراں را دستوری دہی تا از کشش کوشش نہ رنجند، و یکبار گفتار مرا با کلام کلیم بسنجند۔

پریشاں نوائی من در ستایش گفتار خویش اگر خود گزاف نباشد، گفتار راست بگستاخی گزاردن ہم از انصاف نباشد۔ آخر نہ ہمانم؟ کہ ہمہ وقت خود را ہیچ شمردے، و ہیچگاں بر خود گمان کمالے نبردے۔ سرمستی ذوق برگزیدل[1] ایں والا نظر کہ برگزیدۂ تست مرا از من برد، و خامہ بے پروا پوے را بدیں روش و آہنگ نگزامش (یعنی حکیم احسن اللہ خاں) و رامش آورد۔ ۔ ۔ + + + + + + + + + + + + +

ہمانا بلند نامی سلطان دہر در آفاق چشم داشت، کہ چوں منے را کہ بجادو بیانی شہرۂ آفاقم بکردار گزاری گماشت۔ من خود ازاں رو کہ دل و زبان ایں بیدار مغز آئینہ دار دل و زبان (حیرت بخاری) شاہ است دانم کہ انچہ عمدۃ الحکما (یعنی حکیم) دریں باب بمن فرمودہ۔ فرمان شاہ ست۔

بادشاہاں را ثنا گفتن نہ کار ہر کس ست　　دیدہ ور شاہے کہ کار گفتن اندازۂ من

نامہ نگار کردار گزار را بہ تنومندی توفیق سرانجام خدمت سعادت جاودانی، و خاقان را بہ سایہ سواد ایں نگارش کہ ظلمات آب حیواں ست حیات ابد الزمانی باد۔

آخر بہ فقرے امرزائے مہر نیمروز میں جہاں سبب تالیف کتاب لکھا ہے اسکے آخر میں یہ ظاہر کیا ہے کہ کسر نفسی کی معمولی رسم کے برخلاف اگر میں اپنی طرز بیان کی داد لوگوں سے چاہوں تو یہ کوئی بیجا بات نہ ہوگی بلکہ عین تنقید وتمیز کی بات سمجھی جائیگی۔ اسکے بعد کہتے ہیں کالا شناسی را نہ آں آئین ست

[1] خاندان تیموریہ کی تاریخ نویسی کے لیے مرزا کو حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے تجویز کیا تھا۔ یہاں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے ۱۲

که نکوئی کالائے خویش از نظر انداز ند، و پرکار کشائی رانه آں دستور ست که بر هر پیکرے که خود کشند عشق نه بازند- مگر مانی آں نقش را که خود میز د از اعجاز نمی شمرد؟ و آزر آں بت را که خود می تراشید نماز نمی برد؟ یزداں را بند سپاس نگزار باشم اگر قلم را بهر جنبش آفریں نگویم، و از سخن بهر اندیشه سپاس نپذیرم رفتار کبک و تدرو دل از دست برد، خرام ایں رعنا لعبت رقاص سرمست نکند؟ حاشا که خرامش کلک بر ورق ایں مایه ذوق انگیز تواند بود تیر هست که بسنبله در حالتِ سرمستی تصمیم[1] خود نمایانه بنازمی خرامد- ایں پارسی آمیخته به تازی که از زماں چیره دستی عرب بر عجم در گیتی پدید آمد- خسروی گنجینهٔ در بسته بود که خامه من قفل درش را کلید آمد- پرویز کجا ست تا بنگرد که دریں رهروی کدام ره سپرده ام، و بهرام کجا ست تا فرا رسد که سخن را از کجا بکجا برده ام-

خسروی باده دریں دور اگر میخواهی پیش ما آے که جرعهٔ از جامی هست

خودستائی فروهلم، و بند پندار نگسلم- آوخ ازاں روزگار که از خوی بناسازی، و از کار ببازی سپری شد، و داد ازاں بیداد که در ورزش افزونی خشم و کام بر رواں و هوس رفت- از کار فرمائے ایں نگارش سپاس پذیرم که بپرداختن ایں نمط که خود را چوں سایه بازمیں هموار ساخته ام تا پرداخته ام، و بانگیختن ایں نقش- که چشم و دل و نگاه و نفس باهم آمیخته ام تا انگیخته ام- دست از کار های دگر کوتاه است، و دل از اندیشه هائے دگر بر کنار- نامه نگار- که از کردار گزاری بگفتن درد دل روی آورده بود- باز به پائے سخن می آید

---

[1] تصمیم اور احتراق منجین کی اصطلاح میں دو متقابل لفظ ہیں۔ جب کسی ستارے کا فاصلہ مرکز آفتاب سے ۶ درجہ ہو تو کہتے ہیں کہ یہ ستارہ احتراق میں ہے اور جب یہ فاصلہ ۱۶ دقیقہ یعنی بہ نسبت احتراق کے ۴۴ء۳ دقیقہ کم ہو تو کہتے ہیں کہ تصمیم میں ہے الغرض ستارہ کا تصمیم میں ہونا اسکی عمدہ ترین حالت ہے۔

وجادۂ کہ نشان دادہ اند می پیمایند، نگرندگاں ہمہ تن چشم باشند، وشنوندگاں سراپا گوش۔

طرز واقعہ نگاری

مرزا نے مہر نیمروز میں جس طریقے سے واقعات تحریر کیے ہیں یہاں دو ایک مثالیں اُسکی بھی لکھی جاتی ہیں۔

از روئداد قبل خاں کہ از نیاگان امیر تیمور بود

خانِ خطا با خویشتن سنجید کہ با قہرماں قوم مغل مہر ورزد، مہر انگیز نامہ رواں داشت، وگزیدہ روشے را بہ نامہ بری و میانجی گری گماشت۔ فرستادہ آمد، وہماں پہلواں قبل خاں را زمیں بوسید، و نامہ سپرد وپیام گزارد۔ صرفہ در آشتی بود نہ در فروگذاشت۔ قاچولی بہادر را بجائے خود نشاند، وبہ عنانیِ نامہ آور توسنِ تیز گام سوئے خطا راند۔ وفرماندہ آں کشور سرانِ لشکر را پذیرہ فرستاد، ومہماں را بخوشترین نشیمن فرود آورد، آورد دو پادشاہِ سپہر بارگاہ بر یک خواں نشستند، ونان خوردند، وراوق آشامیدند مگر خرد پیشہ قبل خاں را در اندیشہ گزشتہ باشد کہ مبادا خطائیان زہر بہ بادہ آمیزند، وبدیں رنگ خوں مہماں ریزند، در ہر بزم پس از اندک مایہ درنگ بہ بہانۂ آب تاختن بروں آمدے، وبہ ستم شگوفہ کردے، وخوردہ آشامیدہ از دہن فرو ریختے۔ چوں بہ بزم اندر آمدے دگر بارہ ساغر گرفتے، وخوردنی از سر گرفتے۔ خطائیاں بہ شگفت فروماندہ کہ یارب ایں چہ نیرومند و زور آور کسی ست کہ از ما بیشتر میخورد وخورش را بروئے گرانی نیست، وے از ما فزوں تر میکشد وہشیار تر از ماست۔ میکشاں دانند کہ چوں بادۂ پرزور مادم خورند ہر چند ہر بار بشگوفہ اندازند، نہ آنست کہ مستی روئے ندہد۔ وتاب مے وزبونی قے منش را بہم برزنند۔ شبے بادہ برخرد وزآورد۔ قبل خاں ریش دارائے خطا کہ التاں خاں نام داشت۔ گرفت وبسوئے خود کشید، وناسزا گفت۔ یزدان

خشم فرو خورد، و نزدیکانِ خود را کہ بہم برآمدہ بودند از گستاخی باز داشت۔ بامدادان
مہماں آہنگِ بازگشت سرود۔ میزبان کہ از بدمستی دوشینہ سرگراں بود چنانکہ
میزبانان دامنِ مہماں (ظاہر کرد ۱۲) زود از دست نہ ہند، و آرزوے دیر ماندن کنند
نکرد کلاہ ہاے گوہر آگیں، و کمر ہاے زریں، درخشندہ نگیں ہاے بیش بہا
دربستہ ہاے پرنیاں و دیبا پیش کشید، و پدرود کرد (رخصت ۱۲) ہنوز رہرو دور نہ رفتہ
بود کہ بدآموزان (یعنی یبغو) التاں خاں را از جاے بردند، و بر آں آوردند (یعنی قبل خاں ۱۲) قبل خاں
از راہ برگردانند، و بدرگاہ آورند (اغوا کردند ۱۲)، و کالبدش را بدشنہ و خنجر از ہم فرو گشایند۔
سخن نبرمی[1] گزارندہ ستارہ از سپہر فرود آرندہ۔ بدیں کار کمر بست و قبل خاں
را براہ دریافت و بباز آمدن فریفت۔ رسیدہ رام نہ شد، و از راہ برگشت۔ فرستادہ
تنہا باز آمد و بفرستندہ خبر داد۔ بگروہے از گرداں و یلاں رفت کہ جلوگیرش
شتابند، و ہر کجا یابند اگر بشادی و رادی نیاید بخواری و زاری آورند۔ مگر
قبل خاں را براہ دوستی (ادبیت ۱۲) بود از دودۂ ستودہ سلجوق۔ بکاشانہ وے فرود آمد
دانم از بہرِ آسائش آہنگِ دو سہ روز آبخورد داشتہ باشد خطائیان شوریدہ
مغز دراں دہ رسیدند، و خاں را دراں خانہ دیدند (قامت ۱۲)۔ سخن بداں الابہ ساز کردند
کہ خاقان فریب خورد، و خواست کہ سوے خطا برگردد۔ خانہ خدا (میزبان) کہ (چرب زبانی ۱۲) خرد از مہر
فزوں داشت۔ نہفتہ بادپاے پیش کشید و گفت کارہا دگرگون ست،
رفتن بخطا خود ہیچ روے روا نیست۔ تنہا بدیں گروہ میاویز، و بریں باد
توسن نام برنشین، و سوے ایل دادلوس بگریز۔ ناگزیر ہمچناں کرد، و جان
گرامی بہ تیزگامی بُرد۔ خطائیاں روے (قوم و قبیلہ ۱۲) بازگشتن نداشتند[2] پے امید گاہ

---

[1] یعنی سیگہ بلطف زبانی و حیلہ سازی ستارہ را از سپہر فرود آورندہ ۱۲ [2] پے برداشتن تعاقب نمودن ۔ مقیم
گاہ تکاپوے خویش یعنی کسی کہ در طلب او تکاپو می نمودند ۱۲

تگاپوے خویش - برداشتند - خانِ سپہر آستاں نخست بآرامش جار سید وخطائیان سپس - باقاجولی بہادر و فرزانگاہ لشکر سگالش رفت کہ چہ می باید کرد - انجام کار بہ یہدید یکدگر بدخواہاں راکشتند - تاازتخمیک کشتند چہ درونند -

شہریار قبل خاں ازیک بانوے نکو دیدار - کہ از قوم قنقرات بود شش پسر داشت - نخستیں و دُومیں بہ اوگیں برقاق وقولیہ خاں نام آور، ودیگراں بہ نامہای دگر روشناس روزے نخستیں ایں دو برادر - نام اور ناگاہ بہ شکارگاہ از ہمرہاں جدا ہمی ماند، وراہ گم کردہ ہرزہ ہمی گردد - تاتار خانیاں - کہ غارتگری پیشہ داشتند، پیرامن قلمرو مغول ہموارہ راہ میزدند - بایں شہسوار پریشاں رفتار برمیخورند - وچوں می دانند کہ کیست باسیری می برندو بالتاخان خطائی می سپرند - خان کہ دے بر داشت فرماں می دہد کہ شاہزادہ را برخرچوبیں بہ میخ ہاے آہنیں بردوزند، وتن نازنیش از رواں پرداز ند - خداوند مغولستان راکہ ازپیش رنجور بود بجگر تابی ایں داغ دردا فزود - چوں دانست کہ ناکام ہمی باید مرد، دومیں پسرخویش قولیہ خاں را بہ جانشینی گزید - وبہ کشیدن انتقام خون برادر وصیت کردہ چشم از تماشاے جہاں پوشید - قولیہ خاں تانگیں سلیماں بکف آورد لیفراہم آمدن سپاہ فرمان نبشت - فرماں براں وکینہ خواہاں ازہر سو بہ تخت گاہ روی آوروند -

شہنشاہ دانا دل دیدہ ور	کہ چوں لعل بودے سراپا جگر
براں شد کہ لشکر فراز آورد	بسوے خطا ترکتاز آورد
ز مرداں وگرداں وگندآوراں	بہ جنبش درآورد کوہے گراں
ازاں روکہ بایست خونریز شد	تنش باہجوں ریختن تیز شد
دلیراں ز دشمن کشی دم زدند	زدم باد بر روے پرچم زدند

زتاتار تا گرد انگیختند   به بنگاهِ خانِ خطا ریختند

التان خان دل و دست و عنان و سنان بکار آورد، و خود را با سیلے از ستاره بشمار افزوں تر۔ به پیکار آورد۔ کوشید و کوشیدن سود نداشت رقم فیروزی بنام قوبله خان کشیده بودند۔ شکیبائی گسل شکستے بر خطائیاں افتاد، علم ها واژگوں شد، و اندیشه بگریز رہنموں۔ جهانبان التا خان بگریختن جاں برد۔ و تن هائے خسته و دلهائے شکسته از میاں برد۔ بشهر اندر آمد، و در بروئے سپاهِ کینه خواه بست۔ قوبله خان و لشکریانش نه آنمایه برگ و ساز به نیمار بودند که در اندیشه گنجد۔ سپاس گزارِ چرخ و اختر گشتند و گرانبار و سبک عناں برگشتند بادشاه بچشم روشنی پیروزی سپاه رعیت را صلائے عشرت اندوزی داد۔ هنگامهٔ جشن گرمی پذیرفت و بزم سوار آرایش یافت خواهی هنگامه گرم کن و خواهی بزم آرائے، مرگ را، نه آں خدنگ به کمان ست که خطا کند، قوبله خان را نیز بهنگام خویش ناوک برنشاں خورد چوں پسر نداشت برتان بهادر جائے پدر از برادر گرفت۔ بسکه دلیر و مردانه بود نامش از خانی به بهادری در جهاں رفت۔ بروزگار جهانداریِ ایں شهریارِ دلاور۔ برقِ اجل خرمن هستی قاجولی بهادر سوخت۔ و پسرش اروم‌چی برلاس پسر لشکری رُخ افروخت۔

پارهٔ احوال امیر تیمور | روزے میانهٔ امیر قزغن[۵] و امیر طراغائے[۶] در بارهٔ اولوس

و قشون سخن می رفت و فرزانهٔ فیروزی فر امیر تیمور دلاور با پدر همزبان بود۔ پدر را از گفتار بازداشته خود بشگرفی سخن سرائے شد، و بداں هنجار زخمهٔ چند بر تار گفتار زد که امیر قزغن دراں شیوا بیانی و گهر افشانی بمهر دل بست

---

۵ امیر قزغن نام یکے از امرائے چغتائیه ۱۲ ۶ امیر طراغائے نام پدر امیر تیمور ۱۲

وبا آفریں زباں برکشاد۔ سخن گوے فرو ہیدہ ادا را پسر خواند، و ہمداراں بزم اولجائیتو ترکان خواہر امیر حسین نبیرۂ خویشتن را بآئین دین و قانون شرع بوے سپرد۔ تا خویشی بر خویشاوندی افزاید، و آمیزشے چوں شیر و شکر درمیان آید۔ امیر جہانگیر پس ازاں پیوستہ با امیر قزغن در بزم ہمنشین و ہمدم و در رزم پیش تاز و پیش آہنگ بودے۔ از نبرد آزمایان برلاس و دلاوران چغتا ہر کہ آں دست بردنگرستے شگفتی فرو ماندے "دو بیتت مریزاد" گویاں دست و بازو آفریں خواندے۔ پس از امیر قزغن کہ دامادش بعلق تیمور ناگاہ در شکار گاہش* کشت۔ جہاں پہلوان تہمتن تواں بہ تنہا دامن ہمت والا گرفت و در تیغ زنی و خصم افگنی کارش بالا گرفت۔

ہر چند کہ زشت و ناسزائیم ہمہ — در عہدۂ رحمت خدائیم ہمہ
در جلوۂ دید چناں کہ مائیم ہمہ — شایستۂ نفت و بوریائیم ہمہ

برادر زن صاحبقراں ہمانا امیر حسین نیز بوے پیوست، و عہد بست کہ ہر چہ از ملک و مال و برگ و ساز گرد آید بر یکدگر بخشش کنیم، و باہم جز مہر، و بخود جز آزرم، و با خلق جز داد نہ ورزیم۔ بچوں گرمی ایں دو گرد دلاور و دو شیر مردم گیر ہنگامہ گرمی پذیرفت، و گزیں دستگاہے دسترگ سپاہے فراہم آمد صاحبقراں نہ از سادگی بلکہ از آزادگی دل بازباں یکے داشت و امیر حسین ہموارہ در کمین آں بودے کہ انباز را از میان بردارد، و بیکتائی علم دارائی افرازد از دیدہ دری لبگالشہاے آں زشت اندیشہ ناراستی پیشہ پے بردے۔ و از فرزانگی و مردانگی ہیچگاہ بروے نیاوردے۔

ستم بجاں کج اندیشی می تواں کردن — خجل ز راستی خویش می تواں کردن

لہ یہ رباعی گویا آیندہ آنےوالے مضمون کی تمہید ہے ۱۲

روزگارے دراز تر از رشتهٔ طول امل - با ملوک طوائف در کجدار و مریز و ستیز و آویز گذشت ہمگناں چشم براہ و گوش بر آواز داشتند تا یل اسفندیار نیرو را از کدام سو چشم زخم رسد - ویژہ امیر حسین که جز بریو و غریو در رنگ و نیرنگ کار نمی کرد، و در انبازی و دمسازی - فتنہ پردازی و شعبدہ بازی شیوہ داشت - نیرنگ سازیِ اقبال عدو مال صاحبقرانِ کشورستان را نازم که ہم آں گروہ بے شکوہ را سوبسو پاے بسنگ خوردے، و ہم ایں گرد بے دستبرد را جا بجا دست از کار رفتے - صدرہ اتفاق افتادہ است که ایں نفاق پیشگانِ خرد دشمن خوں گرفتہ را از نژاد چغتا خاں دست گرفتہ بر تکیہ گاہِ خانی و مرزبانی فشاندہ اند، و زود نہ دیر شمشیر بر سرش راندہ اند - تنہاے پیلتناں را مسند و نطع از پے ہم مہیا بود، و سرِ دراں را ناز بالش و خشت گور از پس یکدگر آمادہ

سیرِ ستارہ و روشِ چرخِ نیلگوں — اینہا کند ہر آئینہ در مذہب حکیم
اما من آں نیم که پسندم طریق وہم — زاختر چہ شکوہ چوں نبود جز خدا قسیم
نبود بجز ظہور صفات و شیونِ حق — صلح و نبرد و فتح و شکست و امید و بیم
توقیع معنویست گر انصاف در ستم — تشریف خسرویست گر اطلس و گر گلیم
از حق بود اضافهٔ ہستی بہر صفت — جز دادہ نبود آنچہ بہ سائل دہد کریم

ہمچنیں بارہا امیر حسین را از درماندگی و زبونی کار سخت افتادہ است - و سلطان سام ہم آورد، افراسیاب ہمتا - بر لابہ گری وے بخشودہ بیاری و یاوری دل نہادہ است کینہاے نہانی امیر حسین آشکارا بود - ہمہ می دانستند، و خدیو ہمہ داں از ہمہ فزوں تر می دانست دانم که در ضمیر حق پذیر آزرم ناگزیر[1] - می گزشتہ که باشد که مگر ایں سست مہر خوہاے زشت و کردارہاے نکوہیدہ بگذارد

[1] آزرم ناگزیر کسیکہ او را از آزرم و مروت چارہ نباشد"

وجہاندار را دگر بنا راستی وجہانیاں را سپس بہ دراز دستی نیازارد- آں نا
جوانمرد را فرۂ ایزدی کجا کہ بخشش وکام نگردد، وراہ دانش و داد رود- در
آزردنِ دل آزرم (یعنی خواہشہائے نفسانی ۱۲) نداشت و در بُردنِ زر شکیب، و در کشتن خلق پروا
تو پارسا طلبی عاشق (ستمگر ۱۲) و من آں رندم کہ نے بحلقہ او باشم آشکار کشد
پایان کار لشکریانش از ناخوشی ستوہ آمدہ آں جواں میر خداگیر[۱] را با ہر چہار
پسرش گرفتہ آوردند و بخداوندگار سپردند- دارائے نبرد آزمائے را آہنگ
عاجز کشی نہ بود و خون گرمی پاداش (یعنی جوش انتقام) نداشت- می خواست
بر نابخشودنی بخشودن وگناہان نابخشیدنی بخشیدن از نہاد اہل بزم خروش
برخاست- خاصہ شاہ محمد مرزبانِ بدخشاں، و شیخ محمد بیاں- سلدوز، و
امیر کیخسرو- کہ ریشہائے لودناسور ہائے کہن داشتند از زخمۂ تیز تر زدند، و
نواہائے خونچکانِ خونابہ فشاں فغاں برآوردند کہ ما قصاص خوں ہائے
ریختہ می خواہیم نہ انتقام فتنہ ہائے انگیختہ کہ والی ولایت آں را بحل توانند کرد-
ناگزیر بدیں گفتار فرجام گیر وار بشرع حوالت رفت- کار آگاہاں و دانش
پناہاں خوں ریختن فرمودند- وسادات و علما بہ کشتن فتوی دادند-
بہنداری چوں غول گرفتہ اینہا شنیدہ باشد کہ خود را بگریختن از ہنگامہ
بدر برد- وسپش وزاویۂ گمنامی کہ ہمسایۂ نیستی ست روزگار بسر برد-
از انجا کہ سلاح وسلب نداشت سراسیمہ از جا رفت، و آخر گاہ بدرگاہ
بدر آمدہ بجنگِ سیلی ومشت رہ گریز پیش گرفت خوں خواہاں بخوں
گرمی در وے آویختند، وخونش را کہ بد ویدن گرم شدہ بود گرما گرم
برزمین ریختند

---

[۱] خداگیر کسیکہ بغضب خدا گرفتار شدہ باشد ۱۲

توای ندیم که مانی زتازه روئی خویش ——— بسبزهٔ که سر از طرف جوئبار کشد
فریب مهر زگردوں مخور که ایں بے مہر ——— دہد فشار کسی را که در کنار کشد
ہوائے تاج شہی ہر کرا بود در سر ——— سرے بہ دفنِ شاہان تاجدار کشد

پاره از احوال ہمایوں و شیر شاہ

شیر خاں را دل دگر بود و زبان دگر بہ لابہ گری و فسوں گستری پیام آشتی در میان داشت تا چناں شد کہ ہیچکس را ستیزه در اندیشہ نگذاشتے ازاں گل ولائے کہ در راہ پیمودہ بودند، و روز و شب از رہروی۔ لنے لنے از شناوری بیاسودہ بودند، پیادہ آزردہ پائے بود۔ و سوار فرسودہ اندام، دستور پشت ریش۔ فریب دوستی از دشمن خوردگان (یعنی ہمایوں و لشکریانش کہ فریب از شیر شاہ خوردہ بودند) دست از غارت و تاراجِ غنیم کشیدند، و دمِ آسایش غنیمت شمردند۔ پاہا بہ جادۂ زہ دامن آشنا شد (یعنی پا بدامن کشیدہ بخواب رفتند) و پیکرہا چوں صورت دیبا بہ بستر پیوند پذیرفت۔ سر از بالش بزمی خیزد تا کلاہ و مغفر چہ کنند، و پیراہنِ حریر بر تن گراں ست تا چلقد و جوشن کجا برند۔ ہوا نمناک بود، و ابر رشحہ فشاں تیغ در نیام زنگ بست، و نمد زیں بر بارگی گراں گشت۔ سپیدہ دمے۔ کہ تیرگی تار میغ جہاں را فرو گرفتہ بود ہنگامہ سازاں ہنگام جوئے یکسرہ بر غنودگاں ریختند شنگرف سراسیمگی پدید آمد و طرفہ ہزاہز در لشکر افتاد۔ کلاہ از کمر و پار دم از افسار نشناختند۔ از رختِ خواب جستہ و بر اسپان بے زین نشستہ پراگندہ ہر طرف تاختند۔ گروہے ہر چہ بادا باد" گویاں سوارہ خود را بدر زدند۔ و ہنر ورے چند ساحل جویاں بہ شنا دست و پا زدند۔ تا کداماں بزخم دمِ تیغ و کداماں بہ خم موجِ رود مردہ باشند، کداماں از طوفان ایں دو آبہ (یعنی آبِ تیغ و آب رود) جاں بسلامت بردہ باشند۔ شہنشاہ بجر د بر

(ہمایوں) نہنگ دشت نورد دریا شگاف (یعنی اسپ) را از فرازِ ساحل در آب افگند۔ پاے از رکاب، و عنان از دست و اسپ از خمِ ران بدر رفت۔ و شاہ سوارے کہ شاہان ہنگام سواری بوسہ بر کابش می زدند۔ غوطہ در آب خورد نظام نام آزادہ از آب کشان لشکر۔ کہ پنہاں از خویش اقبال را چشم براہ وگوش بر صدا داشت (یعنی بے آنکہ خبر داشتہ باشد منتظر عروج و اقبال خود بود) و با خویشتن دریں اندیشہ کہ از ساحل چوں گذرد بر ساحل جا داشت ہوا خواہانہ بداں چستی۔ کہ گوئی گوے دولت برُد۔ خود را بآب در زد۔ بارے بدانسبت آشکارا جنیاں سقاے سخت گوشے بود، و بہ والا دید معنی آشنایان فرخ سروشے بود کہ جہانیاں را از گرداب بدر آورد و بر جہانیاں منت نہاد۔

از دستنبوہ

اگرچہ مرزا کی نثر میں عموماً عربی الفاظ بہت کم آتے ہیں لیکن کتاب دستنبوہ میں جو غدر کے حالات پر مرزا نے لکھی ہے التزام کیا گیا ہے کہ تمام کتاب میں کوئی عربی لفظ نہ آنے پائے۔ باوجود اس سخت التزام کے مرزا نے دستنبوہ میں اپنی طرزِ خاص اور شاعرانہ ادا اور بانکپن کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ چنانچہ نمونے کے طور پر دستنبوہ کے چند فقرے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں۔

غدر کے اسباب | دریں روزگار۔ کہ ہر زمزمہ را ہنجار، و ہر ہمہ را رفتار، و ہر کجا سیاہے بود از سپہدار سخن پیوندی بگذار و بگوے کہ خود روز و روزگار برگشت اخترشناسانِ سپہر پیماے (یعنی منجماں) بر آنند کہ دراں روزگار۔ کہ بزم تا یزدجرد شہریار پارس از ترکتازِ تازیاں (اہل عرب) بہم خورد۔ کیواں (زحل) و بہرام (مریخ) در خرچنگ (برج سرطان) انجمن آراے و ہنر آزماے بودند۔ اینک ہماں پایہ (درجہ) سیزدہم از خرچنگ ہچناں ہم پیوستن گاہِ

(جاۓ قران) بہرام کیواں ست و ایں شورش و پرخاش وجنگ وخونخواری و خونخواری، اورنگ ونیرنگ نمایۂ (ظہور) آنست

دانا بدیں گفتار کے گرود؟ آں تاختن لشکرے دیگر بود از کشور دیگر، و ایں برگشتن لشکر ست از خداوندان لشکر، چنانچہ از داستان باستان پارسایان پارس بہم نمانستن (عدم مشابہت) ایں دو ستیزندہ آویز ہویدائی دارد۔ دراں بار کہ سخن در کیش بود۔ ایران ویران بہ فرہ و فرہنگ کیش نو (یعنی اسلام) فرجام آبادی و از بند آذر بندگی (آتش پرستی) آزادی یافت۔ در ایں بار کہ گفتار در آئین ست ہندیاں بہ چشمداشت کدام آئین تازہ شادماں باشند پارسیاں رخ از آتش تافتند، و بسوے خدا راہ یافتند۔ ہندیاں دامن دادگراں (یعنی اہل فرنگ) از دست دادند۔ و بشکنجۂ دام ہمدمی دواں (درندگان) افتادند۔ نمی بینی کہ از دامن تا دام و از داد تا دو چہ مایۂ دوری ست، ہمداد آنست کہ آرامش (راحت) جز در آئین انگریز چشم داشتن کوری ست۔ زخم تازیانۂ تازیاں از خوبی آں کیش فرخ (اسلام) مرہمی داشت روزگار در نوردِ ایں خستگی (یعنی غدر) خجستگی اگر میداشت باز اندوہ از دوش دلہاے نژند (پریشان وتباہ) برمی داشت اگر در اندیشۂ راز داناں بہ بہر دانش و داد۔ ازیں پس ہوش آمدے (بہبودی) ہست بسن نشان دہند، و بردل اندوہگیں بیمناک سپاس نہند۔ جہانباناں ستیزندہ لشکریاں خون لشکر آرایاں ریزند۔ و انگاہ شادی ورزند، و برخویشتن نلرزند۔ ہاں اے دانندگانِ فرزبود (حکمت آلہی) وشناسندگانِ زیاں و سود! ایں ہنگامہ بہ آتش خشم خداوند گرم ست ورنہ کارزار پارس اینچنیں امید سوز و آرزو گداز نبود۔

کیفیت شورش باغیان در دہلی | چاشتگاہِ دوشنبہ شانزدہم ماہ روزہ و یازدہم مئی سال
یکہزار و ہشت صد و پنجاہ و ہفت ناگرفت در و دیوار بارہ و بارۂ دہلی بجنبد و
آں جنبش زمیں را فرا گرفت۔ سخن در زمیں لرز (زلزلہ) نمی رود، در آں
روز جہاں سوز۔ بخت برگشتۂ و سرگشتۂ چند از سپاہِ کینہ خواہ میرٹھ بشہر در آمدند
ہمہ بے آزرم و شور انگیز، و بخداوند کشتی تشنۂ خون انگریز۔ دیدبانانِ دروازہائے
شہر کہ بروں (علاوہ) از ہمگوہری و ہم پیشگی نشگفت (عجب نیست) کہ ہم از
پیش ہم سوگند نیز باشند ہم پاس نمک و ہم پاس شہر گذاشتند، و مہمانانِ
ناخواندہ یا خواندہ را گرامی داشتند۔ آں سواران سرگراں سبک جلو (سبک
عناں) و پیادگانِ تند خوے تیز دَو چوں درہا باز و دربانان را مہماں نواز
یافتند دیوانہ وار ہر سو شتافتند، و ہر کرا از فرماندہاں، و ہر کجا آرامشگاہِ
آں مہاں یافتند تا زار نگشتند و پاک نہ سوختند روی ازاں سوی برتافتند
مشتے گدایانِ گوشہ گیر از بخشش انگریزی توشہ گیر۔ کہ ناں با ترہ و
دوغ می خورند و در شہر دور از یکدگر پراگندہ جا بجا روزگار بسر می برند۔
(یعنی رعایائے شہر) ہمہ تیر از تیر ناشناسندگاں و از غوغائے دزد تیرہ
شب ہراسندگان نہ پلارکے در دست، و نہ خدنگے در شست، اگر راست
پرسی ایں مردم بہر آبادیِ کوے و برزن اند نہ برائے آنکہ بہ آہنگ پیکار
دامن بہ کمر زنند، با اینہمہ ازاں رو کہ راہ آب تیز رو بہ خاشاک نتواں بست
دست از چارہ کوتاہ دید ہر یکے در سرائے خویش بماتم نشست۔ یکے ازاں
ماتم زدگاں منم کہ در خانہ خویش بودم، چوں غریو و غوغا شنودم تا از پژوہش
دم زدم، دراں مایہ درنگ کہ مژہ برہم زدم، آوازہ بخوں غلطیدنِ صاحب
اِجنٹ بہادر و قلعہ دار و دارک (قلعہ)، و دویدن سواراں و پیلپے رسیدنِ

پیادگان در راستہ بازار از ہر گوشہ و کنار، بلند گشت ہیچ مشت خاکے نماند کہ از خون گل اندلال ارغواں زار نشد، و ہیچ کنج باغے نبود کہ از بے برگی مانا پدخمۂ نوبہار نشد۔ ہاے! آں جہانداراں داد آموز دانش اندوز نکو خوے نکو نام وآہ ازاں خاتوناں پری چہرۂ نازک اندام بارخے چوں ماہ و تنے چوں سیم خام، و دریغ آں کودکاں جہان نادیدہ۔ کہ در شگفتہ روئی برلالہ وگل می خندیدند، و در خوشخرامی برکبک و تذرو و آہو می گرفتند۔ کہ ہمہ یکبار بگرداب خوں فرو رفتند اگر مرگ بربالین ایں کشتگان بمویہ (بگریہ) خروشد، و دریں سوگ سیاہ پوشد، رواست، واگر سپہر خاک گرد و فرو ریزد، و زمین ہراسیمہ چوں گرد از جا برخیزد بجاست ؎

ای نوبہار چوں تن بسمل بخوں بغلط　　اے روزگار چوں شب بے ماہ تار شو

اے آفتاب روی بہ سیلی کبود کن　　اے ماہتاب داغ دل روزگار شو

بارے چوں آں روز تیرہ بشام رسید، و گیتی تاریکتر گردید، سیہ درونان خیرہ کش (بخیرگی کشندہ) ہم در شہر جابجا رخت تن آسانی انداختند، و ہم درارک باغ خسروی را آخر اسپاں و نشیمن شاہی را خوابگاہ خویش ساختند۔ رفتہ رفتہ از شہرہاے دوردست آگہی رسید کہ شوریدگان ہر سپاہ، در ہر فرود آمدن گاہ (منزل) خون سپہداں ریختہ اند گروہا گروہ مردم را از سپاہی وکشاورز دل یکے گشت، وہمہ بے آنکہ باہم سخن رود۔ دور و نزدیک یکدست بریک کار کمر بستند، وانگاہ چساں پر زور کمرے و چگونہ استوار بستنی کہ جز بہ جنبش جوش خونے کہ از کمر گذرد گشاد نہ پذیرد۔ پنداری ایں لشکرہاے بے مرد جنگجویان بیشمار را جاروب دار کمر بندیگی ست۔ آرے رفت و روب ہندبوم بداں ساں کہ آرامش و آسایش اگر جویند باندازۂ پر کاہے گاہے نیابند ہمچنیں جاروب گیتی آشوب ہمیخواست اینک ہزار لشکر نگری ہمہ

بے لشکر آرائے آراستہ، و بسا سپاہ یعنی یکسرہ بے سپہدار بجنگ برخاستہ۔ توپ و گلولہ و ساچمہ و چہرہ و بارود ہمہ از خانۂ انگریز آوردہ، و با گنجینہ داراں روے بستیز آوردہ آئین نبرد و ورزش پیکار ہمہ از انگریز آموختہ، و رخ بکینِ آموزگاراں افروختہ - دل سنت سنگ و آہن نیست چرا نہ سوزد - چشم ست رخنۂ و روزن نیست چوں نگرید؟ آرے ہم بداغِ مرگ فرماندہاں باید سوخت و ہم بر ویرانیِ ہندوستاں باید گریست۔ شہرہاے بے شہریار پر از بندہ ہاے بے خداوند، چنانکہ باغہاے بے باغباں پُر از درختانِ نابرومند - رہزن از گیرو دار آزلو و بازارگان از تمغا، خانہ ہا ویرانہ ہا و کلبہا (دو کانہا) خوانِ یغما۔

از دیباچہ ثانی درفش کاویانی

غالب خاکسار ہرزہ کار را از آسمان بہ زمیں فرستادند، فرماں دادند کہ دریں بیشہ پیشہ کشاورزی (کاشتکاری) ورزد - وایں فرا ماں (فرماں) را بازماں (توقف) نہ پسندد - ناگزیرمی بایست (ضرور تھا) کمر بستن و زمیں خستن گاؤ راندن و دانہ افشاندن - ناداں (کشاورزی نکرد بلکہ) بہوس درزمیں غزل، جاں کند، وازاں گہرہا۔ کہ باخویش آوردہ بود - نیمہ دراں زمیں پراگند - ہمانا گویا) از ہر دانۂ کہ کاشت ہزار دانہ چشم داشت - از مرواریدے کہ در خاک نہاں کنند شنیدہ، کہ ریشہ سر برزنند کاغش جو کاشتے - دانست کہ را خاک خورد - (یعنی تلعت شد ناچار) ہمہٗ دیگر را پیش شاہاں روزگار برد دید ند و پسندیدند و نخریدند - شبے با یکے از راز داناں پژوہش (پرسش) رفت کہ در مبدأ فیاض بخل نیست، ابر بر باغ و راغ و سمن و دوئن یکساں بارد؛

چراست؟ کہ مردم چندے نادار داندے (چندے) توانگراند۔ گفت راست گفتی توقیع سرنوشت ہا یکے ست (یعنی یکسانست) جدا شناس (مابہ الامتیاز) اگر ہست جز ایں نیست کہ کار و بار گروہے از ہر یک بریک ورق، و سوزو ساز جرگہ (گروہے) از ہر کس بریک صفحہ نوشتہ اند۔ آنان ورق از دفتر باخویش آوردند و برات روزی از ہر در کہ مقدر بود بردند اینان ازاں روکہ انفکاکِ صفحہ از ورق صورت نہ بست۔ تہیدست آمدند، و تھی کیسہ زیستند۔ گفتم از چیست؟ کہ در چار سوے دہر۔ ع۔

بخت صلۂ مدح و قبول غزلم نیست

گفت آں از نیست کہ برات (چھٹی یا چک) نیاوردہ وایں ازانست کہ سخنہائے بلند داری، و بہ ناشناسازیاں (یعنے اجنبی زبان) حرف می زنی۔ گفتم چہ کنم تا از اندوہ باز رہم؟ گفت شکیب ورز و خوں گری و آنچہ از شیخ علی حزیں شنیدہ می گوے سہ

کس زباں مرا نہ می فہمد　　بہ عزیزاں چہ التماس کنم

نشان دادنِ اغلاطِ برہان قاطع سپاس میخواست نہ ستیز، در قلمرو ہند کس نماندہ باشد کہ مرا بدیں نیکی بد نخواندہ باشد۔ یکے خنجر آورد کہ من قاطع قاطع برہانم، دگرے اخگر آورد کہ من محرق آنم کیست تا از من بداں جوانمرداں گوید کہ از دریدن و سوختن کاغذ جز فغاں دخاں چہ خیزد؟ بزہ مند (گناہگار) منم، اگر در آتش فگنند و ربہ تیغ دو نیم زنند بہر دو گزند درخورستم (یعنی لائق ہستم) و بہر دو سزا سزاوار ÷÷÷ سخنداں راستی جوے را بایستہ آنکہ از ہر کتاب فرہنگ عبارت جامع

سہ جو کتابیں قاطع برہان کے جواب میں لکھی گئی ہیں ان میں سے ایک کا نام قاطع قاطع اور ایک کا محرق قاطع رکھا گیا تھا ۱۲

آں رابداں بنگاہ تیز نگرد کہ ازبس تیزی درجوہر لفظ فرود رود تا چگونگی پیوندِ الفاظ کہ انگیزش گاہِ معنی ست آشکار شود۔ ہرگاہ آں را بہنجار اہل زبان نہ بیند۔ واند کہ در سودائے زباندانی جز زیان نبنید۔

دگراں دانند وکار آناں، مرا نیز خردے در وانئے دادہ اند۔ فراز آوردۂ (اپیش آوردہ) اندیشہ بیگانش را چوں پذیرم؟ خرد خداداد کار چرا نگیرم؟ ہستی بخشش را سپاس کہ نبرد فزاے دانش من دانشمند[1] کسی ست کہ اگر چنانکہ راز داں بود۔ راز گوے نیز بودے ششمیں ساسان[2] بشمار آمدے

زخویشاں بہ بیگانگی شاد مانم   نمانم بکس چوں بکس مے نمانم
غریبم ولے روشناس عزیزاں   چنارِ سرافراز در بوستانم
گرفتم کہ از تخم افراسیا بم   گرفتم کہ از نسل سلجوقیانم
دل ودستِ تیغ آزمائی ندارم   رہ ورسمِ کشورکشائی ندانم
بمیدانِ معنی خداوند رخشم   بمضمار پہلوزباں۔ پہلوانم
دو سہ سال توقیع معنی نوشتم   سزد گر نویسند صاحبقرانم

قاطِع برہان۔ کہ صنعت نقشبندِ خیالِ من ست نہ نامہ اعمال من ست کہ دراں جہاں بمن خواہند سپرد۔ ہمدریں جہاں خواہد ماند۔ در دل فرود آمد کہ بمقالے چند کلامے چند بفزایم۔ دایں مجموعہ را کہ قاطع برہان نام نہادہ ام۔ سپس درفش کاویانی خطاب دہم۔

نازم بہ خرام کلک وطرز رقمش   مانا ست زتیزی بدم تیغ ہمش

---

[1] مراد ازاں مولانا عبدالصمد اُستاد میرزا است ؛ [2] ساسان نام پسر بہمن بن اسفندیار بود کہ از بادشاہی بسیاحت و تحصیل حکمت وریاضت پرداختہ و[3] کس از اولاد دے نیز بہ طریق دے بودہ اند وایں ہر چہار را ساسان اول دوم وسوم وچہارم نامیدہ اند من بعد پس از خسرو پرویز ساساں پنجم بظہور آمدہ کہ دساتیر را از لغت ژند در زبان دری ترجمہ کردہ ۱۲

چوں اسم کتاب قاطع برہاں بود   گردید درفش کاویانی علمش

حاشا کہ در ہیچ محل از عقیدۂ خویش رجوع کردہ باشم - سرودن سخنہاے ریزہ (متفرقہ) جز افزودنِ ہوش انگیز (سبب و باعث) ندارد - یاراں جفا کنند ومن بہ ازاے ہر جفاد بعوض ہر جفا وفا ورزم - ہمانا نکوئی وبہی یاراں خواہم ولبس بند نہند، پند دہم - داو دریغ دارند، اندرز دریغ ندارم - سنگ زنند ثمر بارم -

از تقریظات و دیباچہ ہاے

مرزا نے جو تقریظیں اور دیباچے اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابوں پر نثر میں لکھے ہیں ان میں جیساکہ اوپر بیان کیا گیا شاعری کا عنصر نظم سے بمراتب غالب تر پایا جاتا ہے - ہر ایک معمولی بات کو تمثیل اور استعارے کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں فقروں اور اُنکے اجزا میں عموماً ایک خاص قسم کا وزن اور توازن اور اکثر سجع کی رعایت ملحوظ رکھتے ہیں، اکثر جگہ صفات متوالیہ و متتابعہ ایراد کرتے ہیں اور صفات مرکبہ جو نظم کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں اکثر استعمال کرتے ہیں - پس سوا اسکے کہ یہ نثریں شعر کے اوزان مخصوص سے جنکو اُسکی ماہیت میں کچھ دخل نہیں معرا ہیں، ہر ایک اعتبار سے اُن پر شعر کی پوری پوری تعریف صادق آتی ہے -

چونکہ یہ نثریں مرزا نے خاصکر اپنے عالی دماغ اور نکتہ سنج معاصرین کی ضیافت طبع کے لئے لکھی ہیں اور ان میں اپنی لوآئین طرازی اور نادرہ سنجی کا جیساکہ چاہیے - حق ادا کیا ہے اسیلے جب تک کہ ان کے ایک ایک فقرے کی شرح نہ کیجاے عام ناظرین ان سے کچھ لطف نہیں اٹھا سکتے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ کتاب کا حجم زیادہ بڑھ جائیگا جسکی وجہ سے

کتاب کا مطالعہ ناظریں پر شاق گزریگا لہذا اُن نثروں میں سے صرف اسقدر انتخاب کیا جائے گا جس سے مرزا کی ان جزیل اور گرانمایہ نثروں کا کسی قدر اندازہ ہو سکے۔

اس غرض کے لیے ہم اوّل بطور مثال کے مختلف مقامات سے مختلف مضامین کے کچھ فقرے لکھکر دکھاتے ہیں کہ مرزا کس طرح معمولی باتوں کو تمثیل اور استعارے کا لباس پہناکر بلند منظر پر جلوہ گر کرتے ہیں مثلاً کتاب پنج آہنگ کا دوسرا آہنگ جو مرزا نے اپنے نسبتی بھائی علی بخش خاں کی خاطر سے لکھا ہے اور جس میں اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف زبان فارسی کے متعلق کچھ ابتدائی قواعد اور ہدایتیں قلمبند کی ہیں۔ اسکے اول میں ایک تمہید لکھی ہے جس میں طرح طرح سے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس پھیکے اور سیٹھے مضمون پر کچھ لکھنا میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے۔ وہاں ایک جگہ مضمون مذکور کی نسبت لکھتے ہیں "زمینے شور کہ چوں ذوق سے در طینت زاہد۔ ہیچ گلبن را در آنجا ریشہ در خاک نہ دوَد۔ وخلے نا استوار کہ ہر دیوار کہ دراں ریگستاں بر کشند پیش از سایۂ خود بخاک اُفتد۔

فارسی دیوان کے دیباچے میں ایک اس مطلب کو۔ کہ دیوان مذکور اور اسکے نوادر افکار میں آورد اور تصنع یا کسی اُستاد کی بلا واسطہ تعلیم اور ہدایت کو مطلق دخل نہیں ہے اس طرح ادا کرتے ہیں "بنامیزد (یعنی چشم بدوُور) نخستیں نقابے ست از روے شاہد ہر صفت کردہ معنی بجنبش نسیم بر افتادہ ، یعنی ننگ کشاکش دست ناکشیدہ۔ باز پسیں چراغیست از گرمی چراغاں نیم سوختہ پہلو رُخ بافروختن دادہ ، یعنی داغ منّت خس نادیدہ۔"

ایک جگہ اس مطلب کو۔ کہ خدا تعالی نے مجھے جیسا دماغ معنی خیز دیا تھا ویسا ہی معنی کی قدر و قیمت پہچاننے اور اسکے بیان کرنے کا ملکہ بھی عنایت کیا۔ اس طرح بیان کرتے ہیں "سخن آفرین خداے گیتی آراے راستایم کہ تا نہانخانہ ضمیرم را از فراوانی رنگارنگ معنی بہ لعل و گہر انباشت، باز دیم. را تراز وی مرجان سنجی و خامہ ام راہنگامہ گہر باشی ارزانی داشت۔

اب ہم کچھ کچھ عبارتیں دیباچوں اور تقریظوں سے انتخاب کرکے ہدیہ ناظرین باتمکین کرتے ہیں۔

اردیباچہ دیوان فارسی) دیوان فارسی کے دیباچے میں ایک اس مطلب کو۔ کہ لوگ مجھے اکتسابی علوم سے بے بہرہ سمجھکر میرے حسن بیان پر تعجب اور میرے کمال سے انکار کرتے ہیں۔ اس طرح بیان کرتے ہیں "لاے خم مینخانۂ سرمدی نسبت ناچشیدگان۔ سگالند کہ ہیچدانی را این مایۂ سیرابی نطق از کجا است غافل کہ نم رشحۂ یک فیض ست کہ سبزہ را دمیدن و نہال را سر کشیدن و میوہ را رسیدن ولب را زمزمہ آفریدن آموخت۔ و بہ پرتو مہتاب ازلی ہدایت شبگیر نکردگان اندیشند کہ تیرہ سرانجامے را این ہمہ روشنائی گفتار چراست، بیخبر کہ فرہ تابش یک نورست کہ شمع را بشعلہ و قدح را بہ بادہ و گل را برنگ، و دروں را بسخن برافروخت + + + + + + + + +

داغم از کوتہ نظراں تنگ چشم کہ دمیدن تازہ گل از گیاہ و درخشیدن برق بشبہاے سیاہ شگفت ندارند، و جنبیدن زبانہاے گویا بہ سخن ہا۔ نغز و شخوار انگارند۔ غنچہ مشکیں نفس است دباد غالیہ ساے، و گل کشادہ روے و بلبل نواسنج، زباں چہ گناہ کردہ است کہ سخن سراے نباشد مہر جلوہ برتابد، و ذرہ بیتابی و بحر روانی، و قطرۂ تلاطم، دل را کہ گفتہ است

کہ از شورش ستوہ آید۔ ہمانا بدانست ایں گروہ بادہ در خمخانۂ توفیق ہماں قدر بود کہ حریفاں گذشتہ را تر دماغ ساختہ، حالیا بساطِ بزمِ سخن برچیدہ و جام و سبو برہم شکستہ، وازاں قلزم روق نمے برجائے نماندہ، پندارند کاش بانجمنے کہ من در فردیں ردّہ (یعنی صفِ پائیں) بحلقہ او باش قدح می گیرم فرارسند، تا وارسند کہ مے فراواں ست، وساقی بیدریغ بخش پیمانہا جرعہ ریز ست ولبہا العطش گوے وللّٰہ درّمن قال۔

ہنوز آں ابرِ رحمت درفشاں ست مے و میخانہ با مہر و نشان ست

آرائے صہبائے سخن بہ روزگار من از کہنگی تند و پرزور ست، و شب اندیشہ را بہ فردمیدان سپیدۂ سحری برات فراوانیِ نور ست۔ ہر آئینہ رفتگاں سرخوش غنودہ اند، و من خراب ستم پیشینیاں چراغاں بودہ اند، و من آفتابستم۔

اسکے بعد ایک جگہ اپنے تمام فخر و مباہات پر افسوس کرکے اس طرح کہتے ہیں "انصاف بالائے طاعت ست درہوائے کہ بال بالاخوانی (یعنی خودستائی) زدہ ام، و درادائے کہ خود را نشگرفی ستودہ ام، نیمۂ ازاں شاہد بازی ست، یعنی ہواپرستی۔ و نیمۂ دیگر توانگر ستائی یعنی بادخوانی بیداد ببیں کہ ہر جا بشانہ خمے از زلف مرغولہ مویاں کشودہ شود۔ بلا در من آویزد، تا دل بہ پیچاک آں شکن بندمے۔ و خواری نگر کہ ہرگاہ از خود غافل و از خدا فارغے براورنگ سروری کج نشیند۔ ہوس مرا برانگیزد تا بہ پیشش بندہ وار راست ایستے۔ شادم از آزادی کہ لبا سخن بہ ہنجار عشق بازاں گزاردستم، و داغم از آزمندی کہ ورقے چند بکردار دنیا طلباں در مدح اہل جاہ سیاہ کردستم۔ دریغا کہ عمر بسک سیر لختے بجامۂ و چنگ سرآمد، و پارۂ بہ دروغ و دریغ رفت۔ فرجامِ گراں خوابی برخاست،

وآشوب ہوسناکی فرو نہ نشست۔

از خاتمہ دیوان فارسی

خاتمہ دیوان فارسی میں اس بات کا عذر۔ کہ دیوان کی تکمیل میں کیوں اسقدر دیر لگی کہ اکتالیس برس کی عمر میں اسکے چھپوانے کی نوبت پہنچی۔ اس طرح کرتے ہیں کہ فکر نہایت خودسر اور بلند پرواز تھی اسکی روک تھام میں بہت سا وقت گزر گیا۔ اور اس مطلب کو اپنے طرز خاص میں یوں ادا کرتے ہیں۔

"ہاں وہاں رخشے بداں توسنی کہ عنانش موے ومشامش بوے برنتافتے واز شموسی (سرکشی) گام بدرازی تنہادہ جز بہ پہنانہ نتافتے ازترسندہ دلی عنانش کشیدہ، و بہ لابہ آواز بوسہ اش آرمیدہ داشتمے چوں پارۂ از راہ بدینگونہ۔ کہ برشمردم۔ بُریدہ شد، و روز بلند گشت، ہم جوش تندی توسن فرونشست، وہم دست وپاے سوار از عنان ورکاب خستگی پذیر آمد۔ تاب مہر نیمروز۔ مغز در سر سوار گداخت، و تفتگی ریگ بیاباں نعل در پای تگاور نرم کرد۔ رائض را دم درکشید تا قدم بگداز آمد۔ ہم آں بہ آخر گرائید، و ہم ایں را بہ بستر نیاز آمد۔ توانائی بہ چارہ سگالی توسنی سرآمد، و در ہنگام گسستہ دمی خستگی روی آورد++++ کیست تا از من پرسد، و اگر ناپرسیدہ گویم در دلش فرود آید، کہ دریں سی سال ہمت را با فطرت چہ آویزشہا (یعنی جنگہا) روی دادہ ولیس از آنکہ کار بد انجا رسیدہ کہ ہمدگر از کوفتگی فرومانند۔ بمیانجی گری توفیق بکدام قرارداد آشتی اتفاق افتادہ۔ خامہ دیر جنبش بود، و شوق زودگرا (جلدباز) گفتار با از نہیب دور باش اندیشہ بدراز نا ے فاصلہ دل و زباں خوں شد، و اگر ناگہ از دل بہ زباں رسید۔ والا ہیچ ہمت آنرا انجامہ

نہ سپرد۔ ہر چند منشِ طبیعت) کہ یزدانی سروش ست در سر آغاز نیز گزیدہ گوے دلپسندیدہ جوے بود۔ امّا بیشتر از فراخ روی (یعنی بسبب آزادروی) پے جادہ نشناساں بر داشتے، و کشری رفتار آناں را لغزشِ مستانہ انگاشتے تا ہمدراں تگاپو پیشِ خراماں را انجستگی ارزش ہمقدمی (یعنی لیاقت ہمراہی خویش) کہ در من یافتند۔ مہر بجنبید، و دل از آزرم (مروت) بدرد آمد۔ اندوہ آوارگیہاے من خوردند، دآموزگارانہ در من نگرستند۔ شیخ علی حزیں بخندۂ زیر لبی بیراہہ روی ہاے مرا در نظرم جلوہ گر ساخت و زہر نگاہ طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادہ آں ہرزہ جنبش ہاے ناروا دربپاے رہ پیماے من بسوخت۔ ظہوری بسرگرمی گیرائی نفس (تاثیر کلام) خزرے بباز وے و توشہ بکمر بست، و نظیری لاابالی خرام بہنجار خاصۂ خودم بچالش (رفتار) آورد۔"

از دیباچۂ دیوان شفتہ | دیوان تفتہ کے دیباچے کی تمہید میں ضعف و انحطاطِ قویٰ اور اپنے قلب ماہیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں: "ہاں اے غالبِ تیرہ روز دژم اختر! کہ بدیں ہستی و کسائی (شخصیت) کہ تراست۔ بداں ماني کہ دانی در عالمِ فرضِ محال سپندے دیدہ ایم بر آتش آرمیدہ۔ اللہ اللہ چہ مایۂ جوشِ سوداست (یعنی غلبۂ مادۂ سودا) کہ ہر نفسیکہ می کشی۔ چوں خطے کہ از نقطہ بر آورند ہمرنگ سویداست۔ آں قلمرو اندیشہ۔ کہ از روانی خامہ و روائی گفتار آب و ہوا داشت و دے مہش را فروردین پرستار بود، و چاشتگہش را نسیم سحری پیشکار بدیں ناخوشی و نژندی ویراں چراست۔ سبزہ را چہ افتاد کہ بہ چمیدن دل از دستِ تماشائیاں نبرد، و غنچہ را چہ روی داد کہ بہ دمیدنِ

پردۂ شکیب نظارگیاں نہ درد

آں اثرِ پردۂ سازت چہ شد زمزمۂ خارہ گدازت چہ شد
آں زجنوں پردہ کشائیت کو ولولۂ سلسلہ خائیت کو
آں نفسِ نالہ کمندت کجاست واں نگہ جلوہ پسندت کجاست

گفتی (یعنی در جواب گفتہ) کہ سوزِ غم دود از دل بر آورد، و گدازِ نفس آذر در زباں زد بادے کہ ہر آئینہ نگداخت، و بازبانے کہ ہمانا نسوخت، عذرِ غمزدگی مسموع نیست۔ بیا تا ہمیں دل بد زہرۂ الحذر نوائے را بہ سخن نہیم، وہمیں زبانِ کژ نغمہ ایں المضراب را بہ گفتار آریم (یعنی طوعاً وکرہاً تقریظِ دیوان گفتہ بر نگاریم)

زمن جوئے در بد نکو زیستن جگر خوردن و تازہ رو زیستن
سمن چیدن و در رہ انداختن دل افشردن و در چہ انداختن

(مراد از سمن چیدن و در رہ انداختن آنکہ بر ہمگنان اظہار خوشحالی می کنم و اندوہ درونی راکہ دل افشردن عبارت ازاں ست در چاہ می اندازم تا بر ہیچکس ظاہر نہ شود)

رواں کردن از چشم ہموارہ خوں بہ شورابہ شستن ز رخسارہ خوں
شگفتن ز داغے کہ بر دل ربود نہفتن شرارے کہ در دل ربود

ستائشِ سخن چشم بد دور۔ خمکدہ سخن را شرابے ست پر زور کہ زمین ازاں بہ لاے (یعنی بدردے) و سپہر ازاں بہ بوے آنچناں بہ رقص آید کہ اگر کعبہ را حجر الاسود از دیوار و مشتری را عمامہ از فرق فرو د افتد شگفت نہ نماید۔

انتخاب از مکاتبات

مرزا کی نثر فارسی کا سب سے بڑا حصہ انکے مکاتبات و مراسلات ہیں جن میں سے اکثر بہت صاف اور سلیس ہیں۔ اسی لیے ہم اس حصے میں سے بہ نسبت اور نثروں کے کسی قدر زیادہ انتخاب کرینگے اور جہاں تک ہوسکے گا مشکل فقروں اور دقیق عبارتوں کے نقل کرنے سے احتراز کیا جائیگا۔ اور نیز جو امور مرزا کے خانگی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں انکو بھی چھوڑ دیا جائیگا۔

مرزا علی بخش خاں فیروز پور جھرکے میں ہیں، نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہوگیا ہے اور انکی جگہ شمس الدین خاں مسند نشیں ہوئے ہیں۔ مرزا نے علی بخش خاں کو کلکتے پہونچکر خط لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں

سیر نفسل موئے خاں نام یارے داشتم، او را ناگرفت (ناگاہ) در عرض راہ بہ مرشد آباد یافتم وز نوردِ گفتگوہاے دیرس وجو ہاے کر فت۔ از جامہ گذاشتن (یعنی از مردن) فخر الدولہ بہادر بمن خبر داد و باز بہ کلکتہ مرزا افضل بیگ و دیگراں بر گفتند۔ آوخ! کہ چراغ روشن ایں دودمانے مرد، و شبستان آرزو ہا تیرہ و تار شد۔ از جانب شما اندیشناکم و دانم کہ انچہ شمارا پیش آید دلخواہ نباشد۔ ناکساں را روز بازار خواہد بود، و فرومایگاں را گرمی ہنگامہ زود اکہ انجمن از ہم باشد، و پراگندہ چند گرد آیند۔ دولت روی گرداند! و آسودگی بر خیزد۔ زنہار ہوشمندی را کار باید لبست، و ہموارہ بخود نگراں باید بود

ایک اور خط کو جو علی بخش خاں کے نام لکھا ہے اس طرح شروع کرتے ہیں

جاں برادر! سخن را از فراوانی بر روے ہم افتادن ست، و گرہ گردیدن و من آن میخواہم کہ اندک گویم، و سود بسیار دہد، و شنوندہ آں راز دود دریابد و ایں بسیچ (قصد) روائی پذیر نیست مگر آنکہ گویندہ دراں کوشد کہ نیشتن از گفتن آں مایہ دور تر نہ رود کہ سر ایں ہر دو رشتہ باہمدگر نتواں تافت و نقش یکے در آئینہ دیگرے نتواں یافت۔ زمانے گوش بمن دارید و فرا رسید کہ چہ میگویم، و ازیں گفتن چہ میخواہم، و شمارا در برابر آں چہ می باید کرد، و اندازہ آں بایست تا کجا ست" اسکے بعد کچھ خانگی معاملات تحریر کیے ہیں۔

میر اعظم علی اکبر آبادی مدرس مدرسہ اکبر آباد جو میرزا کے ہموطن ہیں، اور اُنھوں نے بیس برس کے بعد مرزا کو خط لکھا ہے اور خط نہ پہنچنے کی شکایت کی ہے انکے خط کا جواب اس طرح لکھتے ہیں۔

امروز شرارہ بداغم زدہ اند　　نشتر برگ صبر و فراغم زدہ اند
از کثرت شور عطسہ مغزم ریش ست　　تا عطر چہ فتنہ بر دماغم زدہ اند

جنبش خامۂ عیسوی ہنگامۂ مطاع مکرم مخدوم اعظم را نازم کہ باحیاے ہوس ہاے مردہ ساحت خاطر را عرصۂ محشر ساخت و بازار رستخیز گرم کرد خار خار دیریں آرزوہا سر از دل بدر آورد، بیاد آمد کہ مرا ہم در گیتی وطنے، و از مہربانان انجمنے بودہ است ۔ چوں نشتر پرسش بمغز اندیشہ فرو بردہ اند (یعنے احوال پرسیدہ اند) خونچکانی نواہا تماشا کردنی ست درازی زمان فراق ۔ کہ بگمان مخدوم شانزدہ سال است و بدانست نامہ نگار کم از بست سال نیست سر تیز کز لکے بودہ است کہ نقش آسایش از صفحۂ خاطر بداں ستردہ اند۔ آغاز و رود بدہلی کہ ورد بادۂ غفلتے بہ قدح

داشتم (یعنی بقیہ ہوا و ہوس در سر بود) لختے از عمر بہ پیمودن جادۂ کامرانی ہوس گذشت، وبے راہہ خوابیدہ شد۔ تا سراز مستی بگردید (یعنی بدمستی سے بھر گیا) واندراں بیخودی پائے معطبہ پیما بہ گوے فرو رفت (گڑھے میں اتر گیا یعنی ایک صدمہ پہنچا کہ نشے ہرن ہو گئے) لاجرم در ہم شکستہ سراپائے، دگر اندوہ سر و روے، برخاستم۔ ہنگامہ دیوانگی برادر یک طرف، وغوغاے وام خواہاں یک سو، آشوبے پدید آمد کہ نفس بلب، ونگاہ روزنۂ چشم، فراموش کرد وگیتی بدیں روشنی روشناں در نظر تیرہ وتار شد۔ بالبے از سخن دوختہ، وچشمے از خویش فروبستہ۔ جہان جہان شکستگی وعالم عالم خستگی، با خود گرفتم۔ واز بیدادِ روزگار نالاں، وسینہ بردمِ تیغ مالاں۔ بکلکتہ رسیدم۔ فرمان دہاں سربزرگی وکوچکدلی (یعنی مہربانی وشفقت) کردند، ودل را نیرو بخشیدند۔ آں ہمہ بخشایش۔ کہ مشاہدہ رفت۔ اُمید کشایش آورد، وذوق آوارگی وہواے بیاباں مرگی۔ کہ مرا از دہلی بدر آوردہ بود۔ بدل نماند۔ وہوس آتشکدہ ہاے یزد ومیخانہ ہاے شیراز۔ کہ دل را بسوی خود میکشید، ومرا بہ پارس میخواند۔ از ضمیر بدر جست (یعنی بمشاہدۂ شہر کلکتہ جملہ ہوسہا از خاطر بدر رفت) دو سال درآں بقعہ مجاور بودم چوں گورنر جنرل آہنگ ہندوستان کرد پیشاپیش دویدم، وبہ دہلی رسیدم۔ روزگار برگشت، وکار ساختہ شدہ۔ صورتِ تباہی گرفت۔ اکنوں ششمیں سال ست کہ خانماں بباد دادہ، ودل بر مرگِ ناگاہ نہادہ بکنجے نشستہ ام، ودر آمیزش بروی بیگانہ وآشنا بستہ"

"من اگر با اینہمہ رنج داندوہ۔ کہ پارۂ ازاں باز گفتم۔ درنگارش نامہ

وسپاسش پیام کاہل قلم وکوتاہ دم باشم، وبزرگانِ وطن را بیاد نیارم، در عالمِ انصاف بزہ مند نیستم - اما گرانمایگان جہانِ مہر و وفا - کہ از دور اُفتادگان نپرسند واز مرگ وحیات دوستاں باز نجویند - اگر گفتگو بمیاں آید، وسمند شکوہ عنان بر عنان (یعنی بمقابلہ یکدگر) تازد گوے دعوے چگونہ خواہند برد، وقطع نظر از حریفِ آب دندان (یعنی حریف مغلوب) کہ منم - خداے توانا را چہ جواب خواہند داد "

کس از اہل وطن غمخوارِ من نیست　　　مرا در دہر پنداری وطن نیست

مولوی نورالحسن نامی ایک نوجوان نے کلکتہ سے مرزا کو خط لکھا ہے اور اسکے ساتھ ایک نثر کا مسودہ اصلاح کے لیے بھیجا ہے - اسکے جواب میں جو خط مرزا نے لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں "پدید آمد کہ خاطر عاطر را بجانب نثر گرایشے، وہنگامہ ایں گفتار (یعنی نثر نگاری) را در آنجا (در کلکتہ) آرایشی ہست - بارے ہم دل بہ پسندیدہ شغلے نہادہ آید، وہم اندریں فن گزیدہ روشے پیش گرفتہ آید - دم سردی شما (یعنی کم شوقی شما) بدانش آموزی آنچہ دیروز (یعنی در زمانہ گزشتہ) بہ کلکتہ دیدہ ام - یاد میکنم - و خول یِ شما (یعنی سرگرمی شما) در خرداندوزی آنچہ امروز می نگرم خود را بدیں شادمی کنم - ہمانا در اندیشہ نہالے بر گذر دارم بداں زودی - کہ ثمر از شاخ افتد نخلے شدہ، و رُطب بار آوردہ، نے نے بہ ہنگامۂ یوسفی در نظر دارم بداں خوبی کہ دل از فرشتہ رُباید - از بند حجاب بدر آمدہ، وبہر ہفت کروہ، خواستہ آید کہ مسودۂ نثر در ہر ماہ بمن فرستید، ومن آں را نگرستہ ونشستِ ہر کرشمہ وانگیز ہر بذلہ را بہ بایستگی آراستہ بشما فرستم - صاحب من! مگر ندانستہ آید کہ گفتار جز بگفتار سرہ نہ گردد، وسخن جز بہ سخن شناختہ نشود ہر چند ارادات شما ذریعۂ سعادت من وخرسندی شما موجب رضامندی من ست

لیکن تحریر درمیاں نگنجد، و بہ میانجی گری خامہ کار برنیاید۔ آرے نگارش یکدست وگفتار لخت لخت ستردنِ یک لفظ ازمیانہ، وآوردنِ لفظ دیگر بجاے آں برنشانہ۔ دانا شناسد کہ چہ مایہ گفتگو و چہ قدر پرس وجو آرد۔ وحق ایں پرسش نتواں گزارد مگر بہمزبانی۔ دریں نزدیکی یکے از برادراں کہ در برادراں ازوے عزیز ترے نیست۔ سخنہاے پراگندۂ مرا کہ عبارت از نثرست۔ گرد آوردہ، وصورت سفینہ دادہ است۔ زیں پس آں مجموعۂ پریشانی را پیش شما می فرستم، تا دستمایۂ سگالش درسخن و باز نمائندہ اندازۂ نکوئیٔ فن تواند بود + +

نواب مصطفٰے خاں مرحوم نے (جبکہ مرزا سے نیا نیا تعارف ہوا ہے) مرزا کو خط لکھا ہے اور اُس میں اُنکی شاعری اور نکتہ سنجی کی بہت تعریف کی ہے اپنے نتائج افکار میں سے کچھ اُنکو بھیجا ہے اور اُن سے تازہ غزلوں کی جو حال میں لکھی ہوں درخواست کی ہے۔ مرزا نے اسکے جواب میں جو ایک طولانی خط لکھا ہے اُس میں ایک لمبی تمہید کے بعد لکھتے ہیں۔

"تا دکانم درکشادہ بود، ورنگ رنگِ متاعِ سخن بروے ہم نہادہ کس از مشتریاں حلقہ بردر نزد، وسوداے خریداری از ہیچ دل سر بر نزد۔ چوں دکان راکالا، وزبان را حرفہاے جگر آلا (یعنی آلودہ بخون جگر) نماند۔ روزگار گرانمایہ خریدارے (یعنی نواب مصطفٰے خاں) پدید آورد کہ نقد رائجِ سخنِ خود را بہ بہاے گفتار ناسرۂ من می دہد، و گوہر را بہ پلّہ بیعانگی خزف می نہد + + + ہاں وہاں اے خریدارِ دکانِ بے رونق! از فراوانی مسرت ورود مسعود ہمایوں نامہ چہ گویم کہ مرا۔ باآنکہ نکوئی خواہ خویشم۔ برمن بہ رشک آورد۔ حوصلۂ مرا۔ کہ

فرسودۂ غمہاے دہرم - گنجائی ایں مایۂ شادی کو؟ و اندیشۂ مرا - کہ دل شکستۂ دور باشِ یارانم - فرجام پذیرائی ایں ہمہ قبول کجا؟ روزگار را از آزار خویش چگونہ پشیمان گیرمے کہ اینچنیں شادی را بخود در پذیرمے و دوستان را تا کجا قدر ناشناس پندارمے کہ از شما ایں قدر ستایش دربارۂ خویش باور دارمے - حقا کہ: آسان ست ستودہ شدن بہ زبان شیوہ بیانان (یعنی فصحا)، و دشوار تر از النست اندازہ نمائی باندازۂ دانایاں"

"قبلہ مزد چہل سالہ جگر کاوی آنست کہ فراہم آوردم، و بر فرق فرقداں ساے افشاندم (یعنی مجموعۂ نظم فارسی) اکنوں آبم بداں روانی و آتشم بداں گرمی نیست - گوئی پس از آختن آں گنج گنجدان رفتہ، و از سخن ہرچہ ازل آوردِ من بود گفتہ شد"

+ + + + + + + + + + + + + + +

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم نے تذکرہ گلشن بیخار کا مسودہ مرزا کے مطالعے کے لیے بھیجا ہے - اسکو دیکھکر مرزا نے نواب صاحب کو یہ خط لکھا ہے"

من کہ زبانم در ستایش بیقرار است و اندیشہ در سگالش (مشورہ) گستاخ امید کہ دراں پایہ بزمرۂ خوشامد گویاں شمردہ نہ شوم - و بدیں مایہ جرأت بزہ مند نگردم - بنامیزد (چشم بد دور) تذکرہ ترتیب یافتہ و مجموعہ فراہم آمدہ کہ پیش طاق بلند نامی را نقش و نگار است و نہالِ نکو سرانجامی را برگ و بار - رہروِ نظر چوں بہ بیداے کنار ناپیداے ذوقِ سخن گام تماشا بر دارد تو شنہ بہ ازیں بہ کمر نتواند بست - خضر باں ہمہ جگر تشنگی کہ سکندر داشت - لبش بر شحۂ آبے تر نتوانست کرد، و آں آب از دریا بخشیدان بود - شما گروہے را از دور و نزدیک بہ سخن زندگانی جاوید بخشیدہ، و ایں لختے از عمر بکار دیگراں کردن ست - جاوداں

زندہ باشید کہ سخن گویاں از شما زندۂ جاوید شدند۔ وہمگناں را بہ نکوئی نام برآمد بارے گہر نہ سفتنِ خامہ وگوہریں نہ گشتن نامہ در ردیف الف بہ نگارش اشعار پروین نثار حضرت آزردہ[5] از چہ دوست؟ ہرچند ذکر خدام برجیس مقام در جریدۂ ایں فن نہ سزاوار شان فضیلت باشد۔ لیکن اگر بمقتضاے فرطِ محبت جراءتے بکار می رفت گناہے نہ بود، ودر تلافی آں بہ پوزش (عذر) نیاز (حاجت) نمی افتاد۔"

حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے مرزا سے جبکہ وہ کلکتے میں مقیم ہیں خواہش کی ہے کہ اگر آپ نے اپنی کچھ نثریں جمع کی ہوں تو بھیج دیجیے۔ اسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں۔

"درد مند نوازا! نسیم ورود مشکیں رقم نامہ غنچۂ ایں راز را پردہ کشائے وشمیم ایں نوید را غالیہ سائے آمد۔ کہ روزگار بہ کزلکِ مطول زمانِ فراق نقش بے اعتباری ہائے من از صفحہ خاطرِ احباب نہ سترده وترکتاز صرصر بیداد جدائی خاکساری ہائے مرا از یادِ عزیزاں نبرده است"

درمغرض طلب نثر فرو ماندہ تر ازاں میزبان بے دستگاہم کہ ناگرفت (اچانک) مہمانے عزیزش از راہ دور در رسد، وبیچارہ بسا بگرد سراپاے سرمایۂ خویشتن بگردد۔ تا شوربائے دو وپخنے ونان کشکینے (یعنی ناں جویں) فراز آرد۔ من وایمانِ من کہ بگرد آوردنِ نثر پراگندہ نپرداختہ وخود را دریں کشاکش نینداختہ ام۔ چہ پیداست کہ فرد ریختۂ کلک ایں کس (یعنی من) نقشے ست نژند (یعنی زشت) یا رقمی ست فرہمند (یعنی خوب)

---

[5] قلمی مسودے میں مفتی صدر الدین خاں مرحوم تخلص بہ آزردہ کا ذکر نہیں کیا گیا تھا مگر مرزا نے جب یہ خط لکھا تو نواب صاحب نے انکا بھی تذکرہ درج کر دیا ۱۲

درصورت اول چہ لازم ست خود را بہ ہیچ فروختن و وبالِ نظارۂ آیندگان بہ سلم خریدن، و در شق ثانی اندیشہ می سنجد کہ رفتگان چہ بردہ اند و گذشتگان چہ یافتہ کہ مارا از روے آں وایہ (یعنی دریوزہ) بیتاب دارد۔ انصاف بالائے طاعت ست۔ بدعوی گاہے کہ توانائی قتیل را بفرہیدگی فرہنگ (یعنی بہ پسندیدگی روش) مسلّم داشتہ ولواے نور العین واقف بشیوائی شیوہ (یعنی بخوبی طرز) برافراشتہ باشند۔ باید گفت کہ نتائج طبع ماکجائی ست و مارا چہ لذت دریں جگر خائی ست سطرے چند دیباچگی دیوان ریختہ کسوت حرف و رقم پوشیدہ، و دودِ سودائے کہ بآرایش سفینۂ موسوم بہ گل رعنا از سویدا جوشیدہ است ارمغان فرستم واز شرم تنگ مائگی آب میگردم۔ والسلام

شیخ امام بخش ناسخ نے اپنا دوسرا دیوان میر موسیٰ جان کے ہاتھ مرزا کو بھیجا ہے اُسکی رسید اس طرح لکھتے ہیں دریں ہنگام کہ فرو ماندگی اندازہ گذشتہ و دل بہ افسردگی خو می گرفتہ است۔ ندانم چہ می نگارم وچہ می نگرم کہ دریں نگریستن نگہ از نا دیدہ در نمی گنجد، و دریں نگارش نامہ از شادی در بنان (سرانگشت) می رقصد۔ بخت را بہ رسائی ستایم و پندارم کہ لبطور معنی رسیدہ ام۔ خود را بگراں مائگی آفریں گویم و انگارم کہ موسیٰ را باید بیضا دیدہ ام۔ اگر مخدوم مرا بگرفتن عیار ایں دعوی حیرتے روے دہد، وایں مایہ بالا خوانی وخود نمائی از من عجب آید۔ گویم ہاں انصاف اسخن بکنایہ می سرایم نہ بگزاف۔ موسیٰ اشارہ بہ سیدی مکرمی میر موسیٰ جان ست، وید بیضا عبارت از دیوان فرد غائی عنواں زہے دیوان کہ مدادش از دودہ چراغ طور ست۔ و غلافش از دیبائے

خُلّہ گوہر قلزم معنی را سفینہ است، و جواہر مضمون را گنجینہ + + + + سبحان اللہ سخن بہ روزگار مخدوم بہ پایہ بلند رسید، و از دور و رونق دیگر پدید آمد، یکتا رسیدن نامہ من بخاطر عاطر جاے گرفت، و شکوہ آں بہ زبانِ قلم رفت، مرا آبرو افزود۔ وارزش مرا در نظرم جلوہ گر ساخت۔ خوشا من کہ دراں چشم و دلم جاے باشد۔ و چوں نامۂ من نہ رسد بازرو ارزد۔ گرد سرایں نوازش گردم، و بریں پرسش جاں برافشانم + + + +

مولانا فضل حق مرحوم کے مکان کے قریب آگ لگنے کی خبر مرزا کو بذریعہ خط موسومہ لالہ ہیرا لال کے معلوم ہوئی ہے اس پر مولانا ممدوح کو اس طرح لکھتے ہیں۔

قبلہ و کعبہ! اگر نہ ایں بودے کہ لالہ ہیرا لال را ہواے دیدن عنقا در سر، و ناگاہ شاہگاہے بہ نشیمنِ تنہائی من گذر افتادے۔ آں در گرفتنِ آتش گرداگرد والا کاشانہ و سوختنِ خانہ و رختِ ہمسایگاں از ہر کرانہ، و نہ رسیدن آسیبے بملازمان در آں میانہ، از کجا شنودمے واگر نہ شنودمے ہر آئینہ ہم حق دوستانہ پرسش۔ کہ شیوۂ غمخواری داننده رباں است۔ ناگزاردہ ماندے، و ہم ایزدی نیایش کہ لازمہ حق شناسی و سپاسگزاری است بتقدیم نرسیدے۔ ہاں اے وفا دشمن! بیگانگاں (چوں لالہ ہیرا لال) کامیاب پیام و نامہ و آشنایان جگر تشنۂ رشحۂ خامہ!!

واے بر من کہ رقیب از تو بہ من نماید نامۂ واشدۂ مہر بہ عنواں زدہ

ہمانا آں سوزندہ آذر سرگرمی شوق از من فرا گرفتہ بود کہ بیتابانہ گرد سر گردید، داندراں اشتلم (شدت) زبانہ و شرارہ در خویشتن نگہداشت ہیہات من کجا و ایں ہمہ دعوی بلند از کجا! خود نمائیہا گمان تاثیر مہر و وفا ست۔

کہ مرا بدیں رنگ ہرزہ لائے ویافہ سرائے دارد، ورنہ آنرا کہ از شعلۂ آہ جگر سوختگاں دامن نہ سوزد، عجب نیست اگر آتش افروختہ پیراہن نہ سوزد۔ شکوۂ پیشانش، وپیغارہ طعنہ) برطرف، خدائے توانا راشکر گویم کہ بلائے بے زینہار از بندگان خویش بگرداند، وتابے دہراں را دیدہ وراں را سر بہ دست افتد۔ کرشمۂ نیروئے جبریلؑ ومعجزۂ آسودگی خلیل را در نظرہا تازہ کرد + + + اگر دانستے کہ پیش خود شرمساری نخواہم کشید، ومرا اندریں محال طلبی برمن زبان طعنہ دراز نخواہد شد۔ ازاں مخدوم بے عنایت پاسخ ایں نامہ وتفصیل ایں ہنگامہ درخواستے وپرسیدمے کہ دراں ہنگام کہ آتش زبانہ زد، ونگ بسرائے تیرگی دودے وتابش نمودے فرا رسید۔ شما چہ می کردید؟ ونور چشم مردمی وفرزانگی مولوی عبدالحق کجا بود؟ وپس ازانکہ رستخیز در ہمسایہ آشکار شد وہزاہز در انجمن افتاد۔ سراسیمگی درونی پرستاراں وبیتابی بیرونی ہواداراں چہ قیامت آورد؟ وایں ہمہ آشوب چہ مایہ دیر کشید؟ وفرجام کار کہ مژدہ ایمنی دادند۔ برکار خانہ دواب وبنہ وبارکماراں (یعنی اسباب ایشاں) کہ اینہارا جز بہ اطراف کاشانہ محل نیست؟ وبیشتر ازینہا طعمۂ آتش بلکہ افروزینہ (ایندھن) آتش ست۔ چہ گذشت؟ لیکن چوں ارزش التفات از من سلب کردہ، ومرا اینک دردل فرود آوردہ داند کہ حالیاں دراں گوشۂ خاطرم جائے نماندہ۔ ہرچہ گفتہ ام بطریق آرزو ست نہ بہ سبیل سوال۔ والسلام

نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے خط کا جواب جس میں شوق ملاقات اور غزل تازہ کی خواہش ظاہر کی ہے اُسکے اور آخر کے فقرے یہ ہیں۔

سحرگاہے کہ دلم از درد شانہ چنانکہ مومن[1] مہرپیشہ از رنج ہمسایہ در آزار باشد۔ بیقرار بود، و دستم از اشتلم بیتابی دل رعشہ دار، فرخندہ سروشے در درآمد، و سپردن بہار سامان نامہ گل بہ جیب تمنا ریخت۔ ہر چند نامہ یار مس امید را کیمیا، و دیدۂ جاں را توتیا آورد، تارکِ اقبال را افسر، و پیکر آرزو را زیور بخشید لیکن از انجا کہ آں قدسی مفاوضہ از شعر و غزل۔ چوں نامۂ اعمال زاہد از ذکرِ مے و شاہد۔ سادہ بود دل سودا زدہ بداں نیاسود، و خمارم بداں یکدو جرعۂ صہبا نشکست گفتم ہے ہے نہ مژدہ دیدارے کہ دل بہ نشاط آں تواں بستن، و نہ کرشمہ غزلے کہ لب بہ زمزمۂ آں تواں کشودن + + + + + امید کہ ازیں بعد زود نہ دیر بانشائی غزل شادم فرمایند، ولوید روبکوتاہی نہادنِ روز فراق کہ اندریں موسم کہ خسرو انجم بہ اسد[2] جاے دارد عجب نیست بفر ستمند دولت و اقبال روز افزوں باد

جواب نامہ شیخ امیر اللہ سرور تخلص " رسیدن دلنواز نامہ دل را نومید و شاخ آرزو را برومند ساخت۔ گلہ از نا رسیدن پاسخ نامہ ہاے خویش میکنید، واز خدا شرم ندارید۔ من خود از جانب شما نگرانی داشتم کہ کجائید؟ وچہ در سر دارید؟ بارے پردہ از روے کار شمار گرفتم، و دانستم کہ یک چند مرا فراموش کردہ بودید، ناگاہ ورود جناب مولانا تراب علی بداں بقعہ اُفتاد، شنید یدکہ فلانی (یعنی غالب) از سخت

---

[1] دل کو مومن سے اور شانہ کو ہمسایہ سے تشبیہ دی ہے ۱۲ [2] یہ خط مرزا نے اسوقت لکھا ہے جبکہ آفتاب برج اسد میں تھا چونکہ اسد مرزا کا تخلص اور انکے نام کا جزو ہے اسلیے آفتاب کے برج اسد میں ہونے سے یہ شگون لیا ہے ایسے وقت میں آپ کا مجھ سے ملنا کچھ دور نہیں ہے ۱۲

جانی ہنوز زندہ است، مہر کہن بجنبید، خواستید کہ بنامہ یاد آورد ید از فراموشی روزگار گذشتہ اندیشہ کردید، لاجرم دروغے چند برہم یافتید. واں را دیباے دیباچہ نامہ ساختید۔ از حالِ من پرسیدہ اید۔ چہ گویم کہ بگفتش نیرزد۔ چنانکہ گفتہ اند۔

شکستہ دل ترازاں ساغر بلورنیم   کہ درمیانہ خاراکنی زدور رہا

خیرہ سر، و آشفتہ راے، نہ زباں سخن سراے، و نہ دل از سراسیمگی برجاے۔ چہار سال میگذرد کہ مقدمہ من باجلاسِ کونسل درپیش ست، و دلم از تفرقۂ بیم و امید ریش۔ حکمے کہ قطع خصومت تواند کرد برنیامدہ، و ہنگام بہ پایاں رسیدن تیرہ شب نا امیدی درنیامدہ حالیا براں سرم کہ چوں جزو اعظم کونسل اشرف الامرا لارڈ ولیم کونڈس بیٹنگ بہادر بدیں دیار در آید بدامنش در آویزم، و داد خواہم، و استدعاے صدورِ حکم اخیر کنم۔ گروہے برآنند کہ نواب عالیجناب بہ دہلی نخواہد آمد، و ہم ازاں رہگذرہا بہ اجمیر خواہد رفت۔ اگر ہمچنیں ست بداین روزگار من، و آوخ از دوری راہ و درازی کارِ من۔

خواستہ آید کہ نتائج طبع والاے شما بنگرم واز تراویدہ ہاے کام و زبانِ خود بشمار معانی فرستم۔ فرصتِ آں کجا؟ و دماغ ایں کو؟ آمد آمدِ نواب گورنر، و دریوزۂ اخبار از بہر ترتیب افراد مقدمہ، و تمہید نگارش حال سنجیدن اندیشہ ہاے رنگا رنگ او سگالیدنِ اندازہ بیان آں مایۂ دستیاری و غمخواری از کسے چشم نہ دارم کہ چوں ورقے انشا کردہ باشم نقل آں تواند برداشت یا چوں دفترے از بہر نگریستن پریشاں کنم آں اوراق پراگندہ را فراہم تواند کرد بہر رنگ چندروز دگر معاف دارید، و تا زمانیکہ بمن بپیوندید گاہ گاہ بہ نامہ رنگ

زدائے آئینہ وادادباشد۔

مولوی سراج الدین احمد لکھنوی جو کلکتے میں کسی عمدہ خدمت پر ممتاز ہیں اور مرزا کے نہایت سچے اور گاڑھے دوست ہیں انکو نواب امین الدین خاں مرحوم کے باب میں جبکہ وہ رئیس فیروزپور جھرکہ کے خلاف اپنے مقدمہ کی پیروی کے لیے کلکتے گئے ہیں۔ اس طرح لکھتے ہیں مخدوم غالب! اگر نہ اندوہِ سترگ بند بر دلم نہادہ بودے - من دانم و دل کہ در شکوہ چہ روش ہا ایجاد و در گلہ چہ عربدہ ہا بنیاد کردمے - صرفہ شما (یعنی سود شما) در ناکامی من ست (جسکے سبب سے شکوہ کرنے کی فرصت نہیں ہے) ورنہ اگر تاب و تواں داشتمے آں قدر با شما در آویختمے کہ شمارا دامن و گریباں بزیاں رفتے - و مرا سر درد شکستے - آخر از خدا بترسید، و از رویدادِ بسنجید کہ کار من و شما بداں رسد کہ روز ہا بگذرد و بہ نامہ یاد نگردم گفتم (یعنی میں اوپر کہہ چکا ہوں) کہ در بند گزارش اندوہِ تازہ ام شکوہ کجا بخاطر ناشادمی رسد اگرچہ اندریں ورق گنجائی ایں دو سطر نیز نہ بود - لیکن اندیشہ بداں پیچید کہ مبادا دوست ادانہ شناس من مرا از خود خرسند داند و بدیں گمان از تلافی فارغ باشد و من زیاں زدۂ جاوید و گسستہ امید باشم۔

بالجملہ دریں نامہ نگاری مدعاے اصلی بدیں رنگ ست کہ برادر صاحب شفیق نواب امین الدین احمد خاں بہادر ابن فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ را ہماں موجِ بلا کہ زورِ قم شکستہ بود (یعنی تعدی رئیس فیروزپور) خانہ بسیلاب فنا داد - خونِ وفایم بگردن کہ دریں سفر از ہمپائیش باز ماندم - واماندگی و بیچارگی من ازینجا

تو آں سنجید کہ دنداں بر جگر نہم، و امین الدین احمد خاں را در سفر تنہا گذارم اگر قاضی محبت بدیں جرم بر نطعم نشاند، و بہ تیغ بیدریغ خونم بریزد، سزاوارم ولطف دریں ست کہ ہر چند دریں باب بگفتار گرایم، و ہنگامہ پوزش آرایم ما شرمساری بیشتر گردد و خجلت افزاید، مگر سراج الدین احمد بہ تلافی برخیزد و تا از گرانی تشویر (شرمندگی) سبکدوش کردم، و گرد خجلت از چہرہ برافشانم - یعنی کمر بہ غمخواری و رہبرو نوازی استوار بندید، و خود را دوست دیرینہ امین الدین خاں دانستہ آنچناں چارہ سازی و سگالش گری بجا آرید کہ ایں دردمند دور از خانماں (یعنی امین الدین خاں) اسد اللہ روسیاہ را فرامش کند، و شما را بجای او داند - و نیز بہ برادر والا قدر گفتہ شدہ است کہ چوں بہ کلکتہ رسد و شما را دریابد - داند کہ اسد اللہ پیش از وبہ کلکتہ رسیدہ است - قطع نظر ازیں مدارج کہ برشمردم - آخر خدائے ہست و دادے ہست - افسانہ ناکافی و ستم کشیِ ایں فروغ ناصیۂ سعادت یعنی امین الدین احمد خاں خارہ را دل بگدازد، و آہن را آب گرداند -

دوسرا خط مولوی سراج الدین احمد کے نام اس طرح شروع کرتے ہیں

گوہر آگیں نامہ دلنواز پس از روزگارے دراز رسید، و دیدہ و دل را فروغ و فراغ بخشید نارسیدن نامہ مرا بافسردگی شوقم حمل کردید، چرا بگرگ من حمل نہ کردید؟ تا از اداشناسی ہائے شما خرسند بودمے و شما را اہل دل و دانشور شمردمے - من و ایمان من کہ ریشۂ مہر شما بہ مغز دل دویدہ و محبت شما با جاں در آمیختہ - تا زندہ ام، بندہ ام - وفا آئین من ست و مودب دین من ست اگر در نگارش نامہ درنگے روے دہد بہ فراموشی محمول نہ شود - دردہا در دل، و ہنگامہ ہا در نظر و تفرقہ ہا در خاطر، و سوادہا

در سر - چہ گویم چہ می کنم - ورنہ شب چگونہ بسر می برم + + + + + +

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو استرلنگ صاحب فارن سکریڑی گورنمنٹ ہند کی وفات پر اس طرح لکھتے ہیں "عمر من وجان من! پس از رسیدن گرامی نامہ در بند آں بودم کہ پاسخ گزار شوم و ماجرائے خود شرح دہم ناگہاں دی کہ دوشنبہ پانزدہم ذی الحجہ بود آوازہ در افتاد کہ مجموعہ مکارم اخلاق را شیرازۂ وجود از ہم گسیخت، شمع ایوان سروری مُرد و نہال باغ آگہی را برگ و بار فرو ریخت - دستگیر درماندگاں رادست از کار رفت و گرد کشای بستہ کاراں رانے بناخن شکست - خاکم بدہن - چگونہ گویم؟ و اگر من نہ گویم کیست کہ نمیداند؟ کہ مستراندروا استرلنگ مرد، و از گیتی جز نام نیک باخود نبرد - کاش روے گداختہ (پگھلی ہوئی کانسی) بروز بگوشم ریختندے تا نہ شنودمے کہ چہ شد - اکنوں امید غمخواری از کہ بایدم داشت و دل را بخیال گردش چشم کہ تسکین داد - رپورٹے کہ فرانسس ہاکنس بہادر خصوص داد خواہی من بہ صدر فرستادہ است - چہ گویم کہ چہ امیدگاہ واندوہ فزاے بودہ است برکارسازی آں چابک خرام بیداے فنا (یعنی استرلنگ) داشتم اکنوں از شش سو فلک بکام دشمن ست زینہار در پاسخ ایں نامہ درنگ روا مدارید، و بنویسید کہ آں والا گہر را چہ روی داد، و آں گلبن روضۂ مردمی را کدام تند باد از پا فگند، و پس از روی سرانجام دفتر کدہ چہ شد و جایش کہ گرفت - اللہ بس ماسویٰ ہوس -

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو اپنے ایک کلکتے کے دوست مرزا احمد بیگ کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں "والا نامہ رسید و نوید فراق دائمی مرزا احمد رسانید چہ مایہ سنگین دل و سخت جانم کہ نامہ در تعزیت

دوست انشا میکنم واجزائے وجودم از ہم نمی ریزد۔ می گفت کہ بدہلی می آیم وعدہ فراموش بیمروت راہ گرداند، وناقہ بسر منزل دیگر راند گرفتم گہ خاطر دوستاں عزیز نداشت۔ چرا بحالِ خورد سالاں خود نپرداخت وسایہ از سر ساں باز گرفت۔ وائے بے یاری یاراں وے، ودریغا بے پدری پسراں وے۔ ہر چند از مرگ نتواں نالید، وگسستن تار وپود پندار ہستی را چارہ نتواں کرد۔ لیکن انصاف بالائے طاعت است، ہنوز ہنگام مردن مرزا احمد نہ بود۔ چرا آں قدر صبر نہ کرد کہ بہ کلکتہ رسیدے، وروئے نظارہ فروزش دگر بارہ دیدے۔ چرا آں مایہ درنگ نہ ورزید کہ حامد علی جواں گشتے، وکارہا باندازہ دانش وے رواں گشتے۔ حیف کہ مہیں پسرش خردِ دل ست وباشد کہ بہ حقیقت سرمایہ پدر دانا، وبگرد آوردنِ زرہائے پراگندہ توانا نباشد۔ وباشد کہ چوں آں سرمایہ بہ جنگ آرد بباد دہد، دبرفر دوستاں خود ستم کند، دکہیں برادراں ناکام گزارد۔ ہر آئینہ دریں حال امینے باید ہوشمند وحق شناس کہ گرد چارہ برآید وغمخواری بے پدر ماندگاں نماید۔ للہ در من قال ؎

مرا باشد از دردِ طفلاں خبر   کہ در طفلی از سر برفتم پدر

واللہ کہ تیمار آں بیچارگاں عین فرض وفرضِ عین ست ہم بر شما وہم بر مرزا ابو القاسم خاں بیکسی ایں جماعہ در نظر باید داشت وغافل نباید بود ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین احمد سے دوستانہ شکایت اس طرح کرتے ہیں۔ زینہار صد زینہار اے مولوی سراج الدین! بترس از خدائے جہاں آفریں کہ چوں قیامت قائم گردد او آفریدگار بنشیند

سن گریاں و مویہ کناں دراں ہنگام آیم او در تو آویزم و گویم کہ ایں آنکس ست کہ یک عمر مرا بہ محبت فریفت و دلم برد، و چوں من از سادگی بروفا تکیہ کردم، او ایں را از دوستاں برگزیدم۔ نقش کج باخت و بمن بیوفائی کرد۔ خدا را بگو کہ آں زماں چہ جواب خواہی داد؟ و چہ عذر پیش خواہی آورد؟ وائے بر من کہ روزگار ہا گذرد و خبر نداشتہ باشم کہ سراج الدین احمد کجاست و چہ حال دارد۔ اگر جفا بہ پاداش وفاست بسم اللہ ہر قدر توانی بیفزائے کہ اینجا مہر و وفا فراواں ست، لاجرم جفا نیز باید کہ فراواں باشد و اگر خود ایں تغافل بہ ہاء افراہ یعنی (بہ پاداش) جرمے دیگر ست نخست گناہ را خاطر نشاں باید کرد، وانگاہ انتقام باید کشید، تا شکوہ درمیان نگنجد و مرا از بہرہ گفتار نباشد۔ ہم کہ معاش من از گونہ گوں رنج و رنگ رنگ عذاب بمعاد کفار ماند، خوں در جگر و آتش در دل و خار در پیراہن و خاک بر سر۔ ہیچ کافر بدیں روزگار گرفتار مباد، و ہیچ دشمن ایں خواری مبیناد۔ راست بہ تنہا روی مانم کہ در صحرا پایش بگل فرو ردد، و ہر چند خواہد کہ بالا جہد نتواند و فرو تر رود۔ والا قدر نواب امین الدین احمد خاں بہادر رنگینی را بروئیش دیدے، و وصالش را زندگی دانستے بکلکتہ رہگرا شد دیگر زندگی از بہر کہ خواہم و دل را بدیدار کہ شادماں دارم۔ واماندگی من از بیچارگاں سنجید کہ نتوانستم ہمپائیش کردن و روا داشتم او را تنہا گذاشتن؟

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین کو اپنے مقدمہ کے بگڑ جانے کا حال اس طرح لکھتے ہیں "کار من بداد گاہ دہلی چنانکہ دانستہ باشید۔ تباہی گزید۔ حالیا بداں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد، باز بداں درالیعنی در سپریم گورنمنٹ) رسم و درد دل بداں زمزمہ فرو ریزم کہ مرغاں ہوا و ماہیان دریا را بر خود گریانم۔

هیهات! اگر معاش من ہمیں پنجہزار روپیہ سالانہ بہم بدیں تفریق از روے
دفتر سرکار ثابت شدہ بود بایستے کہ صاحبان صدر مرا از پیش راندے
وگفتندے کہ ہرزہ مخروش، آنچہ تو بازیافت وانمودہ یافتنی ازاں افزوں
تر نیست او قرارداد نیز ہماں ست لاجرم دیوانہ بودمے اگر بدیں کشور باز
آمدے، و بایک قبیلہ (یعنی با جمعے کثیر) کہ خویشاں و برادران من اند-
بہ ستیزہ برخاستمے - وبہ باطل ستیزی نام برآوردمے + + + + + +
چہ کنم کہ کار برگشت، و روزگار برگشت - خدارا بنگر، وبہ دردِ دلِ من
وارس - کولبرگ بتوسط کرنیل ہنری املاک بر من مہرباں شود ورپوٹے
کہ خوشتر ازاں نتواں اندیشید بصدر فرستد، وجوابے - کہ سودمند تر ازاں
نتواں سنجید - از صدر حاصل نماند، ہنوز آں جواب در راہ باشد، کولبرگ
معزول گردد - وہاکنس نکو بجاے کولبرگ نشیند - انچہ برہم زدن ہنگامہ
سلطنتے رابس باشد - از بہر من بصدر نویسد، ومن دراں داوری (معاملہ)
از مسٹر اسٹرلنگ چشم یاوری داشتہ باشم، ہنوز آں رپوٹ بصدر نہ رسیدہ
باشد کہ مسٹر اسٹرلنگ رہرو راہ عدم گردیدہ باشد - چوں از ہمہ بگسلم
وبدامن جارج سوئیٹن بہادر آویزم، گرم از جا برخیزد، و دامن بر شغل
جہاں بانی افشاند - سبحان اللہ! معزول نگردد مگر کولبرگ، جمرگ ناگاہ
نمیرد مگر اسٹرلنگ - بولایت نہ رود مگر جارج سوئٹین، درخور ایں صدمہا
جانکاہ نباشد مگر اسد اللہ دادخواہ + + + + + + + + + + + + + +

مولوی سراج الدین احمد کے نام ایک اور خط "دلنواز نامہ پس از
عمرے رسید، وعمرے دیگر بخشید، تا عمر باندوہ سپری شدہ را تلافی تواند کرد-
اما شاد کردن دلے کہ نہادش بہ غم سرشتہ باشند نہ آساں ست - منم کہ

چوں نامہ شمار سیدنے مستانہ از جاے برجستیے، وجہاں جہاں نشاط اندوختے اینکہ تاچشم بہ سواد ایں صحیفہ دوچار شد گیتی در نظرم تیرہ وتار شد نخست انچہ بنظر در آمد خرد آشوب خبرے بود کہ دل تا جگر خوں کرد۔ یعنی از جہاں رفتن خواہر عزیز شما ہے ہے! مخدومہ مرحومہ ہمان ست کہ تا در کلکتہ خبر رنجوری وے شنود بودید دل از دست رفتہ بود، و سراسیمگی سراپاے خاطر را فرد گرفتہ در نظر دارم کہ از مردنش بر شما چہ قیامت گذشتہ باشد توانا ایزد پاک شمارا شکیب عطا فرماید۔ و تنومندیِ دل و توفیق ثبات ارزانی دارد و ایں سانحہ را دیباچۂ روزنامۂ عمر شما خاتمہ مکارہ و مقطع مصائب گرداند،

آشکارا شد کہ مخدوم مرا از علاقۂ تازہ خوشنودی نیست۔ ہر آئینہ انکشافِ این معنی غبار ملال بر دل فرو ریخت۔ خدارا دل تنگ نتواں شد، و کلکتہ را غنیمت باید پنداشت شارستانے (معمورہ) بدین تازگی در گیتی کجاست۔ خاک نشینی آں دیار را از اورنگ آرائی مرز بوم دیگر خوشتر من ونداکہ اگر متاہل نہ بودمے، و طوق ناموس عیال بگردن نداشتمے، دامن بر ہر چہ ہست افشاندمے، و خود را دراں بقعہ رساندمے۔ تا زیستمے دراں مینو کدہ بودمے، واز رنج ہوا ہای ناخوش آسودمے۔ زہے ہوا ہاے سرد، و خوشا آبہاسے گوارا۔ فرُخا بادہ ہاے ناب و خرما ثمرہاے پیش رس

ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد غالب آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

مولوی سراج الدین کو مرزا صاحب نے کسی واقعہ کا قطعہ تاریخ لکھکر بھیجا ہے اور انھوں نے بغیر خواہش مرزا صاحب کے وہ قطعہ بہت سی مدح و ستایش کے ساتھ اخبار آئینہ سکندر میں چھپوایا ہے۔

جب وہ پرچہ مرزا کی نظر سے گزرا ہے تو اسکا شکریہ اور ایک اور خبر کے درج کرنے کی درخواست اس طرح کی ہے" گمنامے را نامور ساختن، و ہیچے را ہمہ پنداشتن عنایتے ست سترگ و مرحمتے ست بزرگ۔ خاصہ کہ آں سترگ عنایت بے ابرام داعی روے نماید، وآں بزرگ مرحمتے بے استدعاے سائل بظہور آید۔ نگرندہ اگر دیدۂ حق بیں دارد۔ بنگرد کہ واجب تعالیٰ شانہ، اجزاے ممکنہ را۔ کہ در کتم عدم متواری بودہ اند۔ بمحض عنایت پیرایۂ وجود بخشیدہ و بران معدومات منت ننہادہ۔ حقا اگر تاملے بسزا کردہ شود۔ رقم گشتن قطعہ تاریخ در آئینہ سکندر ازیں عالم خبر میدہد۔ وچوں ناخواستہ اینچنیں نوازش بمیاں آمد۔ ہر آئینہ روائی خواہش راچگونہ چشم نتواں داشت۔ لاجرم در گزارش مدعا فصلے بمیاں نہادہ آرزو را سرانجام گفتگو دادہ می شود۔

نہفتہ مباد کہ قدرنشناسی حکام رنگ آں ریخت کہ فاضل بے نظیر دالمعی یگانہ مولوی فضل حق از سررشتہ داری عدالت دہلی استعفا کردہ خود را از ننگ و عار وارہاند۔ حقا کہ اگر از پایۂ علم وفضل و دانش وکنش مولوی فضل حق آں مایہ بکاہند کہ از صد یک واماندہ، و بازاں پایہ را بسر رشتہ داریِ عدالت دیوانی سنجیدہ، ہنوز ایں عہدۂ دون مرتبہ وی خواہد بود بالجملہ بعد ازیں استعفا نواب فیض محمد خاں (رئیس جھجھر) پانصد روپیہ ماہانہ براے مصارفِ خدام مخدومی معین کردہ نزد خود خواند۔ روزیکہ مولوی فضل حق ازیں دیار می رفت ولیعہد خسرو دہلی صاحب عالم مرزا ابوظفر بہادر مولانا را۔ تا پدرود کند۔ سوے خود طلبید، و دو شالہ ملبوس خاص بدوش وے نہاد، وآب در دیدہ گرداند، و فرمود کہ "ہرگاہ شما می گوئید کہ من رخصت می شوم۔ مرا جز اینکہ بپذیرم۔ گریز نیست۔ امّا ایزدِ دانا داند کہ لفظ وداع

از دل بہ زبان نمیرسد الا بصد جرثقیل تا اینجا سخن ولیعہد بہادر ست۔ غالب مستہام از شمامی خواہد کہ واقعہ تودیع مولوی فضل حق، واندوہ ناکی ولیعہد بہادر، وبدرد آمدنِ دلہاے اہل شہر، بعبارتے روشن وبیانے دلآویز در آئینہ سکندر بقالبِ طبع درآرید، ومرا دریں تفقد منت پذیر انگارید۔
والسلام۔

مولوی سراج الدین احمد نے خط اس مضمون کا بھیجا ہے کہ مرزا صاحب کچھ حالات پارسیوں کے اسلاف کے لکھیں اور کوئی ایسی کتاب کا نشان دیں کہ جس سے انکے مفصل حالات معلوم ہوں نیز کسی تذکرے میں درج کرنے کیلیے مرزا کے اشعار کا انتخاب اور خود مرزا کا ترجمہ طلب کیا ہے اسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں۔

ہر نسیمے کہ زکوے تو بخاکم گذرد　　یادم از ولولۂ عمر سبکتاز دہد

رسیدن مہر افزا نامہ دل برد، وجاں بخشید۔ اگرچہ آں جاں بآں نماند، وہم بر سر آں نامہ بہ فشاندن رفت، لیکن سپاس دلربائی وجاں بخشی باقی ست۔ امید کہ تا جاں بخشیدۂ یزداں در تن ست گزاردہ آید۔

مخدوم من در رسیدن نامۂ پیشیں دو دل (متردد) چراست؟ ہنوزم نشاط ورود آں نمیقہ در دل، و سواد سطور آں صحیفہ در نظر جا دارد۔ چوں فرماں چناں بود (یعنی در نامہ پیشیں) کہ غالب خویشتن۔ لختے از رسم وراہ ستر گانِ پارس برگوید، وکتابے ازاں گروہ نشاں دہد کہ ازاں دیریں کیش، د ساز ایں باستانی زبان۔ ازاں اوراق تواں یافت، لاجرم دانش من (علم من) اندازہ سرانجامِ پاسخ آں برنتافت (تحمل نکرد) چوں دوبارہ گفتند کہ خواہش چنیں ست۔ ناچار مہر خموشی از دہان وپردۂ شرم

نادانی از میاں برداشته میگوئیم که روائی ایں خواہش از ہیچکس چشم نتواں
داشت، و خود را به بند ایں پژوہش (تلاش) خسته نتواں کرد - نگارندۂ
دبستان مذاہب با اینہمه لاف آشنا روئی (واقفیت) آنچه می گوید نه ہمه
است و نه ہمه برجائے خود ست (یعنی نه مکمل ست و نه سراپا صحیح ست)
پارسیانیکه در سورت و بمبئی آشیاں دارند - زینہار گماں نبری که
ازاں گروہ (یعنی از ستر گانِ پارس) جز نام نشان دارند - آں پویۂ و آں
ہنجار (یعنی آں روش و آں طریق) و آں نگارش و آں گفتار نداننده، و
جز تخمه و نژاد از روئے شیوہ بپارسیاں نمانند - پارسیاں از گرانمایگان
روزگار، و برگزیدگان دادار بوده اند، و به روزگار فرماں روائیِ خویش
دانشہائے سودمند (علوم مفیده) و کنشہائے خرد پسند (اخلاق پسندیده)
داشتند - کشایشِ رازِ خرامش ہفت سپہر، و نمایش اندازه گردش ماه
و مہ، پدید آوردن رخشنده گہرہا از ته خاک، و بدر کشیدن بادۂ ناب
از رگِ تاک پژوہش اسباب خستگی و رنجوری، و گزارش احکام پزشکی
(طبابت) و چاره گری، پرده کشائیِ فہرست اسرار کیانی (سلطنت)
و فرماندہی، و رصد بندیِ تقویم آثار بندگی و فرمانبری، عنوانِ بیک
دگر بستن رنگ رنگ گہرہا، و ہنجار سره کردن گونه گوں ہنرہا، دارو
گیاہا فراخور ہر درد بکار اندر آوردن، و پرندگان ہوا و درندگان دشت را به شکار اندر
آوردن، کوتاہی سخن - والائی انداز ہر گونه بنیش، و پیدائی اندازۂ
کمال آفرینش، ہمه در آئینه اندیشۂ ایں فرزانگاں روی نموده - و انگیزش
بایستگی گفتار و کردار که اکنوں به اند که ازاں بسیار نازند - از مغز دانش
ایں فرہنگیاں بوده است گنجینۂ خسرواں پارس را از ہر علم دفترِ

بود، و ہر دفتر ازگراں مائگی گنج گوہرے - چوں دولت ازاں طائفہ روی برتافت، و سکندر ابن فیلقوس بر ایران دست یافت، کتب خاصہ خسروی بتاراج رفت - اما انچہ پراگندہ بود و گمنامان بہر گوشہ و کنار داشتند - بر جا ماند - تا بہ روزگار پیروزی تازیاں دراں کشش و کوشش از ہر جا گرد آمد - (فراہم آمد) و بر فرمان خلیفہ - افروزنیہ گلخن گرما بہائے (حمام ہائے) بغداد شد - ہمانا احکام آذر پرستی ہم بہ آذر بازگشت - زباں آورانِ عرب پارسی را بتازی آمیختند، و زبانے تازہ برانگیختند تا بداں زبانِ کہن سخن درست تواند گفت، و ازاں دیریں آئیں براستی خبر تواند داد - پژوہندۂ ایں راز را کام دل بر نیاید، و من ضامن کہ ہر چہ پس از فراواں جستجو فراہم آرد - نہ آنچناں باشد کہ دل بداں تواں نہاد -

دیگر انچہ کلک مشکبار بداں رفتہ کہ منتخبے از گفتار ناروائے خود برنگارم و لختے از ماجرائے خود برگزارم - اندیشہ را بہ لب گزیدن و خرد را بشگفت راز (در محل تعجب) افگند -

چگویم از دل و جائے کہ در بساطِ من ہست ستم رسیدہ یکے ناامیدوار یکے

از چہ بداں ارزم و مرا ایں پایہ از کجا باشد کہ ستودگان مرا ستایند، و گفتار مرا در تذکرۂ شعرا جا دہند - اے سر جام فرہندی ہستی (یعنی از شان و شکوہ ہستی) و سرو برگ پیدائی - کہ نزدِ آشکارا بنیاں زود زوال و بوالا دیدہ یکتا گزیناں (یعنی قائلان وحدت وجود) نمود بے بود ست انچہ بمن دادہ اند زبانے ست یافہ سرائے و خامہ ایست بیہودہ پوئے - من ہم از بے مائگی چوں کودکاں کہ درم از سفال سازند و

بہ گنجینہ داری نازند۔ سرودۂ زبان و بیہودۂ خامہ را (یعنی کلام خود را) پارہ پارہ بہم بستہ و ریزہ ریزہ یکجا کردہ۔ بگمان نام آوری کہ دل از تاب اندوہ ناروائی آں خون ست۔ دیوانے ترتیب دادہ جا بجا بنظرگاہ التفاتِ یاراں فرستادہ ام بزرگانے کہ بہ پرسش غالب مستمند روے آرند۔ سواد ہر غزلے کہ خواہند ازاں اوراق بردارند، کہ انتخاب و التقاطِ اشعار حوالہ بہ راے نامہ گرد آور (یعنی مولف تذکرہ) است، نہ باشارۂ و ایماے سخنور + + + اما اگر گزارشِ حال سخنور ہوس ست، خود ایں مایہ بس ست کہ چوں در جریدۂ آں فن از من سخن رانند سخن را در ستایش، من بدیں گونہ بہ کرسی نشانند کہ از ناکسانِ روزگار و بیکسان دہلی دیار مسلمان زادہ ایست کافر ماجرا، و گبریست مسلمان نما، کہ از غلط نمائی غالب تخلص می کند و بدیں رنگ ژاژ می نماید۔

خرسندیِ غالب نبود زہمہ گفتن یک بار بفرماے کہ اے ہیچکس ما

پنہاں نما نا دکہ در اصل آفرینش از دودۂ روز فرو رفتگاں، و حلقۂ بخت برگشتگاں۔ ستم رسیدۂ دروے بہی نادیدہ کستم، آرایش سخن پیش کش (یعنی برطرف) ترک نژادم، و نسب من با فراسیاب و پشنگ می پیوندد۔ بزرگان من از انجا کہ با سلجوقیاں پیوند ہم گوہری داشتند، ولیعہد دولت ایشاں رایت سرداری و سپہبدی فراشتند۔ بعد سپری شدن روزگار جاہ مندیِ آں گروہ (یعنی سلجوقیاں) چو ناروائی (کساد بازاری) و بینوائی روے آورد۔ جمعے را ذوق رہزنی و غارتگری از جاے برد، و طائفہ را کشاورزی پیشہ گشت۔ نیاکانِ مرا بہ توراں زمیں۔ شہر سمرقند آرامشگاہ شد۔ ازاں میانہ نیاے من از پدرِ خود رنجیدہ آہنگ ہند کرد،

و بہ لاہور ہمراہی معین الملک گزید، چوں بساطِ دولتِ معین الملک در نوشتند، بدہلی آمد، و با ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں بہادر پیوست زاں پس پدرم عبداللہ بیگ خاں - بشاہجہاں آباد بوجود آمد، و من بہ اکبر آباد چوں پنج سال از عمر من گذشت - پدر از سرم سایہ برگرفت - عمِ من نصر اللہ بیگ خاں چوں خواست کہ مرا بہ ناز پرورد - ناگاہ مرگش فراز آمد - کما بیش پنج سال پس از گذشتن برادر پے مہین برادر برداشت و مرا دریں خرابہ جا تنہا گذاشت - و ایں حادثہ کہ مرا نشانۂ جاں گدازی و گردوں را کینہ بازی بود در سال ہزار و ہشت صد و شش عیسوی بہنگام ہنگامۂ لشکر آرائی و کشور کشائی صمصام الدولہ جرنیل لارڈ لیک بہادر بروئے کار آمد - چوں عمِ مرحوم از دولتیان دولت اہل فرنگ و با انبوہی چار صد سوار برکاب صمصام الدولہ، با ہرکشاں سرگرم جنگ بود، و ہم از بخشش ہائے سرکار انگریزی دو پرگنہ سیر حاصل از مضافات اکبر آباد بہ جاگیر داشت - سپہ سالار سرکار انگلشیہ بہ خونبہائے آفتاب (یعنی نصر اللہ بیگ خاں) کلبۂ تار گدایاں را چراغ، و ماہنوریاں را بعوض جاگیر بمشاہرۂ از خار خار جستجوئے وجہ معاش فراغ بخشید - تا امروز - کہ شمارۂ نفس شماری زندگانی بہ چل و چار میرسد - بداں راتبہ خرسندم، و بداں مایہ قانع در سخن از پرورش یافتگانِ مبدا فیاضم، و سوادِ معنی را بفروغ گوہر خویش روشن کردہ ام از ہیچ آفریدہ حقِ آموزگاریم بگردن، و بارِ منتِ رہنمائیم بر دوش نیست -

غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم — زاں رو بصفائے دمِ تیغ است دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بشعر — شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

نامہ بہ پایاں رسید، وشرم پراگندہ گوئی و درازنفسی برمن اشتلم کرد دیدہ وراں دانند کہ گفتنی فراواں بود، وافسانہ پریشان، تاکجا اندک گفتمے، وگفتار را از درازی نگاہداشتمے۔ مرادر انچہ رفت گناہے نیست۔ واگر خود گناہ ست، دوست کریم ست وکرم عذر خواہ۔ والسّلام۔

منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص کے باپ رائے جھجمل دہلوی نے مرزا کو جبکہ وہ کلکتے میں ہیں ایک رئیس کی نسبت جو اپنے باپ کی جگہ مسند نشین ہوا ہے لکھا ہے کہ وہ حکیمانہ طریقہ رکھتا ہے اور سخاوت اُسکی جبلّت میں ہے اسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں "ایکہ گفتی فلانی روش حکیمانہ دارد، و دنیا را کار آگاہانہ میگزارد۔ با ایں ہمہ اندر وہناکی خندہ ام درگرفت، وعنانِ ضبط خویش ازکفم بدر رفت۔ ندانی کہ پرا سبان باد رفتار برنشستن، وگروہا گروہ مردم را پیشاپیش دوانیدن، تن را بلباس رنگارنگ برآراستن ومعدہ را بہ الوان خورد نہا ممتلی گردانیدن، شہوہ از اندازہ بیروں راندن وغبار معصیت بر فرق افشاندن، از حکما نیاید و برشکان را نشاید کار دانشوراں چیست؟ دور از آبادی در بن گوشہ نشستن، وازششش جہت در بروے خلائق بستن، تن را بہ ریا نست فرسودن، وجاں را بہ تجردی پالودن۔ ہرکہ حکیم خرد گزیں ست کار و بارش این ست۔ بے برگ ونواے از شکنجۂ گوناگوں حسرت بدرجستہ بہ فراخ نائے سرخوشی (مستی) رسیدہ است، از کجا کہ آزادہ رو و بالطبع کریم بود۔ ہنوز ادعیۂ منی از ریاح غلیظہ صالحۂ کبدیہ ممتلی دارد، ہرآئینہ بفرمان باد ست روزے چند باش تابنگری گرہ برکیسۂ زرزناں، و درحسرت زرتلف کردہ زاری کناں این کہ فلاں وبہماں را از نزد خویشتن راندہ است۔

حقاکہ روے در مصلحتے نداشت، و ہرچہ کرد از بیخردی و ابلہی کرد۔ چہ اگر دانا بودے، و خرد داشتے۔ آناں کہ راندہ است نہ راندے، و کارہا از آناں گرفتے۔ و ایناں را کہ با خود در یک پیرہن جا دادہ ست۔ چوں غبار از دامن افشاندے، و ہرگز بہ ہواے ایناں نرفتے۔ کودکی و بیجا حیلی درزید، مگر در ایام صاحبزادگی و ولیعہدی از آناں دلے برداشت، و با ایناں لختے رام بود۔ از آناں دل بدیں خیرگی خالی کردن، و در دام ایناں بدیں کوری در آمدن نہ بفرمان دانش ست نہ بفرمان بینش، حکیم گرامیگوئی؟ پیشہ گرامیخوانی + + + چوں سخن دریں باب بسیارست نامہ بہ دعا ختم می کنم۔ دیدہ را بینشے و دل را دانشے سودمند روزی باد۔

مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ جنسے مرزا باندے میں مل کر کلکتے روانہ ہوے ہیں کلکتے میں پہنچکر ان کو سفر کی تمام روئداد لکھی ہے اسکے آخر میں لکھتے ہیں روز سہ شنبہ چارم شعبان پارۂ از روز بر آمدہ در کلکتہ رسید۔ غریب نواز یہائے وہاب بے منت را نازم کہ درچنیں دیار خانۂ چنانکہ باید، و ہرگونہ آسایش را بکار آید، ہم اورا باندازۂ فراغ خاطر آزادگاں قضاے وہم اندر ومانند دہان آز دنیا طلباں بیت الخلاے در گوشۂ صحن پراز آب شیریں چاہے و برطرف بام درخور اہل تیغم آرامگاہے بے آنکہ جستجوے رود، یا گفتگوے شود۔ بے منت و بے زحمت بکرایہ دہ روپیہ ماہانہ بہم رسید، و آدم و چاردا را تکیہ گاہ آرامش گردید۔ دو روز از رنج راہ آسودہ منشور لامع النور (یعنی سفارش نامۂ مولوی محمد علی خاں) راہ مدعا ساختم و در کشتی نشستہ آہنگ ہگلی بندر کردم۔

لطف ملاقات نواب علی اکبر خاں طباطبائی اگر گویم کہ مرا از بخت عجب آمد۔ رواست، واگر گویم کہ مرا بر من برشک آورد و نیز جا دارد بذانیکہ خرد آفریدۂ خرد و برگزیدہ۔ بدیں گرانمایگی و صاحبدلی در بنگالہ نخواہد بود۔ یارب ایں گوہر گرامی از کدام کان ست، وایں گرامی گوہر (گرامی ذات) از کدامی دودماں بارے چوں نخستیں صحبت بود۔ بچارہ جوئی و مصلحت پرسی درد سر ندادم، و دو سہ ساعت نشستہ بغمکدہ باز آمدم۔ آوخ (افسوس) کہ دریں روزہا نواب را با حکامِ ہگلی درخصوص زمینے کہ وقفِ امام باڑہ است معارضہ در پیش و دل۔ سرگرمِ فکر کار خویش ست۔ وللہ در القائل۔

ہمہ رہاکتی حسرتِ دنیا دیدم ۔۔۔ چوں بعشرت کدۂ گبر و مسلماں رفتم

روزگار فرمانبر و بخت فرماں پذیر باد۔

ایک اور خط میں مولوی صاحب ممدوح کو دیگر حالات کے بعد کلکتے کے مشاعروں اور اپنے معترضوں کا حال اس طرح لکھتے ہیں "از نوادر حالات اینکہ سخنوران و نکتہ رسان ایں بقعہ پس از ورودِ خاکسار بزم سخنے آراستہ بودند۔ در ہر ماہ شمسی انگریزی روزیکشنبہ نخستیں سخنگویاں در مدرسہ سرکار کمپنی فراہم شدندے، و غزلہائے ہندی و فارسی خواندندے ناگاہ گرانمایہ مردے کہ از ہرات بسفارت رسیدہ است دراں انجمن می رسد، واشعارِ مرا شنودہ بہ بانگِ بلندمی ستاید، و بر کلامِ نادرہ گویانِ ایں قلمرو تبسم ہائے زیر لبی می فرماید۔ چوں طبائع بالذات مفتون خودنما ست۔ ہمگناں حسد می برند، و کلانانِ انجمن و فرزانگان فن بردو بیت من اعتراضِ نادرست بر آوردہ آنرا شہرت میدہند۔ و بے آنکہ مرا زباں

بپاسخ آشنا شود۔ از دانشوراں۔ کہ مخدومی و ملازمی نواب علی اکبر خان، و مکرمی و مطاعی مولوی محمد محسن از انانند۔ جواب ہا می یابند، و پس زانوے خموشی می نشینند۔ چنانچہ ہم بہ فرمان ایں دو بزرگوار مثنوی انشا کردہ ام، و بعد از اظہارِ عجز و انکسارِ خویش جوابہائے اعتراض دراں ابیات موزوں ساختہ، وآں مثنوی (یعنی مثنوی بادِ مخالف) پسندیدہ طبع عالمے افتادہ است انشاء اللہ العظیم زین بعد عریضۂ کہ بہ والا خدمت خواہد رسید ورقے ازاں ابیات در نوردِ آں خواہد بود۔"

نواب ضیاء الدین احمد خاں اکبر آباد گئے ہوئے ہیں۔ مرزا انکو اپنے قدیم وطن اکبر آباد کی یاد میں دلّی سے اس طرح لکھتے ہیں "جان برادر! اشک و آہ غالب نامراد، یعنی آب و ہوائے اکبر آباد بہ شما سازگار باد گرفتم کہ خود را بسفر گرفتہ (یعنی فرض کردہ اید) و نزدیک خود (یعنی بدانست خود) از من دوتر رفتہ آید، اما چوں ہنوز در وطنید ہمانا کہ نزدیک بائیند شادم کہ شوق دور اندیش دیدہ و دل را دریں سفر با شما فرستاد، ما ہمدریں غربت (یعنی در دہلی) داد شادمانی دیدار وطن نیز توانم داد۔ زینہار اکبر آباد را بچشم کم (یعنی بچشم حقارت) ننگرند، و از رہگذر ہائے آں دیار الحفیظ گوی، والاماں سرای، گذرند، کہ آں آباد چہ ویراں وآں ویرانہ آباد بازیگاہ ہیچو من مجنونی، و ہنوز آں بقعہ را در ہر کفِ خاک چشمہ خونی ست روزگار بود کہ دراں سرزمین جز مہر گیا (نام رستنی) نہ رستے، و ہیچ نہال جز دل بار نیاوردے۔ نسیم صبح دراں گلکدہ (یعنی آگرہ) بہ مستانہ وزیدن دلہا را آں مایہ از جا بر انگیختے (یعنی بشورش آوردے) کہ رنداں بہوائے صبوحی از سر و پارسایاں رانیت نماز از ضمیر فرو ریختے۔ ہرچند ہر ذرۂ

خاکِ آں گل زمین را از تن پیامے بود دلنشیں، و ہر برگ آں گلستاں را از جاں درودے بود خاطر نشان، اما تا زِنگی وقت شمارا در نظر داشتہ در دو پردہ شورِ پرسش برانگیختہ بود، وچشم براہ داشت کہ کے نویسند و دریغ کہ ہیچگاہ ننوشتند کہ رخش سنگیں (یعنی اسپ سنگین کہ در اکبرآباد معروف است) دعاے مرا بکدام ادا پذیرفت؟ و دریا بپاسخ سلام من بزبانِ موج چہ گفت؟

نواب عبداللہ خاں صدر الصدر میرٹھ برادر نواب محمد سعید خاں مرحوم رئیس رامپور نے مرزا کو لکھا ہے کہ رئیس ممدوح کی شان میں قصیدہ لکھو مگر اس زمانے میں مرزا پریشان بہت ہیں اسلیے انکے جواب میں لکھتے ہیں "خدامِ بلند مقام کہ سرانجام قصیدہ از غالب بینوا چشم داشتہ اند مگر آں فسودہ رواں افسردہِ دل را۔ کہ ہنوز نہ مردہ است، زندہ پنداشتہ اند گمان زیست بود بر منت زبیدردی بدست مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست کاش کشایش ایں کار چوں صنعتِ نقاشی و گلدستہ بندی تنہا بکوشش دست و باز و صورت بستے تا چشم از خستگیِ دل پوشیدمے، فرماں پذیرانہ در پردازشِ کار کوشیدمے۔ چہ کنم چوں سرایں رشتہ در دست دلست تا دل برجائے نباشد زباں سخن سرائے نباشد۔ دیدہ وراں ہما چیدل دانند کہ چہ قدرہا دیدۂ دل بہم آمیختہ شود، تا نقشے۔ بداں شگرفی کہ بالغ نظراں پسندند۔ انگیختہ شود۔ ایں دل شکستۂ بہم نپیوستہ کہ در سینۂ من وہمانا دشمن دیرینۂ من ست۔ زنہار بکار سخن گستری نیاید و معنی آفرینی را نشاید۔ ۔ ۔

قاضی عبدالجمیل بریلوی نے کچھ غزلیں اول ہی مرتبہ اصلاح کے لیے بھیجی ہیں اسکے جواب میں اصلاح کے متعلق لکھتے ہیں "خواہش حک و اصلاح

بہرافزود - چندانکہ دیدہ بداں سواد دوختم نازیبا صورتے بنظر درنیاید - ہنجار وروش خود از نیرد ہاے درونی ست آرے نے خامہ دربنان ہر کس خرامے دیگر دارد - آموزش را دریں پردہ راہ نیست، واگر گویند ہست، ہر آئینہ می توانم گفت کہ نیست مگر بہ ہمنشینی و ہمزبانیِ آموزگار، و بسر بردن روزگار در سرہ کردن گفتار، چوں صحبت صورت ندارد، و گفتہ اید کہ ہر چہ بہ نمط گفتہ اند نہ غلط گفتہ اند می باید حلقہ بر در دل زد و ہمت از مبدأ فیاض دریوزہ کرد - بکثرتِ مشق، و فراوانیِ ورزش، و پیرویِ رہروانِ راہ داں کشائشہا روے خواہد نمود، و اندیشہ را دستگاہ و گفتار را سرمایہ خواہد افزود -

مولانا فضل حق مرحوم کو ایک خط میں خط نہ بھیجنے کی شکایت لکھی ہے اور ایک قصیدہ جو حمد میں عرفی کے سب سے پہلے قصیدے پر لکھا ہے خط کے ساتھ بھیجا ہے اور اُسکی داد چاہی ہے وہ خط بجنسہ لکھا جاتا ہے

سبحان اللہ! باآنکہ از فرامش کشتگانم، دانم کہ دوست مرا بہ دو جور بلکہ بہ نیم خس برنگیرد - ہرگاہ بساز دادنِ آہنگ گلہ روے آرم، و بخم کہ ایں پردہ (یعنی نغمہ) را بے پردہ (یعنی بے تکلف) می توانم سرود، و از قہرمانِ اندیشہ دور باشے (یعنی امتناعی) درمیان نیست - ہر آئینہ - بدیں شادمانی کہ ہنوزم با دوست روے سخنے ہست - آنچناں بر خویشتن می بالم کہ غم بہانگداز فراموشی فراموش، و لب از زمزمۂ کہ دل دربندِ سرودن آنست (یعنی شکایت) خاموش می گردد -

از خویشتن بذوقِ جفا باتو ساختیم   باما دگر مساز کہ ما با تو ساختیم

دریں روزہا ہواے آں در سر افتاد کہ بیتے چند در توحید مجیباً للعرفی گفتہ آید چوں کوشش اندیشہ بجاے رسید کہ نہ عرفی را محل ماند، و نہ مرا جاے ناگزیر آں

ابیات را برکسی عرضہ میدارم کہ چوں من صد و چوں عرفی صد ہزار را بسخن پرورش تواند کرد، و پایۂ ہر یک بہر یک تواند نمود ۔ والسّلام

یہاں تک ہم نے مرزا کے مکاتبات میں سے جو بجائے خود ایک دفتر طویل الذیل ہے کسی قدر صاف اور سلیس عبارتیں انتخاب کرکے لکھی ہیں اگرچہ اس قسم کی اور بہت سی عبارتیں اور خطوط مرزا کے مکاتبات میں سے انتخاب ہو سکتے ہیں مگر کتاب کا حجم بہت بڑھ گیا ہے اسلیے ہم اسی قدر قلیل پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس انتخاب کے بعد ہمکو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کی دلچسپی کے لیے اُن مشہور اُستادوں اور نثاروں میں سے جن سے ہندوستان کے لوگ بخوبی واقف ہیں۔ چند شخصوں کی نثر کا مقابلہ مرزا کی نثر سے اس طرح کیا جائے کہ جو عبارتیں مرزا اور دیگر اشخاص کی نثروں میں متحد المضمون پائی جائیں انکو ایک دوسرے کے محاذی لکھدیا جائے اور اس بات کا اندازہ کرنا۔ کہ کونسا بیان کس پایہ کا ہے اور کون سا کس درجے کا۔ ناظرین کے ذوق و وجدان پر چھوڑ دیا جائے۔

سب سے پہلے ہم دو متحد المضمون مقام سہ نثر او مہر نیمروز سے نقل کرتے ہیں۔ ظہوری نے دوسری نثر میں ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور کی نو صفتیں الگ الگ بیان کی ہیں جن میں سب سے اول معرفت الٰہی کا ذکر کیا ہے اور شاعرانہ مبالغے کے ساتھ اپنے ممدوح کو اس صفت سے موصوف کیا ہے۔ مرزا نے مہر نیمروز کے دیباچے میں حمد و نعت کے بعد بہادر شاہ مرحوم کی مدح کے موقع پر اپنے شاعرانہ انداز میں انکو بادشاہی اور درویشی کا جامع قرار دیا ہے اور مثل ظہوری کے نظم و نثر دونوں میں یہ

مضمون ادا کیا ہے۔ چنانچہ ہم دونوں کتابوں سے وہ مقامات مقابل یکدگر نقل کرتے ہیں۔

ظہوری

تاجداریِ لفظ و معنی بہ حشمتِ ثنای تارک انگشت کہ سمّی خلیل خود یعنی ابراہیم عادل شاہ را در ہفت اقلیم بہ نہ صفت، یگانہ و ممتاز گردانیدہ اوّل معرفت کہ باوجود حجبِ کثرت در مشاہدۂ شاہد وحدت معنی کلام معجز نظامِ "لو کشف الغطاء لما ازددت یقیناً" وصفِ حال او ساختہ، نگارستانِ غیب و بوستانِ عقیدتش از خس و خاشاک شک و شبہہ پرداختہ مجموعہ عرفانِ موحداں فردے از دفتر ثنا سائیش عتقف واشتلم ما سوے پسندیدہ طبع و آسائش بہ توضیح بیانش نشانہائے بے نشاں (یعنی ذات بے نشان) ہمہ دلنشیں و خاطر نشان بہ آفتاب جہاں گرد تاکید نظر بردو بینان نیند اختن و بہ منور قضا شدید با حوال احولاں نپرداختن زنار را با سبحہ نپیوندیست

ازانجا کہ ابعد ہر دو ر ظہورے دیگر ست، و پس از مہر انجام سرانجامے جداگانہ، و در ہر عہد عہد اسمے دیگر ست (یعنی اسمے دیگر از اسماے الٰہی) و در ہر دو قرن وقت کشائش طلسمے دیگر۔ فرہ ایزدی (نشان الٰہی) کہ چندرائے بنام آوری شکوہ عز و غنا از سماد خشید وانمودے را بہ نشانمندی فقر و فنا فروغ بخشیدے مظہرے کامل و مرائے۔ روشن خواست تا دراں مظہر ظہور ہر دو رنگ، و دراں مراٰت رویت ہر دو صورت یکبارہ رو دہد۔ اورنگ و منبر یکے شد و سادہ سجادہ را دوئی از میان رفت۔ درفش کاویانی (کہ نشان بادشاہی است) از عصا و ردا (کہ ہر دو شعار درویشاں و ہر دو درفش جمع آمدہ) منت پذیرفت کہ پیدائی من بہ پیوند ایں دو جزو بازبستہ است و عصا و ردا درفش را سپاس گفت کہ دریں صفحہ (یعنی در درفش) نقشِ جمعیت ما رسا نشستہ ست بیکدگر خوردن این دو قدح (یعنی فقر و سلطنت) مجمع البحرینے پدید

کہ گسیختنش برکشاکش کشیشاں (یعنی قسیساں) نہ خندد، وکفر را بہ ایماں نہ سرزیست کہ صداعش صندل چارہ از پیشانی برہمناں نبرد۔ از عدمہ توحیدش دوئی دریکی گریختہ، و بہ علاقہ تجریدش خودی در تولیٰ آویختہ گوشے حق شنو، چشمے حق بیں دلے حق جو، خاطرے عرفان زا، سینہ معرفت خیز، تارکے آسماں ساجبہہ سجدہ ریز۔

آورد، و سربہم آوردن این دو قوس نقشِ دائرہ پدیدار کرد۔ از سرجوش فروغ مہر و ماہ بافشردن و پالودن و سرشتن پیکری ساختند و بہر دفع گزند چشم بداز پروین و پرن یران پیکر سپند سوختند سرش را بتاج شاہی افراختند، ودلش را بنورِ آگہی افروختند ++ + زہے در انجمن خلوت نشیں و بہ پادشاہی کار آگہی گزیں۔ پادشاہاں در انجمن ازاں کار آگاہ ادب آموختہ، وکار آگاہاں در خلوت ازاں پادشاہ فیض اندوختہ ++

ظہوری
مثنوی

پائے رفعت بر آسماں دارد
سرِ خدمت بر آستاں دارد
در عبادت بہ گفتن و دیدن
طرز او طرز حق پرستیدن
خلوتِ دیگران و صحبتِ او

غالب
مثنوی

اے کہ از رازِ نہاں آگہ نۂ
دم مزن از رہ کہ مردِ رہ نۂ
در[۱] ہزاراں مرد مرد رہ یکیست
آدمی بسیار اما شہ یکیست
در تو می پرسی کہ مرد راہ کیست

---

[۱] یہ شعر مثنوی معنوی کا مشہور ہے اسی لیے مرزا نے بغیر حوالے کے یہاں لکھدیا ہے اور شہ کے لفظ نے نہایت لطف پیدا کر دیا ہے۔ ۱۲

وحدتِ این و آن و کثرتِ او
در دلش این و آں نہ می گنجد
ہیچ جز حق دراں نہ می گنجد
بت شکن گشت چوں خلیل نخست
بادش ارزانی اعتقاد درست
کفر در فکر نکتۂ عرفاں
شرک در شکر نعمتِ ایماں
طینتش باج خواہِ طینتِ ہا
نیتش پادشاہ نیتِ ہا
در عبادت زہے تنومندی
بندگی در خورِ خداوندی
سرِ وحدت بمغز برد از پوست
ہمہ او کرد خویش را ہمہ اوست

جز سراج الدین بہادر شاہ کیست
در طریقت رہنمائے رہرواں
در خلافت پیشوائے خسرواں
آنکہ چوں از رازِ وحدت دم زند
دفتر کون و مکاں برہم زند
آنکہ چوں در نے نوا را سر دہد
نے شود نخلے کہ شبلی بر دہد
شبلی از منبر دہد آوازِ عشق
شاہ ما بر تخت گوید رازِ عشق
عشق دارد پایہ ہر کس نگاہ
منبرا از شبلی و تخت از پادشاہ
انچہ ابراہیم ادہم یافتست
بعد ترکِ مسندِ جم یافتست
شاہ ما ادہم در رہروی
خرقۂ پیری و تاجِ خسروی
شاہی و درویشی اینجا باہم ست
پادشاہِ عہد قطبِ عالم ست

شیخ علی حزیں اور مرزا کے طرزِ بیان کا مقابلہ

شیخ نے جو اپنے دیوان کا دیباچہ لکھا ہے اس میں وہ فخریہ فقرے جو اُس نے اپنے دیوان اور اپنے کلام کی شان میں لکھے ہیں اسی قسم کے

فقرے مرزا نے بھی دیوان فارسی کے دیباچہ میں انشا کیے ہیں۔ سو دونوں دیباچوں میں سے ہم ملتے جلتے فقرے انتخاب کرکے اس مقام پر مقابل یکدگر لکھتے ہیں۔

حزیں

ہمایوں خطۂ الیست لبالب از جواہر کلم وجواہر حکم۔ روح پرور ہوائیش ہمعنی اعتدال و جداول سطورش از مائے معین مالا مال۔ خاکش مشکیں نفس و شمیمش عنبر آگیں آبش خمار شکن ونسیمش مسیح آئیں از صبوحیِ فیضے کہ ساقی کلکش پیموده سیاه مستانِ حروف سر در کنار ہم غنوده اند، واز نشۂ ہوش پروازے کہ دستِ فکرت در جام و سبوے الفاظش ریختہ، خرد مستانِ معنی نشید شوق سروده بنام ایزد حسنِ لیلیٰ ست کہ از طرفِ خیام الفاظ سر بر زده در جلوه گرمی ست، با شور مجنونے ست کہ از وادیٔ تفسیده دل برخاستہ درپرده ورلیست یوسفتانے ست ازگل پیراہناں در موج نگارستانے ست سیمیں بناگش

غالب

بنام ایزد نخستیں نقابیست از روی شاہد ہر صفت کرده معنی بجنبش نسیم برافتاده، یعنی کشاکش دست ناکشیده۔ بازپسیں چراغیست از گرمی چراغاں نیم سوختہ پہلو رخ بہ افروختن داده، یعنی داغ منت خس نادیده۔ کہن داغہاے جنوں ہست سراسر بہ ناخنِ شوخی نفس خراشیده۔ گرماگرم خونابہ دردلست بہ تفِ پنہانی دل ناگہ از ناسور تراوید۔ کاغذی[۱] پیرہنانند (یعنی داد خواہانند) چوں پیکر تصویر از حیرت

[۱] الفاظ کو اسلیے کہ وہ کاغذ پر مرقوم ہیں کاغذی پیراہن کہا ہے اور کاغذی پیراہن داد خواہ کو کہتے ہیں۔ دوسرے فقرے میں معانی کو اسلیے کہ انکی روشنی حروف کی سیاہی میں پوشیدہ ہے مشعل بکف اور سیہ پوش کہا ہے۔ ۱۲

فوج در فوج، سہی پیکرانند در خیابان سطور دوشاد وش - مغان شیوہ دلبرانندانہ بادۂ ناز گرم نوشانوش نازک بدنانند حجاب پرورد گل پیرانند تنہا گرد، بختہ مغزانند برشتہ پوست، بیگانہ نغزانند آشنا دوست صوفیانند در وحدت خانہ عشق مست سماع، سوختگانند سپند آسا مست وداع - درویشانند تجرد کیش، فرد کیشانند از ہمہ درپیش - شیر صولتانند از جوشن خط پلنگینہ پوش، دریا دلانند از شورش عشق در جوش وخروش - آئینہ پیکرانند آئینہ تاب، پاکیزہ گوہرانند یکسر خوشاب - گلبر گہاے شبنم زدہ بہار بستہ خراشیدہ نالہاے بلبل شاخسار یست

واقعہ خاموش (یعنے اپنی بیقدری سے حیران ہیں) مشعل بکف گرفتگانند (یعنی فریادیانند) چوں آذرازدود دل سیہ پوش + + نگویم دود چراغست بالالہ وداغ، اما سوختگی راہر گزشت ست وخستگی را روئداد - نگویم تجلی طور است، یا جنت وحور اما نازش راقلمرو ست وآرایش راسواد (نواح) طلسم شعلہ و دست باز بستۂ زردشت خیال شعلہ پنہاں، ودود پیدا، دل لوح طلسم وزبان طلسم کشا ہنگامۂ ابر وباد ست برانگیختہ جادوی فکر ابر گہرپاش وباد الماس فشاں اندیشۂ طومار نیرنگ ولب افسوں خوان - دود کبابیست باندازپیچ وتابے کہ از شعلہ در دل افتادہ ست برہوا تتق بستہ خیل غزاے ست بساماں جنبشے کہ در کمین گاہ رو دادہ است - ازدام بدرجستہ جمالیست دریرۂ نمایش خویش مشاطہ حقیقی راستایش نگار - نہالے درست

سایہ بردمندی خویش نخلبند
ازل را سپاس گزار۔

مرزا اور ابوالفضل کی طرز بیان کا مقابلہ

مرزا نے مہر نیمروز میں اکثر تاریخی واقعات وہی لکھے ہیں جو شیخ کے اکبر نامہ میں مذکور ہیں، مگر چونکہ مرزا نے ان واقعات کو کسی قدر کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر کے ساتھ اپنی خاص طرز میں لکھا ہے اس لیے دونوں کتابوں کی طرز بیان میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ ہم یہاں ایک سیدھا سادہ واقعہ دونوں کتابوں سے نقل کرتے ہیں۔

اکبر نامہ

ترک بزرگترین فرزندان یافث بود۔ ترکان اورا یافث اوغلان گویند و بہ ہشیار دلی و کارگزاری و رعیت پروری از ہمہ برادران امتیاز داشت بعد از رحلتِ پدر بر تخت فرمانروائی نشست و داد مردمی و مردانگی و مظلوم پرستی داد۔ و در جائے کہ ترکاں اورا اسیلول یا سلیکالی میگفتند، و چشمہ ہائے آب سرد خوشگوار و گرم عافیت بخش و مرغزار ہائے دلکش داشت اقامت فرمودہ۔ از چوب

مہر نیمروز

ترک ابن یافث نشان جہانداری یافت و ترکان ایں والا شکوہ را ازاں رو کہ بہ ترکی شہریار جواں را اوغلان گویند۔ یافث اوغلاں گفتند داد و دانش آئین داشت، و دریں ہر دو شیوہ روشہائے گزیں داشت خانی و مرزبانی را فرہنگ ہا پدید آورد، و فرماندہی و فرمانبری را اندازہ برنہاد۔ و زاں ہنگاہ سیلول یا سلیقا را کہ چشمہائے رواں و گل و میوہ فراواں داشت از بہر آرامش گزید۔ از نے و

اکبرنامه

وگیاه خانه ها اختراع کرد، و خرگاه
پدید آورد واز پوست بهائم وسباع
لباس پوشیدنی دوخت - و نمک در
زمان او ظاهر شد - و در آئین آوان
بود که پسر را جز شمشیرے میراث ندهند
وتمام خواسته دختر را باشد - وگویند
که او معاصر کیومرث اول ملوک عجم
ست، واو اول سلاطین ترکستان
است وعمر او دویست وچهل سال
بود النجه خاں بهترین فرزندان
ترکی بود - چوں پیمانه زندگی ترکی
پرشدن گرفت او را بمشوره بزرگان
برتخت سلطنت نشانده - او خرد دریں
راه پیشوائے خود ساخت در عدالت
گستری روزگار گذارند - چوں پیر
شد عزلت اختیار فرمود وپانچی بعد
از عزلت پدر واشارت عالیش فرماں
روا شد کیوک خاں فرزند رشید
او ست پدرش درهنگام پدرود گردوں
جهاں سریر خالی وعنایت فرمود -

مهرنیمروز

علفت وچوب گیاه نشیمن ها فراختے، و
پوست دام ودد را پوشش تن ساختے
گویند نمک به روزگارے پدید آمد، ورنه
ازاں پیش تره وگوشت همچناں بے
نمک همی خوردند - ترکان شمشیرزن
را بفرمان فرزانهٔ شیر افگن (یعنی یافث
اوغلان) بر نهاد (دستور) وقرار داد
آں بود که ازاں همه برگ وساز که مرده
مروری (میراث) بازماند جز شمشیره
پسر ندهند وهمه بدختر بازگذارند - که بهر
آئینه تیغ جوهردار فرد فهرست گنجینه
سیم وزر، بلکه کلید فتح هفت کشورست
اگر بدیں بها رگ الماس گوں دسترس
ست مرد را دست مایهٔ نازبس ست
بالجمله ایں همه رسم وآئین نهاد و
پایان کار پس از دویست وچهل
ساله بیداری بخواب عدم سر بر زمین
نهاد - بزرگان دوده پس از یافث
اوغلان به فرزند بخت بلند شبل
الینجه خاں چشم روشنی گفتند - کلمه

اکبر نامه

او قدر سلطنت را
دانسته در لوازم
آں اهتمام
بجاے آورد.
النجه خاں پسر
اوست در آخر
عمر پدر ولیعهد
شد - داد و دهش
را از اندازه بیروں
برد - و ترکان در
زمان دولت
او مست دولت
شده از راه
خردمندی عدول
نمودند - و چوں
مدتے براں بگذشت
او را دو پسر به یک
شکم آمد - یکے
را مغل نام کرد
و دیگرے را تاتار

مهر نیمروز

نهاد و راستی پیشه گزیدے پیرامون دلش نگذشتے، و بابداں
همزبان نگشتے - آزاده رو بود و دل بیاد یزداں در گرو داشت
تاج و تیغ و نگین در زندگانی خویش، به نوبادهٔ باغ کامرانی خویش
دیباقچی خاں جواں بخت نوجواں سپرد، و خود ازیں خاکدان دامن
برچید - و به آفریں خانه - که تو آں را صومعه گوئی آرمید - دو صد
و پنج سال پارهٔ بنموداری اقبال و پارهٔ بپرستاری ذو الجلال
در جهاں گذراں ماند، و بهنگام ناگزیر درگذشت - دیباقچی خاں
که هم در نظرگاه پدر اورنگ آراے بود - اورنگ خسروی را
برنمطے تازه آراست، اما بدیں دانشوری و دادگری که جز دانش نه
جست و جز داد نه کرد - روزنامه عمرش چوں رقم یک صد و هشتاد و
شش سالگی پذیرفت - درنوشتند و بارنامه کجکلهی و گردنکشی
بنام پسر فرخ اخترش کیوک خاں نوشتند ستوده ستایش،
در خور بکار آگاهی آبروی پادشاهی افزود - و یکصد و چهل سال،
از مرگ اماں یافت - فرزانه تا از شاهی نشاں یافت جهان را
بخوشی و خوشنودی و جهانیاں را به مهر و آزرم نگاهداشت و
سرانجام کار جهاں و جهانباں را بفرزند خویش النجه خاں گذاشت
به تردستی دریاکف، و به بیدریغ بخشی ابر کردار بود - دهش را
داد بیشی داد - و فرودستاں (زیردستاں) را به دهش از خواهش
بے نیاز ساخت - سبکسراں به باد برفت (یعنی به کبر و غرور) از
جا رفتند - و از دائره کیش و آئیں بدر زدند - آرامش داد

مہر نیمروز	اکبر نامہ
(یعنی انتظام) کنار گرفت و بت پرستی صورت پذیرفت۔ بانوی	وچوں بجد کاروانی
ایں فرماں روائے بابرگ و نوا دو پسر توام زاد۔ اورنگ نشین	رسیدند ملک خود
(یعنی النجہ خاں) یکے را مغل خاں و دیگرے را تاتار خاں نام	را بہ دو حصہ بخش
نہاد۔ ہر دو را بناز پرورد۔ چوں برنائی رسیدند قلمرو خویش	کردیک نصف را
را دو نیم کردہ نیمہ بہ تاتار نامزد کرد و خود یکصد و بست و ہفت	بہ مغل داد و نصف
سال در گیتی درنگ ورزیدہ پے رفتگاں برداشت اللہ اللہ	دیگر را بہ تاتار۔ و
ایں را نیز چوں روز فرو رفتگان دگر روز فرو رفتہ ؎	چوں پدر بزرگوار
ریزد آں برگ و ایں گل افشاند	ایشاں ودیعت
ہم خزاں ہم بہار در گزر است	حیات سپرد فرزندان
	بایکدگر موافقت نمودہ
	ہرکدام در ولایت
	خویش خود آرائی میکردند

خاتمہ

مرزا غالب مرحوم کی لائف اور انکے کلام کا انتخاب جس قدر کہ یہاں اُسکا دکھانا مقصود تھا ختم ہوگیا، مگر ابھی چند ضروری باتیں لکھنی باقی ہیں۔

ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ کتاب ان تصنیفات میں شمار نہیں ہوسکتی جن کی آجکل ملک میں ضرورت سمجھی جاتی ہے، اور جو اہل وطن کی موسمی بیماریوں کے لیے براہ راست دوا اور علاج کا کام دے سکتی ہیں۔ کیونکہ اس مضمون کے لکھنے پر ہمکو اس اندھی اور بہری دیوی نے

مجبور کیا ہے جسکی زبردستی اور حکومت کے آگے مصلحت اندیشی کے پر جلتے ہیں۔

مستانہ سخن می رسد از دل بلبِ ما　　عشق ست کہ بربستہ زبان ادب ما

راقم کو مرزا کے کلام کے ساتھ جو تعلق بدوِ شعور سے آج تک برابر چلا آتا ہے اسکو چاہو اس معتقدانہ جوش عصبیت کا نتیجہ سمجھو جو انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے۔ اور چاہو اُس یقین کا ثمرہ خیال کرو جو نہایت زبردست شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے، بہر تقدیر یہی وہ چیز تھی، جس نے ہمکو اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ پس نہ ہم کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے اس تالیف سے پبلک کی کسی بڑی ضرورت کو رفع کیا ہے اور نہ یہ خیال ہے کہ محض ملک کی خیر خواہی اسکے لکھنے کا باعث ہوئی ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ جو کام محض طبیعت کے اقتضا سے نہ کہ عقل کی صوابدید سے سرانجام کیا جائے اس سے لوگوں کو بواسطہ کسی طرح کچھ فائدہ نہ پہنچے۔ ہوا جو اپنی موج میں چلتی ہے اور دریا جو اپنے جوش میں بہتا ہے گو انکو خود یہ خبر نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انکی سعی محض بے حاصل اور انکی کوشش سراسر بیسود ہے۔ اسی طرح کوئی ذرہ ذراتِ عالم میں ایسا نہیں جو اپنی اضطراری حرکت سے نظام کلی میں کچھ نہ کچھ دخل نہ رکھتا ہو۔

"اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز برہ تو روی نیست　　در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری"

یادگار غالب کو ہم نے دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں مرزا کی لائف یعنی انکی زندگی کے حالات اور ان کے اخلاق و عادات کا بیان ہے،

اور دوسرے حصے میں انکے کلام کا انتخاب ہے۔ اگرچہ مرزا کی لائف میں جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں اکوئی مہتم بالشان واقعہ انکی شاعری وانشا پردازی کے سوا نہیں پایا جاتا، با اینہمہ اس میں بہت سی مفید نصیحتیں بھی اہل وطن کے لیے موجود ہیں۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ مرزا پانچ برس کے تھے جب باپ کا، اور نو برس کے تھے جب چچا کا انتقال ہوا۔ انکی ننھیال جہاں انھوں نے پرورش اور نشوونما پائی۔ آسودہ حال تھی۔ باپ اور چچا کے صغیر سن چھوڑ جانے سے نانا اور نانی کی الفت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہوگی۔ خود مرزا کی طبیعت میں گرمی اور جودت کی ایک آگ بھری تھی جسکے بھڑکانے کے لیے تھوڑی سی اشتعالک کافی تھی۔ باپ اور چچا کا سایہ تربیت بچپن میں سر سے اٹھ جانا، ننھیال کی مرفہ الحالی، نانا نانی کی ناز برداریاں اور خود مرزا کا ذکی الحس ہونا، یہ تمام اسباب ایسے تھے کہ عنفوان شباب میں انکا جادہ مستقیم سے تجاوز نہ کرنا نہایت دشوار تھا۔ مرزا کی ابتدا بگڑی اور ایسی بگڑی کہ جب تک ننھیال کی تمام املاک اور دیہات کی صفائی نہ ہولی نشے ہرن نہ ہوے۔ اگرچہ مرزا بہت دیر میں سنبھلے مگر وہ جو مشہور ہے کہ "صبح کا بھولا شام کو آجاے تو بھولا نہ جانو" انھوں نے اپنے فضل وکمال حسن معاشرت شریفانہ خصائل اور کریمانہ اخلاق سے۔ جو کہ انکے ذاتی جوہر تھے۔ وہ عارضی دھبے اس طرح دھو ڈالے کہ گویا کبھی ان سے دامن آلودہ نہ ہوا تھا جس فن پر انھوں نے لڑکپن میں ہاتھ ڈالا تھا اسکو اخیر عمر تک نباہ دیا، غفلت اور بدمستی کے عالم میں بھی اسکا خیال نہ چھوٹا اور باوجودیکہ زمانہ قدردانوں سے خالی تھا

اس کو اس درجے تک پہنچا کر چھوڑا جو اسکا منتہاے کمال تھا۔
اگرچہ معاش کی طرف سے وہ کبھی زیادہ تنگ نہ ہوے مگر حوصلہ اور ہمت کے موافق کبھی استطاعت نصیب نہیں ہوئی بلکہ جن الّلے تلّلوں میں بچپن اور جوانی گذری تھی اسکے لحاظ سے یہ کہنا چاہیئے کہ وہ اخیر دم تک حور بعد الکور میں مبتلا رہے۔ اسکے سوا امراض جسمانی سے کبھی فرصت نہیں ملی اور اپنے ہنر کی کساد بازاری کا رنج ہمیشہ سوہان روح رہا۔ باوجود اسکے زندہ دلی اور شگفتہ طبعی مرتے دم تک انکی رفیق حال رہی۔ اگرچہ نظم و نثر میں جو زار نالیاں انھوں نے کی ہیں وہ بظاہر بیصبری اور تنگ حوصلگی پر جو ایک اخلاقی کمزوری ہے۔ دلالت کرتی ہیں لیکن درحقیقت یہ انکی شاعری اور انشا پردازی کے میدانوں میں سے ایک میدان تھا جسکی زمین اُن کے پانوں کو لگ گئی تھی۔ اول تو خود یہ مضمون ہی ایشیائی شاعری کا جزو اعظم ہے، دوسرے ہر شاعر ایک خاص راگنی کا کلانوت ہوتا ہے۔ چنانچہ عرب کے شعرا میں امرالقیس گھوڑے اور عورت کی تعریف اور عیش کے بیان میں مشہور تھا۔ اعشےٰ حسن طلب اور وصف شراب میں ضرب المثل تھا، اور اسی طرح ہر شاعر کی شہرت کسی خاص بیان کے ساتھ مخصوص تھی۔ علیٰ ہذا القیاس ایران میں فردوسی رزم کا دھنی تھا نظامی بزم کا اور سعدی موعظت کا چونکہ مرزا خاصکر رنج و مصیبت کے بیان میں یدطولیٰ رکھتے تھے اس لیے یہ مضمون اکثر انکے قلم سے تراوش کرتا تھا۔
اگرچہ مرزا اپنی شاعری کا سکہ اس وجہ سے کہ زمانہ اسکے اندازہ کرنے سے عاجز تھا۔ پبلک کے دلوں پر جیسا کہ چاہیے تھا نہیں بٹھا سکے

مگر وسعت اخلاق حسن معاشرت، اور صلح کل سے انھوں نے ایک عالم کو مسخر کرلیا تھا۔ قطع نظر شاگردوں اور مستفیدوں کے دوستوں اور ہوا خواہوں کی تعداد بھی سیکڑوں سے گذر کر ہزاروں تک پہنچ گئی تھی اور ہر ایک کے ساتھ انکے برتاؤ کا طریقہ ایسا مہر انگیز تھا کہ ہر شخص اپنے تئیں انکے مخصوص ترین دوستوں میں سے شمار کرتا تھا۔ غریبوں اور حتاجوں کی اپنی دسترس سے بڑھکر خبر لینی، نوکروں اور لگے بندھوں کو عسرت کے وقت اپنے سے علیحدہ نہ کرنا درماندگی میں دوستوں کی امداد کرنی اور انکی مصیبت پر مثل یگانوں کے افسوس اور ان کے ساتھ ہمدردی کرنا، ہر حال میں پاس وضع اور خودداری کو ہاتھ سے نہ دینا، مذہبی تعصبات سے پاک ہونا اور ہر مذہب و ملت کے دوستوں کے ساتھ یکساں صفائی اور خلوص سے ملنا اور یہ اسی قسم کی وہ تمام خوبیاں جو دارالخلافت کی قدیم سوسائٹی کا زیور سمجھی جاتی تھیں انکی ذات میں جمع تھیں خصوصاً وفاداری، حق شناسی، اور احسان مندی کی شریف خصلت جو ہندوستان کی قدیم خاندانوں کا شعار تھا مرزا کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ چونکہ انکے چچا نصر اللہ بیگ خاں لارڈ لیک کی مہمات میں شریک رہے تھے اور انکی وفات کے بعد گورنمنٹ نے انکے پسماندوں کے لیے۔ جن میں سے ایک مرزا بھی تھے کئی ہزار روپیہ سالانہ بطور پنشن کے مقرر کر دیا تھا، مرزا نے جیسا کہ انکی تحریرات سے ظاہر ہے۔ اخیر عمر تک گورنمنٹ کے اس احسان کو فراموش نہیں کیا تمام عمر ملکہ معظمہ اور وبسراؤں اور لفٹنٹ گورنروں اور دیگر حاکموں اور افسروں اور تمام انگلش قوم کی مدح سرائی میں بسر کی البعض

افسروں کی وفات پر دردناک مرثیے لکھے اور ہمیشہ فخر کے ساتھ اپنے تئیں والبستگانِ دامنِ دولتِ انگلشیہ سے سمجھتے رہے غدر کے زمانے میں فوج باغی کے ظلم و ستم سے جو اثر انکے دل پر ہوا تھا وہ انکی کتاب دستبو سے جو غدر کے حالات پر اسی شورش و فتنہ کے زمانے میں انھوں نے لکھی تھی۔ ظاہر ہے۔ ۱۲۵۲ھ میں ولیم فریزر صاحب رزیڈنٹ و کمشنر دہلی کے بیگناہ مارے جانے پر سخت صدمہ انکو پہنچا تھا وہ ان کے اس خط سے جو شیخ امام بخش ناسخ کو اس واقعہ کے ہوتے ہی انھوں نے لکھا تھا ظاہر ہے۔ وہ اُس خط میں لکھتے ہیں یکے از ستمگرانِ ناخدا ترس۔ کہ بعذاب ابدی گرفتار باد ولیم فریزر را کہ رزیڈنٹ دہلی و غالب مغلوب را مربی بود۔ در شب تاریک بضرب تفنگ کشت، و مرا غم مرگ پدر تازہ کرد۔ دل از جائے رفت، و سترگ اندوہے سراپائے اندیشہ را فرد گرفت۔ خرمن آرامیدگی پاک بسوخت، نقش امید از صفحۂ ضمیر سراسر ستردہ شد۔"

اگرچہ مرزا کے کلام میں مدحیہ قصائد کی مقدار تمام اصناف سخن سے زیادہ معلوم ہوتی ہے اور انھوں نے جابجا اس بات پر افسوس کیا ہے کہ عمر کا بہت بڑا حصہ اہل جاہ کی ہجو میں صرف ہوا، مگر ادنیٰ تامل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو فن مرزا نے اختیار کیا تھا اس کی تکمیل انگلے زمانے کے خیالات کے موافق زیادہ تر اس خاص صنف یعنی قصیدے کی مشق و مہارت پر موقوف تھی، کیونکہ فارسی شاعری کی ابتدا اسی صنف سے ہوئی اور کوئی شاعر جس نے قصیدے میں کمال بہم نہیں پہنچایا وہ مسلّم الثبوت نہیں سمجھا گیا۔

یہاں تک کہ حکیم سنائی، شیخ سعدی، اور امیر خسرو جیسے بزرگوں کا دامن بھی اس آلودگی سے پاک نہیں رہا۔ خود مرزا کا قول تھا کہ جو قصیدہ نہیں لکھ سکتا اُسکو شعرا میں شمار کرنا نہیں چاہئے اور اسی بنا پر وہ شیخ ابراہیم ذوق کو پورا شاعر اور شاہ نصیر کو ادھورا جانتے تھے بڑی دلیل اس بات کی کہ مرزا نے جس قدر قصیدے اہل دنیا کی مدح میں انشا کیے ہیں ان سے محض فن کی تکمیل مقصود تھی یہ ہے کہ انکا ممدوح مخاطب صحیح ہو یا نہ ہو، اور اس سے حسن کلام کی داد ملنے کی توقع ہو یا نہ ہو۔ وہ ہمیشہ قصیدوں کے سرانجام کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرتے تھے اور ہر قصیدے میں اپنا کمال شاعری اسی طرح ظاہر کرتے تھے جیسے متنبی سیف الدولہ کی یا عرفی خانخاناں کی تعریف میں کرتا تھا۔ مع ذالک چند قصیدوں کے سوا۔ جو دوستوں کی ترغیب و تحریض سے انھوں نے کسی امید یا توقع پر ہندوستان کے بعض رئیس کی مدح میں لکھے ہیں باقی انکے تمام قصائد یا توحید و نعت و منقبت میں ہیں۔ یا اپنے معزز اور لائق ہمعصروں کی تعریف میں اور یا ان لوگوں کی شان جنکو وہ اپنا مربی اور ولی نعمت سمجھتے تھے اور جنکی مدح سرائی کا فرض بطور شکرگزاری و منعم پرستی نہ بامید صلہ و انعام ادا کرتے تھے، جیسے قلعہ دہلی کے بادشاہ و ولیعہد، یا ملکہ معظمہ اور وائسرایاں کشور ہند اور دیگر اعیان وارکان سلطنت انگلشیہ یا فرمانروایان ریاست رامپور و الور وغیرہ۔

باایں ہمہ جس موثر طریقے سے مرزا نے اہل دنیا کی مدح سرائی

پر افسوس کیا ہے وہ ملاحظہ کے قابل ہے۔ وہ دیوان فارسی کے دیباچے میں اپنی شاعری کے متعلق بہت سے فخریہ فقرے لکھنے کے بعد لکھتے ہیں "درہوائے کہ بالاخوانی زدہ ودر ادائے کہ خود را بہ سنگرفی ستودہ ام (یعنی جس دیوان پر میں نے اسقدر فخر کیا ہے) نیمۂ ازاں شاہد بازی ست یعنی ہوا پرستی (اس سے مراد غزل سرائی ہے) ونیمۂ دیگر تو نگر ستائی ست۔ یعنی باد خوانی (اس سے مراد قصیدہ گوئی ہے) بیداد بیں اگر مہر جا بشانہ۔ شمے از زلفِ مرغولہ مویاں کشودہ شود بلا ورمن آویزد تا دل بہ پیچاک آں شکن بندمے، وخواری بنگر اگر ہرگاہ از خود غافل واز خدا فارغ شے براور نگ سروری گیج نشیند ہوس مرا بر انگیزد تا بہ پیشش بندہ زار راست ستمے۔ شادم از آزادی کہ لبا سخن بہ ہنجارِ عشقبازاں گزاردستم، وداغم از آزمندی کہ ورقے چند بکردار دنیا طلبان در مدح اہل جاہ سیاہ کردستم۔ دریغا کہ عمر سبک سیر لختے بہ جامۂ وچنگ سرآمد، وپارہ بہ دروغ ودریغ رفت۔

یہاں تک جو کچھ کہ مرزا کی لائف کے متعلق ہم کو لکھنا تھا لکھا گیا۔ اب ہم چند سطریں انکے کلام کے انتخاب کی نسبت لکھنی چاہتے ہیں ہم نے اس کتاب میں۔ جیساکہ مکرر بیان ہوچکا ہے۔ مرزا کے کلام کا انتخاب صرف اس غرض سے درج کیا ہے کہ شاعری وانشا پردازی کی غیر معمولی استعداد جو مرزا کی فطرت میں رکھی گئی تھی۔ جہاں تک کہ ان کی نظم ونثر اس پر شہادت دے سکتی ہے۔ صاحبانِ ذوق سلیم پر واضح ولائح ہو جائے۔ اگرچہ فی الحقیقۃ طریقہ مذکور سے اس غرض کا پورا ہونا نہایت دشوار ہے۔ لیکن بالفرض اسکا پورا ہونا تسلیم کرلیا

جائے تو بھی بظاہر اس سے کوئی فائدہ متصور نہیں۔
زمانۂ حال کی ترقیات نے جس طرح علمی دنیا میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے اسی طرح لٹریچر کی حالت بہت کچھ بدل ڈالی ہے۔ قدیم طریقے کی شاعری (اگرچہ ابھی تک اسکا نعم البدل پیدا نہیں ہوا) روز بروز نظروں سے گرتی جاتی ہے نظم و نثر میں بجائے صنعتِ الفاظ اور محض خیالی باتوں کے سادگی اور حقیقت طرازی کی طرف طبیعتوں کا میلان زیادہ ہوتا جاتا ہے جو باتیں پہلے محاسن کلام میں داخل تھیں اب ان میں سے اکثر داخل عیوب سمجھی جاتی ہیں اگرچہ ہندوستان میں قدیم لٹریچر کا تسلط ابھی بہت کچھ باقی ہے اور پبلک کا مذاق عام طور پر نہیں بدلا۔ مگر زمانے کا رخ قدیم شاہراہ سے یقیناً پھر گیا ہے اور آیندہ تمام قافلوں کو جو اس وادی میں قدم رکھنے والے ہیں۔ زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا ضرور ہے۔ پس اگر مرزا کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا شاعر فرض کر لیا جائے تو بھی اس زمانے میں انکی نظم و نثر کے نمونے پبلک کے سامنے پیش کرنے اور ان کے مبلغ کمال کو لوگوں سے روشناس کرانا بظاہر ایک ایسا کام معلوم ہوتا ہے جسکا وقت گزر گیا۔ لیکن ہمارے نزدیک زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اسکو قدیم نمونوں سے کبھی استغنا حاصل نہیں ہو سکتا، خصوصاً ہندوستان کی لٹریری ترقی جس قدر مشرقی زبانوں کے قدیم لٹریچر سے وابستہ ہے ایسی یوروپ کی موجودہ لٹریچر سے نہیں ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یوروپ کے بعض نامور شعرا مشرقی شاعروں کے کلام سے اب تک استفادہ حاصل کرتے

اور اس سے صدہا اسلوب بیان اخذ کرتے ہیں تو ہمارے ہموطن کیونکر اس سے استغنا کا دعویٰ کر سکتے ہیں جس طرح زمانہ حال کے انجینیر قدیم عمارتوں اور پرانے کھنڈروں سے انجینیرنگ کے متعلق صدہا مفید نتیجے استخراج کرتے ہیں اسی طرح اس زمانے کے ناظم اور ناثر قدیم لٹریچر سے بہت کچھ لٹریری فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم نے مانا کہ انگلش لٹریچر کی ترقی منتہائے کمال کو پہنچ گئی ہے اور ہمارے لٹریچر نے اسی کی بدولت کچھ عرصے سے آگے قدم بڑھانا شروع کیا ہے مگر جب تک لوگ یہ نہ سمجھیں گے کہ ہمکو انگلش لٹریچر سے کونسی باتیں اخذ کرنی چاہئیں اور اپنے قدیم مشرقی لٹریچر سے کیا سبق لینا چاہیے اس وقت تک ہمارا لٹریچر اصلی ترقی سے محروم رہے گا۔

مرزا کے فارسی کلام کا نمونہ جو ہم نے اس کتاب میں دکھایا ہے اگرچہ ممکن ہے کہ وہ زمانہ حال کے مذاق کے موافق نہ ہو لیکن اس سے مرزا کے کمال شاعری میں کچھ فرق نہیں آتا۔ خود ایران کے بڑے بڑے نامور شعرا جو اپنے زمانے میں مسلم الثبوت تھے۔ آج اہل زبان انکی طرز شاعری کو نام رکھتے ہیں، خصوصاً متوسطین کے طبقے میں جو لوگ جامی کے بعد ہوئے ہیں اور جن میں تقریباً وہ تمام شعرا داخل ہیں جنھوں نے صفویہ اور مغلیہ کے عہد حکومت میں ایران یا ہندوستان میں علم امتیاز بلند کیا تھا انکی شاعری کو جیسا کہ رضا قلی خاں ہدایت نے اپنے تذکرہ مجمع الفصحا میں تصریح کے ساتھ لکھا ہے۔ آج اہل زبان میں کوئی تسلیم نہیں کرتا سب قدما کی روش کو پسند کرتے ہیں اور انھیں کی تتبع کا دم بھرتے ہیں حالانکہ متوسطین کے طبقے میں بڑے بڑے نامور شعرا گذرے ہیں جن کے

کمال اور استادی کا انکار نہیں ہو سکتا۔ پس درحقیقت کسی کی شاعری یا انشا پردازی کا پبلک کے موجودہ مذاق کے خلاف ہونا اسکے سوا کچھ معنی نہیں رکھتا کہ جو شے پہلے ایک خاص وضع کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی وہ اب دوسری وضع کے سانچے میں نہیں سما سکتی۔

اگرچہ مرزا کی شاعری نے شعراے متوسطین کے محدود دائرے سے قدم باہر نہیں رکھا، وہی چند میدان جن میں انھوں نے گھوڑے دوڑائے تھے ہمیشہ مرزا کے جولان گاہ رہے، لیکن جس درجے کا ملکۂ شاعری انکی طبیعت میں پیدا کنیا گیا تھا اس سے پایا جاتا ہے کہ جس طرح دریاے مواج جدھر رُخ کرتا ہے اُدھر اپنا راستہ برابر نکالتا چلا جاتا ہے اسی طرح وہ جس میدان میں قدم رکھتے اسکو کامیابی کے ساتھ طے کر جاتے۔ وہی بارود جو آتشبازی میں بچوں کا جی لبھاتی ہے جب اسکو دوسری طرح کام میں لایا جاتا ہے تو بڑے بڑے قلعوں اور پہاڑوں کو پرکاہ کی طرح اڑا دیتی ہے۔ اور وہی ایک چیز تھی جس نے کہیں صرف احباب کے جلسوں اور امیروں کے درباروں کو گرم کیا اور کہیں ملکوں اور قوموں میں حُبِّ وطن اور قومی ہمدردی کی آگ لگا دی

اعلیٰ درجے کا ملکہ شاعری کسی خاص زمانے یا خاص ملک کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتا، پس یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ شاعری کی اعلیٰ قابلیت جیسی قدما میں ہوتی تھی ویسی متاخرین میں نہیں ہو سکتی، یا جیسی ایران کے شعرا میں ہوتی ہے ویسی ہندوستان کے شعرا میں نہیں ہوتی۔ ملکۂ شاعری کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسی مصوری کی قابلیت یا سریلی آواز۔ جس طرح ان دونوں صفتوں کا ہر زمانے اور ہر

ملک میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے پر پایا جانا ممکن ہے اسی طرح اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا ملکۂ شاعری ہر زمانے اور ہر ملک میں مختلف اسباب سے مختلف صورتوں اور مختلف شانوں میں ظہور کرتا ہے اور سب سے بڑا اور زبردست حاکم جو شاعر کو ایک خاص رنگ پر ڈالدیتا ہے وہ سوسائٹی کا دباؤ اور اسکا مذاق ہے انیس اسی ملکہ شاعری کے ساتھ جو اسکی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا اگر چوتھی صدی ہجری میں ایران میں پیدا ہوتا، اور اسی سوسائٹی میں نشوونما پاتا جس میں فردوسی نے نشوونما پائی تھی تو ہمارے نزدیک اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ رزمیہ نظم میں وہی رتبہ پاتا جو فردوسی نے پایا تھا اور فردوسی اسی اعلیٰ قابلیت کے ساتھ جو قدرت نے اسکے دماغ میں ودیعت کی تھی۔ اگر ہندوستان کی اُس سوسائٹی کے سایہ میں پلتا جو انیس کو میسر آئی تھی تو یقیناً وہ شاعری میں وہی صنف اختیار کرتا جو انیس نے اختیار کی تھی اور اس میں انیس سے کچھ زیادہ قبولیت حاصل نہ کرتا۔ اسی بنا پر ایران کا ایک متاخر شاعر کہتا ہے:۔

نیست اندر زمانہ محمودے ورنہ ہر گوشہ صد چو عنصریست

اور اسی اصول پر غالب مرحوم کہتے ہیں۔

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

مرزا نے جس وقت شعر فارسی کے میدان میں قدم رکھا تھا اسوقت ہندوستان میں دو طرزوں کا زیادہ رواج تھا، ایک نظیری و عرفی وغیرہ کی طرز جو اکبر کے زمانے سے چلی آتی تھی، دوسری مرزا بیدل کی طرز جو عالمگیر کے عہد میں شایع ہوئی اور علوی و صہبائی پر آکر ختم ہوگئی جو لوگ شعر

فارسی میں کمال بہم پہنچانا چاہتے تھے وہ انھیں دونوں میں سے کوئی طرز اختیار کرتے تھے اگرچہ حافظ اور خسرو کی غزل ان سے بہت زیادہ مقبول خاص و عام تھی مگر۔ اُن وجوہات سے جو متاخرین کو طرز جدید اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور جنکا ذکر ہم دوسرے حصے میں کر چکے ہیں۔ مرزا نے اوّل بیدل کی روش پر چلنا شروع کیا، پھر اس نظر سے کہ اہل زبان اس طرز کو ٹکسال باہر خیال کرتے تھے، نظیری و عرفی کی طرز اختیار کی۔ ظاہر ہے کہ ایک ہندی نژاد شاعر جو ایسے ناپرساں زمانے میں پیدا ہوا اور جسنے فارسی شاعری میں نظیری و عرفی وغیرہ کے کلام سے بہتر کوئی ممکن التقلید نمونہ نہ دیکھا ہو۔ وہ سوا اسکے کہ انکا اتباع اختیار کرے اور کیا کر سکتا تھا۔ رہی یہ بات کہ اُس نے اس طرز شاعری میں کسقدر کامیابی حاصل کی ہے اور ان لوگوں کی پیروی کا کہاں تک حق ادا کیا ہے سو اسکو اس طرح ثابت کرنا تو ناممکن ہے جیسے دو اور دو چار، البتہ جو لوگ شعر فارسی کا صحیح مذاق رکھتے ہیں وہ اکبری دور کے شعرا اور مرزا کے کلام کا مقابلہ کرنے کے بعد اُمید ہے کہ مرزا کی اعلیٰ درجے کی قابلیت و استعداد کا اعتراف کرینگے اور اس بات کو تسلیم کریں گے کہ زمانے کا اقتضا اور سوسائٹی کا دباؤ اس شخص کو جس روش پر ڈالدیتا وہ ضرور اس میں کامیاب ہوتا۔ چنانچہ اخیر عمر میں جب حبیب قاآنی کے قصائد مرزا کی نظر سے گزرے تو اسکے کلام کی روانی اور بیساختہ پن دیکھکر انکو قاآنی کی روش پر چلنے کا خیال پیدا ہوا تھا، اسی لیے ان کے سب سے پچھلے قصیدوں اور قطعوں میں بہ نسبت پہلے قصائد اور قطعات کے زیادہ روانی اور بیساختگی پائی جاتی ہے لیکن چونکہ اب دوسری چال چلنے کا وقت

نہیں رہا تھا اسلیے اس روش کی تکمیل ہونی ناممکن تھی۔

اس کتاب میں جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے۔ مرزا کو شاعری کے لحاظ سے جا بجا نظیری و عرفی وغیرہم کا۔ جنکو مرزا خود اپنا پیش رو تسلیم کرتے ہیں۔ ہم پلہ قرار دیا گیا ہے سو قطع نظر اسکے کہ کوئی قطعی دلیل اس دعوی پر قایم نہیں ہو سکتی، اور ناظرین کے ذوق و وجدان کے سوا کوئی چیز اسکا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں اول یہ کہ ایک زبانداں آدمی شاعری میں اہل زبان کے برابر ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ ایک پیرو اپنے پیشرووں کے ساتھ مساوات کا درجہ حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟ سو دوسرے سوال کا جواب تو بالکل صاف ہے۔ دنیا میں ابتدا سے آجتک نہ صرف شعر و شاعری میں بلکہ ہر علم اور ہر فن اور ہر پیشے میں اکثر پیرو اپنے پیشرووں کے صرف برابر ہی نہیں بلکہ ان سے فائق اور افضل ہوتے رہے ہیں فردوسی رزمیہ مثنوی میں اسدی اور دقیقی کا پیرو ہے، مگر دونوں سے گوے سبقت لے گیا ہے۔ خواجہ حافظ غزل میں سعدی کے قدم بہ قدم چلے ہیں مگر سعدی سے بہت آگے نکل گئے ہیں قاآنی قصیدے میں تمام قدما سے بڑھ گیا ہے۔ میر تقی نے تمام اگلے ریختہ گویوں کو جو یقیناً اسکے پیشرو تھے۔ غزل میں اپنے سے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے میر انیس تمام مرثیہ گویوں سے جو اُن سے پہلے ہوے بازی لے گئے ہیں۔ پس اگر مرزا غالب کو فارسی شاعری میں نظیری و عرفی سے افضل نہیں بلکہ صرف ان کا ہم پلہ قرار دیا جاے تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے۔

رہا پہلا سوال، سو ظاہر ہے کہ شاعری کا ہنر دو مختلف لیاقتوں سے مرکب ہے۔ ایک امیجیٹش یعنی قوت متخیلہ کی بلند پروازی، دوسرے مناسب الفاظ کے استعمال پر قدرت۔ ان میں سے پہلی لیاقت جیسا ظاہر ہے۔ ممکن ہے کہ ایک زباندان بہ نسبت اہل زباں کے ایک کم علم بہ نسبت فاضل متبحر کے اور ایک دیہاتی گنوار بہ نسبت خواص اہل شہر کے بمراتب افضل اور اعلیٰ درجے کی رکھتا ہو۔ دوسری لیاقت۔ اگرچہ بظاہر اہل زبان کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس میں بھی مثلاً ایک ہندی نژاد اکتساب کے ذریعے سے خاصکر اس حصۂ زبان میں جو فارسی کی محدود شاعری میں مستعمل ہے اہل ایران کی برابری کر سکتا ہے علامہ ابن خلدون عربی زبان کی نسبت۔ جو بمقابلہ فارسی کے نہایت وسیع زبان ہے لکھتے ہیں کہ "ایک عجمی (یعنی غیر عربی) فصحائے عرب کے کلام کی ممارست سے اہل زبان میں شمار ہو سکتا ہے" پس فارسی زبان جو بہ نسبت عربی کے نہایت تنگ اور مختصر زبان ہے اس بات کے زیادہ قابل ہے کہ ایک ہندی نژاد فصحائے ایران کے کلام کی مزاولت سے اہل زبان میں شمار کیا جائے۔

مذکورہ بالا اصول کے موافق کچھ شک نہیں کہ ہم اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ مرزا کو ملکۂ شاعری کے لحاظ سے اکبری دور کے تمام شاعروں پر ترجیح دیں یا ان سے کم سمجھیں یا انکے برابر قرار دیں۔ رہی دوسری لیاقت سو اسکی نسبت پہلے حصے میں جا بجا ذکر کیا گیا ہے کہ مرزا نے ایک نہایت مستند صاحب زبان کی تعلیم و تلقین اور اپنے ذاتی تفحص اور کثرت مطالعہ اور غواصی فکر اور مشق سخن اور خاصکر اپنی خداداد لٹریری

قابلیت سے یقیناً وہ مرتبہ حاصل کرلیا تھا جس سے ایک زباندان مثل اہل زبان کے مستند سمجھا جا سکتا ہے۔

لارڈ مکالے نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے پایا جاتا ہے کہ کوئی شخص غیر مادری زبان میں اعلیٰ درجے کا شاعر نہیں ہو سکتا۔ بیشک اُنکا ایسا سمجھنا یورپ کی شاعری کے لحاظ سے بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ یورپ کی شاعری درحقیقت نیچر کی ترجمانی ہے اسکا میدان اسی قدر وسیع ہے جسقدر نیچر کی فضا۔ اسکے فرائض مادری زبان کے سوا دوسری زبان میں جیسے کہ چاہییں ادا نہیں ہو سکتے، بلکہ ایشیائی شاعر جو طریقہ شاعری سے نابلد ہیں وہ اپنی مادری زبان میں بھی اُسکی مشکلات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ بخلاف ایشیائی شاعری اور خاصکر متاخرین کی فارسی شاعری کے کہ یہاں انھیں معمولی خیالات کو جو قدما سیدھے سادے طور پر بیان کر گئے ہیں نئے نئے اسلوبوں اور نئی نئی نزاکتوں کے ساتھ باندھنا یہی کمال شاعری سمجھا جاتا ہے اگرچہ یہ بھی فی نفسہ ایک بہت بڑا کمال ہے لیکن ایسی شاعری میں زبان کا صرف ایک محدود حصہ مستعمل ہوتا ہے جسکو غیر زبان والا آسانی سے سیکھ سکتا ہے اور بشرطیکہ اس میں شاعری کی اعلیٰ قابلیت ہو اسکو شعرائے اہل زبان کی طرح بلکہ بعض صورتوں میں ان سے بہتر استعمال کر سکتا ہے۔

مرزا کا موازنہ نظیری و عرفی کے ساتھ صرف قصیدے اور غزل میں ہو سکتا ہے کیونکہ مثنوی میں نظیری محض صفر ہے اس نے اس صنف کو چھوا تک نہیں۔ عرفی نے بیشک چند مثنویاں لکھی ہیں، مگر صاحب

آتشکدہ نے ان میں سے ایک کی نسبت لکھا ہے کہ "بد نگفتہ است" اور باقی کی نسبت اسکا یہ قول ہے کہ "بسیار بد گفتہ" حکیم ہمام کا بیٹا حکیم حاذق عرفی کی مثنوی کی نسبت کہتا ہے۔

مثنویش طرز فصاحت نداشت کان نمک بود و ملاحت نداشت

البتہ ظہوری کے ساقی نامہ نے ہندوستان میں بہت شہرت حاصل کی ہے مگر اسکا قصیدہ چنداں وزن نہیں رکھتا۔ بخلاف مرزا کے کہ اسکو مثنوی پر بھی تقریباً اسی قدر قدرت ہے جیسی قصیدے اور غزل پر۔ نثر میں نظیری و عرفی دونوں نے کوئی یادگار نہیں چھوڑی البتہ ظہوری کی سہ نثر کو ہندوستان میں بہت فروغ ہوا ہے مگر اس میں اوّل سے آخر تک ایک بے مزہ کہانی۔ یعنی ابراہیم عادل شاہ کی مدح و ستایش۔ کے سوا دوسرے مضمون کا نام نہیں جس سے لکھنے والے کی قدرت بیان معلوم ہو۔ پس اگر ظہوری کی طرز بیان اور طرز عبارت آرائی کے حسن و قبح سے قطع نظر کیجائے تو بھی اسکے حق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اسکو مدحیہ نثر لکھنی اچھی آتی تھی۔ بخلاف مرزا کے کہ وہ اپنی طرز خاص میں ہر طرح کے مضامین لکھنے اور ہر طرح کے مقاصد ادا کرنے پر یکساں قدرت رکھتا تھا خصوصاً فخر و خودستائی، غم و اندوہ اور شکایت و زارنالی کے مضامین جس خوبی و لطافت اور بانکپن کے ساتھ مرزا نے نثر میں بیان کیے ہیں اسکی نظیر نہ صرف ہندوستانیوں کی نثر میں بلکہ متاخرین اہل ایران کی نثر میں مشکل سے دستیاب ہوگی۔ مگر افسوس ہے کہ ہم یہ باتیں ایسے زمانے میں لکھ رہے ہیں کہ گو۔ ہر شخص آزادی

سے اپنی رائے ظاہر کرسکتا ہے۔ لیکن فارسی زبان ہمارے ملک میں بمنزلہ مردہ زبان کے ہوگئی ہے، اور اس لیے لوگوں سے اپنے دعوےٰ کے ثبوت میں اسکے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ دیکھو، پڑھو، سمجھو اور جانچو۔

الغرض مرزا کی فارسی نظم و نثر کے متعلق ہماری رائے کا ماحصل یہ ہے کہ انکا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی اور نظیری کے لگ بھگ اور ظہوری سے بڑھا ہوا، مثنوی میں ظہوری کے لگ بھگ اور عرفی و نظیری سے بالا، اور نثر میں تینوں سے بالاتر ہے اگرچہ مرزا کی غزل میں کہیں کہیں پیچیدگیاں ہیں اور نثر میں بھی اکثر فقرے نہایت پیچیدہ نظر آتے ہیں۔ جو ممکن ہے کہ اہل زبان کے نزدیک فصاحت کے درجے سے گرے ہوئے ہوں مگر ایسی کسروں سے کسی زباندان یا اہل زبان کا کلام پاک نہیں ہوسکتا اور نہ ایسی جزوی فروگذاشتوں سے کسی کی استادی میں فرق آسکتا ہے ولِلّٰہِ دَرُّ القائل

گر سخن اعجاز باشد بے بلند و پست نیست　　در ید بیضا ہمہ انگشتہا یکدست نیست

مرزا کے اُردو کلام کی نسبت ہم دوسرے حصے میں بقدر ضرورت بحث کر چکے ہیں مرزا کا موازنہ شعرائے اُردو زبان کے ساتھ صرف غزل میں ہوسکتا ہے، کیونکہ غزل کے سوا دیگر اصناف میں انکا کلام کاَن لم یکُن ہے، اور اُردو کی نثر میں دیگر شعرا بمقابلہ مرزا کے صفر محض ہیں۔ مرزا کی غزل کا ڈھنگ اگرچہ میر و سودا کی روش پر نہیں ہے، مگر خواص اہل ملک جو تقلید کی قید سے آزاد ہیں۔ انکے چیدہ و برگزیدہ

اشعار کو میر و سودا کے انتخاب سے کچھ کم پسند نہیں کرتے۔

مرزا کی نثر اُردو نے تمام ہندوستان میں شہرت حاصل کی ہے اور خاص و عام نے بالاتفاق اسکو پسند کیا ہے انھوں نے اُردو خط و کتابت میں ایک خاص طرز کی ایجاد کی ہے۔ جو تمام ملک میں مقبول ہوئی ہے اور اکثر لوگوں نے اپنی بساط کے موافق اسکی پیروی کی ہے۔

ان تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد مرزا کی نسبت یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ لٹریری قابلیت کے لحاظ سے مرزا جیسا جامع حیثیات آدمی امیر خسرو اور فیضی کے بعد آج تک ہندوستان کی خاک سے نہیں اُٹھا، اور چونکہ زمانے کا رُخ بدلا ہوا ہے اسلیے آیندہ بھی یہ امید نہیں ہے کہ قدیم طرز کی شاعری و انشا پردازی میں ایسے باکمال لوگ اس سرزمین پر پیدا ہونگے۔